بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — آذر ریاض

مدیر اعزازی — امت الصبور

فلم، ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

مستقل سلسلے

اپریل 2017
جلد 31 شمارہ 8
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2-A بی ای پی آر سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

شعاع کا اپریل کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
گزشتنی ہے سحر بھی، شب بھی۔
گزشتنی ہیں بسنت، برسات، پوس، پت جھڑ
رُتوں کے یہ سارے قافلے اور ساعتوں کے یہ سب مسافر ازل سے کرۂ ارض پہ آتے رہے ہیں اور یوں ہی آتے رہیں گے۔
سرما کی خنک صبحوں اور سرد راتوں کے بعد بہار نے دستک دی ہے تو رنگ جاگ اُٹھے ہیں۔ درختوں کی شاخیں چمکیلے، روشن پتوں سے سج گئی ہیں، زمین نے ہریالی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور ایک بار پھر تمام مناظر میں جان پڑ گئی ہے۔
قدرتی مناظر کا یہ حسن دل کو ایک نئے احساس سے روشناس کراتا ہے۔ مسرت و شادمانی کی یہ کیفیت طبیعت کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور انسان بے اختیار اللہ کا شکر ادا کرنے لگتا ہے۔
قدرت کا اپنا ایک نظام ہے جو بڑی باقاعدگی سے جاری ہے۔ درختوں پر بور آتا ہے تو کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے۔ پھر پھول اور پھل لگتے ہیں۔ قدرت کا یہ نظم و نسق اس کے نظام کی باقاعدگی انسان کے لیے پیغام ہے کہ وہ بھی قدرت کی طرف سے اپنے اوپر عائد کردہ ضابطوں پر عمل کر کے نظامِ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر فطرت سے ہم آہنگی ہی اس کی بقا کی ضامن ہے۔
ضروری ہے کہ وہ قدرت کے احکامات کے تحت زندگی گزارے اور دوسروں کے لیے فیض رساں ہو۔
جس طرح دن اور موسم بدلتے ہیں، اسی طرح انسانی حالات بھی بدلتے ہیں۔ خزاں رُتوں میں مایوس نہ ہو بلکہ امید کی قندیلیں روشن کر کے صبحِ بہار کا انتظار کرے جو اس کی زندگی میں ضرور آئے گی اور ہمیشہ اس بات کو ذہن میں رکھے کہ باقی رہنے والی چیز صرف انسان کے اعمال ہیں۔ دوسروں کے ساتھ کی گئی بھلائی، اچھے اعمال اور نیکیاں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ ان پر کبھی خزاں نہیں آتی۔

اس شمارے میں،

- ایمل رضا کا مکمل ناول۔ رقصِ،
- مریم عزیز کا مکمل ناول۔ ہوئے جب ہم تم،
- نادیہ جہانگیر اور اُمِ ایمان قاضی کے ناولٹ،
- شازیہ الطاف ہاشمی، قرۃ العین سکندر، ثمینہ طاہر بٹ، نیّر کاشف، حنا ابرار اور فاطمہ اسحاق کے افسانے،
- صائمہ اکرم، عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- مشہور نیوز ریڈر راحیلہ فردوس اور فرزانہ صدیقی کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آئینہ خانے ہیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کے دلچسپ خط نہ صرف شعاع کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ہماری رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

نظر آتا نہیں لیکن ہر اک دھڑکن میں رہتا ہے
میرا اللہ میری سانس کے بندھن میں رہتا ہے

میری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے، محسوس ہوتا ہے
مسلسل وہ میرے احساس کے آنگن میں رہتا ہے

مرے خوں کی حرارت اس کی ہی مرہونِ منت ہے
ہر اک تارِ نفس میں وہ میرے تن من میں رہتا ہے

دعائیں سب کی سنتا ہے بقدرِ ظرف دیتا ہے
بشر لیکن تمناؤں کے ہی درپن میں رہتا ہے

بڑائی اس کو زیبا ہے، وہی یکتا وہی قادر
وہ سارے عالموں کا رب ہے، ہر بندھن میں رہتا ہے

خورشید اقبال حیدر

نازشِ دوراں، فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
رحمتِ باری، خیرِ مجسم، صلی اللہ علیہ وسلم

خلقِ خدا کا رہبرِ اعظم، شافعِ محشر، مونسِ آدم
مالکِ کوثر، وارثِ زم زم، صلی اللہ علیہ وسلم

باعثِ تسکین جس کی محبت، تا بہ ابد ہے جس کی رسالت
اس کی اطاعت سب پہ مسلّم، صلی اللہ علیہ وسلم

نطق ہے جس کا وحیِ الٰہی، ذاتِ خدا دے جس کی گواہی
اس کی رسالت آیۂ محکم، صلی اللہ علیہ وسلم

آلِ نبیؐ پہ میں بھی فدا ہوں، میں بھی رشید اس در کا گدا ہوں
جو ہے درِ سرکارِ دو عالم، صلی اللہ علیہ وسلم

رشید وارثی

ادارہ

مصیبت پر صبر کا بیان

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے کہا۔

"اللہ کے رسولﷺ! سب سے سخت مصیبت کس پر آتی ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نبیوں پر، پھر جوان کے بعد سب سے افضل ہیں، پھر جوان کے بعد افضل ہیں۔ بندے پر اس کے دین کے مطابق آزمائش آتی ہے۔ اگر وہ اپنے دین (اور ایمان) میں مضبوط ہو تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ اگر اس کا ایمان نرم ہو تو اس کے ایمان کے مطابق آزمائش آتی ہے۔ بندے پر آزمائش (اور مصیبت) آتی رہتی ہے حتیٰ کہ اسے ایسا کر کے چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس پر کوئی گناہ (باقی) نہیں ہوتا۔" (نسائی)

فوائد و مسائل :

1۔ نیک صاحب ایمان پر دنیوی مشکلات کا آنا اس کے لیے درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

2۔ دنیا کی مصیبتیں مومن کے لیے نعمت ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔

3۔ مصیبت پر صبر ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات کو پیش نظر رکھنے سے صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

آزمائش

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ کو بخار تھا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر ہاتھ رکھا تو لحاف کے اوپر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کو حرارت محسوس ہوئی۔ میں نے کہا "اللہ کے رسول! آپ کو کتنا سخت بخار ہے!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہم (انبیاء) اسی طرح ہوتے ہیں کہ ہمیں مصیبت (یا آزمائش) بھی دگنی آتی ہے اور ثواب بھی دگنا ملتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے زیادہ سخت آزمائش کن لوگوں کو آتی ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نبیوں کو۔"

میں نے کہا۔ "ان کے بعد؟"

فرمایا۔ "نیک لوگوں کو۔ انہیں فقر کے ذریعے سے آزمایا جاتا تھا حتیٰ کہ (بعض اوقات) ایک آدمی کو صرف ایک چادر میسر ہوتی تھی جسے وہ جسم پر لپیٹ لیتا تھا اور وہ مصیبت پر اس طرح خوش ہوتے تھے جس طرح تم راحت پر خوش ہوتے ہو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ بیماری کی شدت بھی آزمائش ہے۔ اس پر صبر کا ثواب بھی شدت کے مطابق زیادہ ہوتا ہے۔

2۔ فقر بھی آزمائش ہے۔ اس پر صبر اور شکر سے درجے بلند ہوتے ہیں۔

3۔ مشکل پر خوشی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ثواب ملتا ہے۔ مشکل ختم ہو جائے گی لیکن اس کا ثواب جنت میں ہمیشہ کی نعمتوں کا باعث ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ کسی نبی کی حالت بیان فرما رہے ہیں۔
"اسے اس کی قوم نے مارا۔وہ اپنے چہرے سے خون صاف کرتے تھے اور کہتے تھے میرے رب! میری قوم کو معاف کر دے' وہ جانتے نہیں۔"

(بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ ہدایت کی طرف بلانے والوں کو مشکلات آتی ہیں حتی کہ انبیائے کرام بھی بہت سی تکلیفیں برداشت کرتے رہے ہیں۔
2۔ ممکن ہے اس حدیث میں کسی نبی سے مراد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور طائف کے واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہو۔واللہ اعلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ہم حضرت ابراہیم علیہ اسلام سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جب انہوں نے فرمایا (رب ارنی کیف تحی الموتی.....)
"میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟"
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔"کیا تو ایمان نہیں لایا؟"
ابراہیم نے کہا۔"کیوں نہیں؟ (لیکن سوال اس لیے کیا ہے) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔"
اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے! وہ مضبوط سہارے کی پناہ لے رہے تھے۔اور اگر میں قید میں اتنا عرصہ رہتا جتنا عرصہ حضرت یوسف علیہ اسلام رہے تو میں بلانے والے کی بات مان لیتا۔"
(بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا ایمان سب سے کامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ انہیں ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرا دیتا ہے جو دوسروں کے لیے "غیب" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرنا چاہا تو یہ شک کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ "علم الیقین" سے "عین الیقین" کے درجے تک ترقی کریں۔
2۔ "ہم زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مومن اس میں شک نہیں کرتے تو حضرت ابراہیم علیہ اسلام بدرجہ اولیٰ شک سے برتر ہیں۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی عظمت کا اظہار ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد کی زندگی کا مشاہدہ کرا دیا۔
3۔ حضرت لوط علیہ السلام نے قوم سے کہا تھا کہ اگر میرا کوئی مضبوط دنیوی سہارا ہوتا تو تم مجھ سے حیا سوز مطالبہ نہ کرتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد نہیں تھا بلکہ یہ قوم کی اخلاقی پستی کا اظہار ہے کہ اگر میرا مضبوط دنیوی سہارا موجود ہوتا تو تم ان افراد کے ڈر سے اس بدتمیزی کی جرات نہ کرتے لیکن تم اللہ سے نہیں ڈرتے۔ میرا اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہے۔جو تمہیں انسانوں کی نسبت کہیں زیادہ سزا دے سکتا ہے۔
4۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس لیے جیل جانا پڑا تھا کہ وہ ایک جرم کے ارتکاب سے انکار کر رہے تھے جس کا ان سے مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جب حکمرانوں پر ان کا خلوص' سچائی اور ان کے کردار کی عظمت واضح ہو گئی اور انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ آنجناب کی صلاحیتوں سے استفادہ کریں تو قاصد رہائی کا حکم نامہ لے کر جیل میں آیا۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت کردار کا ایک اور پہلو سامنے آیا کہ انہوں نے اس وقت تک جیل سے باہر آنے سے انکار کر دیا جب تک ان کی بے گناہی باقاعدہ ثابت نہ ہو جائے اور مجرم (عزیز مصر کی بیوی) کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت میرے ساتھ پیش آتی تو میں

اس وقت جیل سے باہر آجاتا اور اللہ کی رحمت سے امید رکھتا کہ وہ کسی اور انداز سے میری برائت کا اظہار فرما دے گا۔ اس ارشاد کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کی استقامت اور ان کے صبر کی تعریف ہے۔

5۔ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تمام انبیائے کرام سے بلند و برتر ہے لیکن دوسرے انبیاء علیھم السلام کے کردار کے روشن پہلو بھی لائق تحسین ہیں۔ ان کی اہمیت و عظمت بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔

6۔ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف بھی عظمت کردار کا ایک پہلو ہے۔ علمائے کرام کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی خوبیوں کو دل سے تسلیم کریں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے دوسروں کی عزت کریں اور ان سے محبت رکھیں۔ جس طرح ان کی غلطیوں پر تنقید کرتے ہیں'

ان کے اچھے کاموں کی تعریف اور ان میں تعاون بھی کریں' خواہ متعلقہ فرد کا تعلق ان کی پارٹی' تنظیم' جماعت اور مسلک سے نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا اختیار

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگ احد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت شہید ہوا' چہرہ مبارک زخمی ہوا اور خون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک سے بہنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چہرہ مبارک سے خون پونچھتے تھے اور فرماتے تھے۔

"یہ قوم کیسے نجات پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون آلود کر دیا' جب کہ وہ ان کو اللہ کی طرف بلا رہا تھا؟"

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (لیس لک من الامر شیء)

"اے پیغمبر! آپ کے اختیار میں کچھ نہیں" (اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو انہیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔) (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت مومنوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا افسوس کے طور پر تھا کہ انہوں نے اتنا بڑا جرم کیا ہے' کیا معلوم اس کی پاداش میں ان پر عذاب ہی آجائے۔

3۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ ان میں سے بعض کو ایمان نصیب ہو گا' بعض اپنے جرم کی سزا میں جہنم رسید ہوں گے۔

4۔ نبی مخلوق کے دلوں پر اختیار نہیں رکھتے' نہ عذاب لانا یا روکنا ان کے اختیار میں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ایک دن جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے۔ مکے کے بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خشت زنی کر کے لہولہان کر دیا تھا۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا "کیا بات ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ یہ ظلم کیا ہے۔"

حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ایک نشانی دکھاؤں؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں' دکھایئے۔"

انہوں نے وادی کی دوسری طرف ایک درخت کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس درخت کو بلایئے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا تو وہ چل کر آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا۔ "اسے کہیے واپس چلا جائے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کہا تو وہ واپس ہو گیا حتیٰ کہ اپنی جگہ پر چلا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مجھے کافی

ہے۔"

فوائدومسائل :

1۔ یہ واقعہ مکی دور کا ہے۔ ممکن ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کسی بڑی عمر کے صحابی سے سنا ہو یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا ہو۔

2۔ درخت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حرکت کرنا معجزہ ہے۔ یہ معجزہ دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے لیکن کچھ خاص حکمتوں کی وجہ سے یہ تکلیفیں برداشت کرنا ضروری ہیں۔

3۔ اس کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی بھی تھا کہ اللہ کی ساری مخلوق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والی ہے۔

آزمائش

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے '

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے وہ سب لوگ شمار کردو جنہوں نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے۔"

ہم نے عرض کیا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو ہمارے بارے میں خوف ہے جب کہ ہماری تعداد چھ اور سات سو کے درمیان ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہیں نہیں معلوم 'شاید تم پر آزمائش آئے۔"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ "پھر ہم پر آزمائش آئی حتی کہ ہم چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنے لگے۔"

فوائدومسائل :

1۔ مردم شماری کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ افرادی قوت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ پر اس قدر توکل تھا کہ چھ سات سو کی تعداد ہوتے ہوئے خود کو ناقابل شکست سمجھتے تھے۔

2۔ زیادہ تعداد کے باوجود آزمائش آسکتی ہے 'اس لیے اللہ سے مدد مانگتے رہنا چاہیے اور آزمائش میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔

زیادہ ثواب

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زیادہ ثواب بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو ان پر آزمائش ڈالتا ہے۔ جو راضی رہے اسے رضا ملے گی اور جو ناراض ہو اسے ناراضی حاصل ہو گی۔" (ترمذی)

فوائدومسائل :

1۔ آزمائش میں بندے کا فائدہ ہوتا ہے 'اس لیے اللہ کے فیصلے پر راضی رہتے ہوئے 'شریعت کے دائرے میں رہ کر جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی مصیبت پر بندہ ناراضی کا اظہار کرے گا تو مصیبت تو اپنے مقررہ وقت ہی پر ختم ہو گی لیکن بندہ ثواب سے محروم ہو کر اللہ کو ناراض کرلے گا۔

2۔ مصیبت بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ بشرطیکہ احکام کی نافرمانی نہ کی جائے۔

صبر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جو مومن لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان سے ملنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے 'وہ اس مومن سے زیادہ ثواب حاصل کرلیتا ہے جو لوگوں سے ملتا جلتا نہیں اور ان کی طرف سے آنے والی تکلیف پر صبر نہیں کرتا۔" (ترمذی)

فوائدومسائل :

1۔ لوگوں سے میل جول میں اچھے برے ہر قسم کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔ برے آدمی کی برائی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے لیکن خود نیکی پر قائم رہنا چاہیے۔

2۔ معاشرے میں برائی زیادہ ہو جائے تب بھی سب

سے الگ تھلگ ہو کر راہبوں کی طرح جنگلوں یا غاروں میں چلے جانا جائز نہیں بلکہ معاشرے میں رہ کر اصلاح کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

3۔ جب ایمان کو خطرہ ہو، تب خلوت نشینی جائز ہے۔

تین خوبیاں

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تین خوبیاں جس میں ہوں، اسے ایمان کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ ایک روایت میں ہے اسے ایمان کی مٹھاس حاصل ہو جاتی ہے۔

(پہلی خوبی) اور جب اسے اللہ نے کفر سے نجات دے دی ہو تو اسے دوبارہ کفر اختیار کرنے سے آگ میں ڈالا جانا زیادہ پسند ہو۔"

(دوسری) کسی شخص سے محبت اور دوستی رکھے تو محض اللہ کے لیے رکھے۔

(تیسری) اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی سب کی محبت سے بڑھ کر ہو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ کے لیے محبت کا مطلب یہ ہے کہ دوست سے محبت کی بنیاد، خاندان، قبیلہ، زبان، وطن یا دنیوی مفاد نہ ہو بلکہ کسی سے اس لیے محبت ہو کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے والا نیک آدمی ہے۔

2۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت زیادہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ جب بیوی بچوں، ماں باپ، دوست احباب یا دنیوی مفادات کا تقاضا کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی کا ہو تو ان سب کو نظر انداز کر کے ان کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مان لیا جائے۔

3۔ مومن کفر سے اور کافروں کے رسم و رواج سے نفرت کرتا ہے اور مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں سے محبت اور ان کی مدد نہیں کرتا کیونکہ کافروں کی طرف میلان میں خطرہ ہے کہ ایمان کمزور ہو کر آخر وہ مرحلہ آجائے جب ایمان بالکل ختم ہو جائے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

نصیحت

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

"مجھ سے میرے جگری دوست صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا، خواہ تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا تجھے جلا دیا جائے۔ اور فرض نماز جان بوجھ کر ترک نہ کرنا۔ جس نے اسے عمداً" ترک کیا، اس سے (اللہ کی حفاظت کا) ذمہ جاتا رہا اور شراب نہ پینا کیونکہ وہ ہر بُرائی کی چابی ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ شرک سب سے بڑا جرم ہے، لہٰذا سخت سے سخت حالات میں بھی اس سے بچنا ضروری ہے۔

2۔ عقیدۂ توحید کے لیے جان بھی قربان کرنی پڑے تو سعادت ہے۔

3۔ شرک کے بعد بڑا گناہ نماز چھوڑنا ہے جو کفر کے مترادف ہے۔

4۔ عقل اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ نشہ آور اشیاء کے استعمال سے اس نعمت کو ضائع کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔ نشے کی وجہ سے عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، اس لیے مسلمان کے لیے ہر نشہ آور چیز سے پرہیز انتہائی ضروری ہے۔

شاہین رشید

عثمان خالد بٹ

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"فلم "بالوماہی" کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟"

"بالوماہی" روایتی فلموں سے بالکل مختلف فلم ہے۔ اس میں پیار' محبت' تفریح' نفرت سب کچھ موجود ہے۔"

"ایسا تو ہر فلم میں ہوتا ہے؟ کوئی نئی بات؟"

"ہر فلم میں محبت کا آغاز نفرت سے نہیں ہوتا' بلکہ نفرت بعد میں ہوتی ہے اور ہر فلم میں عوام کے لیے کوئی پیغام بھی نہیں ہوتا' جبکہ اس فلم میں ہے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ فلم کامیاب ہوگی؟"

"بالکل یقین ہے۔ جس طرح لوگوں نے مجھے تھیٹر میں پسند کیا۔ ڈراموں میں پسند کیا۔ اسی طرح ان شاءاللہ فلم میں بھی پسند کریں گے۔ ویسے بھی فلم کی 90 فیصد شوٹ آوٹ ڈور ہے اور لوگ سیٹ سے زیادہ آوٹ ڈور کو اور خوب صورت مناظر کو پسند کرتے ہیں۔"

"اس فلم کے لیے ڈائریکٹر کا پہلا انتخاب آپ ہی تھے کیا؟"

"یہ بات تو آپ ان ہی سے پوچھیں۔۔۔ البتہ اس کے ڈائریکٹر "بائنصم حسین" کے ساتھ میں چار پروجیکٹ کرچکا ہوں اور ان سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ فلم میں کام کیا' یہ میرے لیے بھی بہت اعزاز کی بات ہے۔"

"آپ خالد سعید بٹ کے فرزند ہیں۔۔۔ کچھ مختلف ہیں آپ ان سے؟"

"وہ اپنے وقت کے بہت خوب صورت ہیرو تھے۔ ان سے بھلا میرا کیا مقابلہ ہے۔"

"آپ کی شادی کی خبریں کس حد تک درست ہیں؟"

"بالکل درست نہیں ہیں۔۔۔ مگر شادی کرنی ہے ان شاءاللہ۔۔۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے فلم میں۔ اتنا مصروف تھا کہ کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اب فراغت ملی ہے تو کچھ سوچوں گا۔"

"ڈائریکٹر سے آپ کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔

پھر بھی سنا ہے کہ اس فلم کے لیے آپ کا آڈیشن ہوا تھا۔؟“

”دیکھیں‘تعلقات اپنی جگہ.... مگر کام اپنی جگہ.... ڈائریکٹر جس سے مطمئن ہوتا ہے اسی کو کام دیتا ہے.... تو میرا بھی آڈیشن ہوا اور میں ڈائریکٹر کے معیار پر پورا اترا‘ اسی لیے اس نے مجھے بک کیا‘ تعلقات پہ کام ہو تو پھر معیار کا حشر نشر ہو جائے۔“

”دعثان! آپ سے تفصیلی انٹرویو کرنے کی خواہش ہے۔ ٹائم دیں گے؟“

”ان شاء اللہ ضرور.... بس تھوڑی سی فراغت مل جائے۔“

سونیا خان

”کیا حال ہے‘ کیا مصروفیت ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے اور اب چونکہ دوبارہ باقاعدہ طور پر فلم اور ٹی وی انڈسٹری میں واپس آچکی ہوں تو مصروفیات بھی اسی حوالے سے ہیں۔“

”دوبارہ فیلڈ میں آنا اچھا لگ رہا ہے یا بس ٹھیک ہے؟“

”بہت اچھا لگ رہا ہے۔ گھرداری کرلی۔ بچے پال لیے‘ اب سوچا کہ پھر سے سوشل ہو جائیں۔“

”آپ آج بھی اتنی ہی حسین ہیں جتنی کہ گزرے برسوں میں‘ کیا کرتی ہیں؟“

”حسن تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا تحفہ ہوتا ہے۔ آپ مجھے حسین کہہ رہی ہیں‘ یہ آپ کی محبت ہے.... اور کرنا کیا ہے.... اللہ کے دیے ہوئے حسن کی حفاظت کرتی ہوں۔ اپنا خیال رکھتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ ہر لڑکی ہر عورت کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنا آپ تو سب کو ہی اچھا لگتا ہے۔ بات تو تب ہے کہ آپ دوسروں کو بھی اچھے لگیں۔“

”آپ کو اس فیلڈ میں لانے والے منّو بھائی ہیں۔ کیا آج بھی ان سے آپ کے پہلے جیسے تعلقات ہیں؟“

”جی بالکل ہیں اور اپنے محسنوں کو کون بھول سکتا ہے اور منو بھائی تو میرے محسن ہیں۔ وہ نہ صرف اداکاری کی فیلڈ میں مجھے لے کر آئے بلکہ مجھے لکھنے کی طرف بھی انہوں نے ہی راغب کیا.... اور ان ہی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے مجھ میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور جب میں نے اس انڈسٹری کو چھوڑا تب بھی وہ مجھے کہتے رہتے تھے کہ اس انڈسٹری کو تمہاری ضرورت ہے تم اسے دوبارہ جوائن کرلو۔“

”اب اتنے برسوں بعد کیسے خیال آگیا؟“

”سوچ تو میں کب سے رہی تھی.... مگر اس کشمکش میں تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں.... مگر پھر چاہنے والوں نے کہا کہ آپ کو دوبارہ اس انڈسٹری میں آنا چاہیے۔ تو دوستوں کے اصرار پر آگئی اور ”سایۂ دیوار“ سے اپنی فیلڈ کو دوبارہ جوائن کیا۔“

”اب سب کچھ کیسا لگ رہا ہے؟“

”اچھا بھی لگ رہا ہے اور نہیں بھی لگ رہا۔“

”کیا مطلب؟“

”اب میں دیکھتی ہوں کہ ماحول بہت بدل گیا ہے۔ اب پہلے جیسی محنت نہیں رہی۔ ہمارے زمانے میں ریہرسل بہت ہوتی تھی۔ ایک ایک سین پہ توجہ دی جاتی تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب تو کھٹ کھٹ کام

ہو رہا ہے۔"

"تو اچھی بات ہے نا۔ کام بھی اچھا ہی ہو رہا ہے۔"

"پہلے ڈراما۔ ڈراما نہیں حقیقت لگتا تھا۔ اب ڈراما... ڈراما لگتا ہے۔"

"لکھنے والوں کے لیے کیا کہیں گی؟"

"اب بہت زیادہ لکھا جا رہا ہے' اس لیے پہلے والا معیار نہیں رہا۔ گزرے زمانے کے ڈرامے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ میں بھی ان ہی ڈراموں کے بارے میں نہ صرف بات کی جاتی ہے' بلکہ دکھائے بھی جاتے ہیں۔"

"آج کی تحریروں میں نمایاں فرق کیا دیکھتی ہیں؟"

"نمایاں فرق تو یہی نظر آیا ہے کہ آج کے دور میں عورتوں پہ بھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں اور انہیں مظلوم دکھایا جا رہا ہے۔"

"جبکہ آپ کے خیال میں ایسا نہیں ہے؟"

"عورت مظلوم ہے... میں مانتی ہوں۔ مگر آج کی عورت اسٹرانگ بھی ہے۔ اپنے حق کے لیے لڑنا بھی جانتی ہے۔ اپنے حقوق لینا بھی جانتی ہے۔ اب عورت گزرے زمانے کی طرح مظلوم نہیں ہے۔ بلکہ باشعور ہو گئی ہے۔"

"اب یہ ٹائٹل سونگ کا بہت رواج چل پڑا ہے' اس کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"ہاں... یہ اچھا رجحان ہے۔ یہ چیز ڈرامے کو اٹھاتی ہے۔ کردار کے جذبات کو بڑی آسانی سے لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرا ایک ڈراما تھا "روزن" اس میں بھی تھیم سونگ تھا۔ پہلے اتنا ٹرینڈ نہیں تھا' تھیم سونگ کا۔ اب بہت زیادہ ہو گیا ہے۔"

"ڈراموں کی کہانیوں میں یکسانیت دیکھتی ہیں؟"

"ہمیشہ سے دیکھ رہی ہوں۔ اگر کوئی ایک موضوع ہٹ ہو جاتا ہے تو پھر دھڑا دھڑ اسی موضوع پر ڈرامے بننے شروع ہو جاتے ہیں اور ایسا صرف آج کے دور میں نہیں ہو رہا' بلکہ ہمیشہ سے ایسا تھا۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ میں فلاں رائٹر سے زیادہ اچھا لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔"

"اب اس فیلڈ میں پیسہ بہت ہو گیا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ہاں... پیسہ تو ہے... مگر اتنی آسانی سے ملتا کہاں ہے۔ باہر کے ممالک میں بڑا اچھا رواج ہے کہ کنٹریکٹ سائن ہوتے ہی پیسہ آپ کے اکاؤنٹ میں آ جاتا ہے۔ یہاں تو بے چارے فن کار کئی کئی چکر لگاتے ہیں' تب کہیں جا کر ادائیگی ہوتی ہے۔"

"سونیا خان صاحبہ! ناظرین آپ کے دوسرے ڈرامے کے منتظر ہیں۔ اس کے آن ایئر آنے پر پھر آپ سے بات کریں گے۔"

"جی ضرور..."

انعم فیاض

"کیا حال ہے انعم؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"انٹرویو سے کیوں بھاگتی ہو؟"

"نہیں بھاگتی تو نہیں ہوں... بس عادت نہیں ہے انٹرویو دینے کی' ڈرتی ہوں' کچھ غلط نہ لکھ دیا جائے۔"

"کیوں غلط لکھا جائے گا۔ جو کہو گی' وہ ہی لکھا جائے گا۔ یہ وہم کہاں سے آیا؟"

"اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ بولو کچھ' لکھا کچھ جاتا ہے۔ بس اسی لیے؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ آج کل تمہارا "تشنگی دل کی" دیکھ رہے ہیں۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ ماشاء اللہ۔"

"شکریہ۔"

"یہ بتاؤ۔ فیلڈ میں کیسے آئیں۔ یہ تو ایک بنیادی سوال ہے۔ جو سب ہی پوچھتے ہوں گے۔"

"جی۔ جی پہلا سوال ہی یہ ہوتا ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے ایک رئیلٹی شو میں پرفارم کیا تھا اور مقابلہ جیت گئی تھی' تو آپ یقین کریں کہ اسی ہفتے مجھے ایک سوپ "احمد حبیب کی بیٹیاں" میں بک کرلیا گیا اور یہاں سے میرے کیرئیر کا آغاز ہوا اور میری ایک دلی خواہش کہ میں بھی شوبز کا حصہ بنوں' پوری ہوگئی۔"

"عموماً" لڑکیاں کہتی ہیں کہ والدین نے مخالفت کی' رشتے داروں نے برا بھلا کہا۔ کہ اس فیلڈ میں کیوں آئی ہو۔ تو آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوا؟"

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں' مگر میں ان خوش نصیبوں میں ہوں۔ جنہیں گھر والوں کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور میرے گھر والوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور تلقین کی کہ ایک اچھی لڑکی بن کے رہنا' کبھی اپنی حدود سے آگے نہیں جانا اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے گھر والوں نے مجھ پر اعتماد کیا اور آج میں اس فیلڈ میں کامیاب ہوں۔"

"شوبز کی فیلڈ بہت وسیع ہے۔ اداکاری تک محدود رہنا ہے یا مزید آگے جانا ہے۔"

"نہیں جی۔ اداکاری تک محدود نہیں رہنا۔ بہت آگے جانا ہے ان شاء اللہ۔ لیکن ابھی تو میں اداکاری میں طفل مکتب ہوں۔ تھوڑا عرصہ مزید کام کرکے پھر سوچوں گی کہ کیا کرنا ہے۔ ویسے سب شعبوں پر میری نظر ہے اور اپنے لحاظ سے میں سیکھ بھی رہی ہوں۔ لیکن جس بھی شعبے میں آئی باقاعدہ سیکھ کر اور پڑھ کر آؤں گی تاکہ لوگ میرے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ نہ سوچیں کہ اس نے کچھ پڑھا تو ہے نہیں اور آگئیں اس شعبے میں۔"

"کام کے دوران اپنے دل کی مانتی ہیں یا دوسروں سے بھی مشورہ لیتی ہیں؟"

"جیسا کہ میں نے کہا کہ میں تو ابھی سیکھنے کے مراحل میں ہوں اور کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ دل کی بات مان کر اپنی مرضی سے اداکاری کروں۔ مجھے ڈائریکٹر کی گائیڈلنس چاہیے ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہی اپنی ہدایت کاری سے ہمارے اندر کے فنکار کو باہر لاتے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کی نہیں' بلکہ اپنے ہدایت کار کی ہدایات کے مطابق کام کرتی ہوں۔"

"سینئرز کے ساتھ کام کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟"

"شروع شروع میں لگتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ سینئرز بہت پیارے انسان ہوتے ہیں۔ آپ ان کا دل سے احترام کریں' یہ آپ پر اپنا تجربہ نچھاور کردیں گے۔ آپ کو سکھائیں گے' سمجھائیں گے' تو مجھے سینئرز کے ساتھ کام کرکے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔"

"اس فیلڈ میں شوق لایا یا پیسے کی طلب؟"

"شوق۔ کیونکہ مجھے تو یہی نہیں پتا تھا کہ میں کامیاب بھی ہوں گی کہ نہیں بس اداکاری کا جنون مجھے اس فیلڈ مین لے کر آیا۔"

☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل	حمیرا اصغل
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا

بندھن

راحیلہ فردوس ہمراہ فرزان صدیقی

شاہین رشید

بندھن میں آپ سب نئے جوڑوں کے انٹرویو تو پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ سوچا' کبھی کبھار نسبتاً "پرانے جوڑوں سے بھی پوچھیں کہ زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ آج اور کل میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں۔ تو جناب اس بار ہمارا انتخاب "راحیلہ فردوس" صاحبہ ہیں۔ یہ سابقہ نیوز کاسٹر پی ٹی وی ہیں۔ آج کل امریکہ میں ہوتی ہیں اور گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک نجی چینل سے بھی وابستہ ہیں۔

"کیا حال ہے راحیلہ! بہت زمانے کے بعد آپ سے بات ہو رہی ہے۔"

"جی بالکل... مجھے سب یاد ہے... آپ سے کافی ملاقاتیں بھی رہیں۔"

"کیا مصروفیات ہیں آپ کی آج کل؟"

"یہاں امریکہ میں عجیب ہی لائف اسٹائل ہوتا ہے لوگوں کا۔" صبح ہوتی ہے' شام ہوتی ہے۔ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔" اور ویک اینڈ' ویک اینڈ کرتے زندگی گزر جاتی ہے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے کاسمیٹالوجسٹ لائسنس لیا تھا اور اس لائسنس کی وجہ سے میں نے جاب بھی کی۔ پھر میں نے اپنا "سیلون" بھی بنایا۔ اس کے علاوہ "آج ٹی وی یو ایس اے" کے لیے میں ایک پروگرام ہوسٹ کرتی ہوں۔ ہر منگل کو ریکارڈنگ ہوتی ہے اور اتوار کے دن پروگرام آن ایئر جاتا ہے۔ اور' یہاں کی کمیونٹی کے لوگوں کا انٹرویو کرتی ہوں' پروڈکشن بھی میری ہوتی ہے۔ باقی گھریلو مصروفیات ہیں اور آپ کے علم میں تو ہو گا ہی کہ یہاں پاکستان والے مزے نہیں ہیں۔ یہاں اگر آپ مصروف ہوتے ہیں تو واقعی مصروف ہوتے ہیں.... زندگی میں اگر آپ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں تو زندگی گزرنے کا پتا نہیں چلتا اور زندگی اچھی بھی گزر جاتی ہے۔"

"شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں؟ تھوڑا تفصیل سے بتائیں فیملی کے بارے میں۔"

"ماشاء اللہ سے ہماری شادی کو 25 سال ہو گئے ہیں۔ میرے میاں صاحب کا نام "فرزان" ہے۔

فرزان صدیقی نیویارک میں بہ حیثیت فارماسسٹ کے کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس باقاعدہ لائسنس ہے... اس کے علاوہ اپنا بزنس بھی کرتے ہیں۔ تین بچے ہیں ماشاء اللہ۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے' تینوں بچے زیر تعلیم ہیں۔"

"لو میرج ہے یا ارینج میرج؟ کامیاب کون سی زیادہ ہوتی ہے۔"

"پسند کی شادی کل بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح ارینج بھی۔ میری اور فرزان کی لو میرج ہے۔ اور لو میرج میں آپ اپنے اچھے برے کے ذمہ دار خود ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسے نبھانا بھی چاہیے۔ لیکن آج کل کی جنریشن میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ کرتے تو پسند کی ہیں مگر کچھ ہی عرصے کے بعد پسند بدل بھی جاتی ہے۔ اس لیے آج کل کی لو میرج زیادہ کامیاب نہیں ہے.... یہ میری اپنی سوچ ہے۔ اور اگر لو کو ارینج کرلیں جیسا کہ ہم نے کیا تھا تو پھر کامیابی کے چانس زیادہ ہوتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میری شادی کل ہی ہوئی ہے۔ چونکہ میں کامیاب زندگی گزار رہی ہوں تو میں تو یہی کہوں گی کہ سب کو پسند کی شادی کا حق حاصل ہے۔ بس گھر والوں کی رضامندی شامل کرلیں تو رشتہ مزید مضبوط ہو جاتا

ہے۔ پسند کی شادی میں لڑکا لڑکی کو ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ تو میں اسے برا نہیں کہوں گی۔"

"میاں صاحب سے ملاقات کہاں ہوئی تھی اور یو ایس اے کب آئیں۔ یعنی شادی کے کتنے عرصے کے بعد؟"

"فرزان کراچی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ان کا خیال تھا کہ شادی کر لینی چاہیے اور شادی کا جلدی فیصلہ لائف کو تھوڑا ڈسٹرب کر دیتا ہے۔ فارمیسی کا اسکوپ پاکستان میں بھی ہے مگر پاکستان سے باہر زیادہ ہے' چنانچہ یہ امریکہ آگئے اور یہاں آکر انہوں نے فارمیسی میں لائسنس لیا' امتحان پاس کیے

اور چونکہ مجھے بھی احساس تھا کہ شادی جلدی ہو گئی ہے اور اگر ہم نے جدوجہد نہ کی تو ہم دیگر لوگوں سے پیچھے رہ جائیں گے چنانچہ میں نے بھی انہیں باہر جانے دیا اور کہا کہ میں پاکستان میں کچھ عرصہ گزار لوں گی' شادی کے تقریباً" چار سال کے بعد "فرزان" امریکہ آگئے۔ اس وقت ہمارا بیٹا صرف چھ ماہ کا تھا۔ امریکہ آکر فرزان نے تعلیم شروع کی اور جب ان کی جاب ہو گئی تو انہوں نے مجھے بھی بلا لیا۔ اگرچہ میں امریکہ نہیں جانا چاہتی تھی مگر کہتے ہیں نا کہ جہاں آپ کا لائف پارٹنر ہو آپ کو وہیں رہنا چاہیے..... لائف پارٹنر میری پسند کا تھا اور تین سال کی جدائی کا عرصہ بھی بہت طویل تھا۔ دانہ پانی وہیں لکھا جا چکا تھا۔ پاکستان آکر معلوم نہیں کیا صورت حال ہو۔ لہٰذا میں نے بھی امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اللہ نے ترقی کے راستے کھول دیے اور بہت جلدی ہمیں شہریت بھی مل گئی اور لائف سیٹل ہوتی گئی۔ فرزان کی طرف سے مجھے اجازت ہے کہ میں سال میں ایک یا دو بار پاکستان جا سکتی ہوں' اللہ کا بڑا کرم ہے اور ہم بہت اچھی اور خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔

آپ کا یہ سوال کہ فرزان سے ملاقات کہاں ہوئی اور ایک دوسرے کی کیا بات اچھی لگی تو اس کا احوال کچھ یوں ہے کہ میں پی ٹی وی میں نیوز پڑھتی تھی اور میری تھوڑی بہت پہچان بن گئی تھی۔ میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے گئی تو یہ مجھے لابی میں نظر آئے۔ یہ اپنی

اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑے تھے اور پہلی نظر میں مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ یہ ملکی ہیں یا غیر ملکی' یہ اپنے دوستوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ ان ہی کے گروپ کی ایک لڑکی نے بڑے اچھے انداز میں مجھے ویلکم کہا پھر پوائنٹ کی بس میں جس سیٹ پر میں بیٹھی اس کے ساتھ والی سیٹ پر فرزان بھی بیٹھ گئے اور یہ محض اتفاق تھا اور اس وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر بس دوستانہ سی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ جب میں پوائنٹ کی بس سے اتری تو یہ بھی اسی راستے پر جا رہے تھے جس راستے پر میں جا رہی تھی اور میں حیران تھی۔

خیر اگلے دن میں نے اپنی ایک دوست سے کہا کہ کل ایک لڑکا جو یہاں کھڑا تھا' وہ بھی اس راستے پہ جا رہا تھا جس پہ میں جا رہی تھی' تو وہ بے ساختہ بولی "تم فرزان کی بات کر رہی ہو۔ اس کا تو گھر ہی وہاں ہے۔" بعد میں مجھے پتا چلا کہ فرزان تو ہمارے گھر سے ایک دو گلیاں چھوڑ کر رہتے تھے۔ خیر فرزان کو میری سادگی پسند آئی اور مجھے ان کی مسکراہٹ۔ پھر یہ بھی اپنی آرگنائزیشن کے لیے کام کرتے تھے اور مجھے بھی شوق تھا تو ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یوں ہمیں لگا کہ ہم ایک دوسرے کے ہم مزاج ہیں۔"

"ماحول کیسا ملا؟ جوائنٹ فیملی میں گئیں.... اور کیسا وقت گزرا؟"

"فرزان کے گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا اور میں نے میڈیا جوائن کر لیا تھا۔ اگرچہ میری فیملی میں میڈیا سے کسی کا تعلق نہیں تھا مگر مجھے نیوز پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ فرزان کے گھر والے کبھی بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا تعلیم سے فارغ ہوتے ہی شادی کر لے اور ایسا ہر ماں باپ چاہتے ہیں کہ بیٹا اسٹیبلش ہو جائے تب شادی کرے۔ مگر فرزان کی ضد تھی کہ مجھے جلد ہی شادی کرنی ہے اور راحیلہ سے ہی کرنی ہے.... شادی ہو گئی۔ گھرانہ نہ صرف غیر معمولی طور پر مذہبی تھا بلکہ مجھے جوائنٹ فیملی بھی ملی۔ میرے تین دیور اور دو جیٹھ تھے جو الگ رہتے تھے۔ میری فرینڈلی طبیعت تھی لہٰذا جلد ہی میری سب سے دوستی ہو گئی۔ مجھے بھی مذہب سے بہت لگاؤ تھا اور میلاد وغیرہ میں جانا اور نعتیں پڑھنا مجھے بہت پسند تھا۔ بس مشکل مجھے یہ ہوئی کہ مجھے گھر کے کاموں کی عادت نہیں تھی۔ امی نے بہت لاڈ میں پالا تھا تو آہستہ آہستہ میں نے گھریلو ذمہ داریوں کو سمجھا۔ میرے مزاج میں لڑکیوں والی کوالٹیز ذرا کم تھیں۔ جوائنٹ فیملی میرے لیے مسئلہ نہیں تھا کہ مجھے خود سب کے ساتھ مل جل کر رہنا اچھا لگتا ہے۔ بس یہ ہے کہ گھر بنانے کے لیے جدوجہد اور قربانیاں دینی پڑتی ہیں تب ہی گھر بنتے ہیں۔"

"رسمیں ہوئیں.... آج کل کی رسموں میں کیا فرق پاتی ہیں؟"

"میں محلے کی شادیوں میں بہت ایکٹو ہوا کرتی تھی۔ اور جب میری اور میرے بھائی کی شادی ایک ہی ڈیٹ پر ہوئی تب بھی میں نے بہت گانے گائے تھے۔ میری شادی میں باوجود مذہبی گھرانہ ہونے کے میرے سسرال والوں نے رسمیں کرنے سے منع نہیں کیا اور سب رسمیں ہوئیں اور میرے وقت میں گھونگھٹ نکالنے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا تھا اور آج بھی یہ رواج نہیں ہے۔ اس وقت بھی فوٹو شوٹ ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ ہاں اس وقت مجھے اس بات پر بہت دکھ اور افسوس ہوا تھا کہ عام دنوں کی بہ نسبت اس خاص موقع پر میرا میک اپ بہت خراب ہوا تھا حالانکہ مہنگا ترین میک اپ تھا.... خیر گھر آ کر میں نے اپنا میک اپ ٹھیک کیا۔ اس وقت بھی ہال میں شادیاں ہوتی تھیں۔ بھئی میں کوئی پتھر کے زمانے کی نہیں ہوں جو بہت فرق آ جائے گا۔ ہال پہنچے تو فرزان نے "بگھی" کا اہتمام کروایا ہوا تھا کہ دلہن کو بگھی میں لے جاؤں گا۔ گھر آئے' رسمیں ہوئیں۔ شرمائی لجائی بیٹھی تھی کہ کسی نے کہا کہ دلہن تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔ اسے چائے پلاؤ تو میں ایک دم سے بولی کہ ہاں ہاں مجھے چائے

دیں کیونکہ مجھے چائے پینی ہے.... سب ہنسنے لگے کہ لوگ دلہنوں سے اس طرح سے بولنے کی توقع نہیں رکھتے.... اس دن شدید سردی کی وجہ سے مجھے بخار بھی تھا۔

شادی سے ایک ہفتہ قبل مجھے ''مایوں'' بٹھا دیا گیا تھا۔ بھابھی نے کہا کہ بس اب یہ گھر کا کوئی کام نہیں کرے گی' حالانکہ میں تو پہلے بھی گھر کا کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ تو خیر خوب لاڈ اٹھائے گئے' پیلا جوڑا' پھولوں کا زیور سب کچھ زیب تن کیا گیا۔ خوش تھی اپنی شادی سے 'مگر یہ پتا نہیں تھا کہ شادی کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

میں تین بھائیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اور پھر پنجاب میں لڑکی کو میکے کی طرف سے دیا بھی بہت کچھ جاتا ہے تو امی نے لاتعداد جوڑے اور ضروریات زندگی کی ہر چیز دی تو میرے سسرال والے بھی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شادی کے پہلے دن کا جوڑا اور زیورات میں نے اپنی پسند سے بنوائے.... اس وقت حالات اچھے تھے۔ چوری ڈاکا نہیں تھا' اب تو پاکستان میں لوگ شادی کے موقعوں پر ڈھول بجاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں چور ڈاکو نہ آجائیں.... اب لڑکے' لڑکی کو پیسے دے دیے جاتے ہیں کہ جاؤ اپنی پسند سے شاپنگ کرلو.... یہ نمایاں فرق میں نے دیکھا ہے۔ میرے ولیمہ کا جوڑا میری پسند کا تھا اور میری ساس مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھیں پسند کروانے اور ہاں دوسرے دن یعنی ولیمے کا میک اپ میرا بہت خوب صورت ہوا تھا۔''

''آج کی شادی اور گزرے وقت کی شادی میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟''

''پہلے بھی شادیاں شادی ہال میں ہوتی تھیں اور اب بھی.... ہاں اب شادیاں بہت کمرشلائزڈ ہوگئی ہیں۔ پیسہ بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی فلم کی پروڈکشن ہورہی ہو' شوٹ ہورہی ہو.... پہلے شادیوں میں جذبات ہوتے تھے۔ رشتے سچے لگتے تھے' مگر اب دکھاوا اور بناوٹ بہت ہوگیا ہے۔

مثلاً ''جوڑا ہوگا تو ایک لاکھ سے دس لاکھ تک کا ہوگا۔ سجاوٹ پہ بہت خرچ کیا جاتا ہے۔ پہلے گھروں میں مہندی' مایوں کی رسمیں ہوتی تھیں اب ہوٹلوں میں باہر کے باہر ہی ہوجاتی ہیں۔''

''آپ دونوں کے رویوں اور مزاجوں میں کیا فرق آیا.... پہلے زیادہ نرم مزاج تھے یا اب ہیں.... محبت میں کمی آئی یا اضافہ ہوا' وقت کے ساتھ ساتھ؟''

''میرے اور فرزان کے ستارے مختلف ہیں۔ میں اسکارپیو ہوں اور فرزان پائیسنز''.... فرزان نسبتاً'' نرم مزاج ہیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کو حیران کردینے والے کام کرتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ ان کو کیا پسند ہے' وہ میرے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہم دونوں باتونی بھی ہیں اور ہماری باتیں مختلف فیلڈز کے بارے میں ہوتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو بور نہیں ہونے دیتے۔ مجھے میڈیا سے بہت لگاؤ تھا اور میں اسے چھوڑ کر آئی تھی' جس کی قدر فرزان نے بہت زیادہ کی اور میرا بہت زیادہ ساتھ دیا.... ہم میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے' مگر ہم لڑتے نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ بچے آجائیں تو محبت بٹ جاتی ہے' ایسا نہیں ہے بلکہ بچے بھی ہماری محبت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم ایک آئیڈیل لائف گزار رہے ہیں۔

فرزان گھر کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتے ہیں اور محبت میں کوئی کمی نہیں آئی کیونکہ ہم ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ ہم میاں بیوی ہیں' لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔۔۔ جب شوہر اور بیوی کا رشتہ سمجھیں تو پھر بہت سی ذمہ داریاں حائل ہو جاتی ہیں اور بیوی کو پھر ایک روایتی بیوی بننا پڑتا ہے اور شوہر بھی روایتی بن جاتا ہے کہ بیوی کھانا پکائے' وہ ہی کھانا آگے رکھے' شوہر کا ہر کام کرے۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔ میاں اور بیوی والی باتیں مجھے 1901ء کی باتیں لگتی ہیں۔ اگر میاں بیوی کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو پھر زندگی یونہی بٹوے میں ہی چلتی ہے۔"

"طلاقیں کیوں ہوتی ہیں۔۔۔؟ قصوروار کون ہوتا ہے اور کیا اب طلاقیں زیادہ نہیں ہونے لگ گئیں؟"

"طلاق کو ہمارے مذہب نے بھی بہت برا کہا ہے اور اگر ہم تھوڑا پیچھے چلے جائیں تو اس وقت کوئی سوچتا بھی نہیں تھا کہ ہم طلاق کی طرف چلے جائیں۔۔۔ شادی ہوتی ہے' فیملی بنتی ہے اور اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی برداشت بھی کر لیتے ہیں مگر اب لڑکیاں بہت بولڈ ہو گئی ہیں اور انہیں اپنے حقوق کا پتا بھی چل گیا ہے اور جب کوئی انفرادی سوچ' سوچتا ہے تو پھر مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ اب طلاقیں زیادہ ہونے لگی ہیں' پہلے جب کہ بڑی جوائنٹ فیملی بھی ہوتی تھی اور ساس سسر بھی ساتھ ہوتے تھے تو موردالزام ان ہی کو ٹھہرایا جاتا تھا جب کہ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میاں بیوی اکیلے رہتے ہیں مگر پھر بھی طلاقیں زیادہ ہونے لگی ہیں۔

پہلے لڑکیاں یہ سوچتی تھیں کہ اگر میں نے طلاق لے لی تو لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ اس لیے وہ قربانیاں دیتی تھی۔ اب لوگ نہ شادی کو سیریس لیتے ہیں نہ طلاق کو اور بڑے آرام سے طلاق لے لیتے ہیں۔۔۔ میڈیا کا بھی قصور ہے کیونکہ جو چیزیں ہمارے زمانے میں نہیں دکھائی جاتی تھیں اب بڑھا چڑھا کر دکھائی جاتی ہیں۔۔۔ **مثلاً** "میاں بیوی کی کسی اور کے ساتھ بھی انوالومنٹ دکھائی جاتی ہے اور اب اس چیز کو لوگ برا بھی نہیں سمجھتے اور اب میں نے دیکھا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ **سنسیئر** نہیں ہیں۔ سنجیدہ نہیں ہیں۔۔۔ مگر جنہیں گھر کی اہمیت کا احساس ہے وہ آج بھی گھر کو اپنے تعلقات کو سنجیدہ لیتے ہیں اور طلاق میں قصوروار کوئی بھی ہو سکتا ہے' میاں بھی' بیوی بھی۔ ساری بات سچویشن کی ہوتی ہے عمومی طور پر دیکھا جائے تو اب لوگ طلاق کو برا نہیں سمجھتے۔"

"آپ کے ساتھ سسرالی رشتوں میں اونچ نیچ ہوئی۔۔۔ کوئی فرق نمایاں تھا؟"

"پہلا فرق تو یہ تھا کہ میں پنجابی تھی۔ سسرال والے اردو **اسپیکنگ**۔ دوسری بات یہ کہ چونکہ فرزان تعلیم سے فارغ ہوتے ہی شادی کی بات کر رہے تھے تو ان کے گھر والے راضی نہیں تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں میڈیا سے تھی اور یہ لوگ بہت مذہبی۔۔۔ اور ان تینوں باتوں کو اگر آپ دیکھیں تو کسی ایک بات پر بھی اختلاف ہو سکتا تھا۔۔۔ ہمارے کھانے ذرا مختلف ہوتے تھے ان سے۔۔۔ میں زیادہ کھانے پکانے کی شوقین بھی نہیں تھی' مگر جب بھی پکایا سب کو بہت پسند آیا۔

میڈیا کے لوگوں کے لیے عموماً" لوگوں کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ انہیں گھریلو امور سے دلچسپی نہیں ہے' مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے سلائی بہت اچھی آتی تھی اور میں ایک ہی دن میں اپنا جوڑا سلائی کر کے پہن بھی لیا کرتی تھی اور یہ بات میرے سسرال والوں کے لیے بہت حیران کن تھی۔۔۔ سسرال میں میں اکیلی لڑکی تھی تو گھر میں ایک چینج آیا تو سب کو اچھا لگا۔"

"آج کل جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے تو موبائل ٹیکنالوجی نے زندگیوں پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟"

"جدید ٹیکنالوجی کے بہت فائدے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا صحیح استعمال بھی کیا جائے' اس نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے آپ دیکھیں کہ ہم ایک دوسرے کے قریب

بھی بہت ہوگئے ہیں۔ آپ کہاں میں کہاں اور ہم اتنی آسانی سے بات کررہے ہیں اس ٹیکنالوجی نے بالکل ٹرینڈ چینج کردیا ہے۔ ایک دوسرے سے ملنا ان کے ساتھ وقت گزارنا' دیگر آؤٹ ڈور ایکٹوٹی میں حصہ لینے کا اب تصور تقریباً" ختم ہوتا جارہا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اگر سب مل کر بھی بیٹھے ہیں تب بھی اپنے اپنے موبائل پہ سب مصروف ہوتے ہیں...

یوں سمجھیں کہ ہم سب ایک مشینی دور میں داخل ہوچکے ہیں اور یہ کوئی زیادہ اچھی بات نہیں ہے اور کسی بھی چیز میں نشے کی حد تک انوالو ہونا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ہر چیز میں بیلنس ہونا بہت ضروری ہے۔ موبائل میں گیم کھیلنا ہوسکتا ہے کہ ذہنی استعداد میں اضافہ کرتا ہو لیکن جو آؤٹ ڈور گیم ہوتے ہیں ان کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مشین کے ذریعے قریب آگئے ہیں۔ مگر ویسے ہم ایک دوسرے سے دور ہوگئے۔ شکلیں دیکھ لیتے ہیں' مگر لمس کو کھوچکے ہیں اور زندگی کا توازن ختم ہورہا ہے۔"

"گھر کا بجٹ کون بناتا ہے۔ فضول خرچ کون ہے۔ آپ یا وہ اور کن چیزوں پہ زیادہ خرچ ہوتا ہے؟؟"

"پاکستان میں جب تک میں تھی گھر کا بجٹ میں ہی بناتی تھی۔ فرزان کو تو کچھ پتا ہی نہیں تھا اور خود فرزان کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کی پہلی تنخواہ تمہارے ہاتھ میں رکھ دی تھی تو فرزان کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ گھر کا بجٹ کس طرح بنتا ہے۔ کس طرح خرچ ہوتا ہے' یہاں امریکا میں لائف پاکستان سے مختلف ہے۔ یہاں ساری خریداری کریڈٹ کارڈز سے ہوتی ہے اور یہ کارڈز ہم دونوں کے پاس ہیں اور ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں پوچھتے کہ تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں... اور فضول خرچ... تو اپنے اپنے معاملے میں ہم فضول خرچ ہیں بھی اور نہیں بھی... کچھ عرصہ پہلے یہاں ایک پروگرام ہوا کہ پاکستان میں ایک عام آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ "روٹی' کپڑا اور مکان" کا ہوتا ہے۔ جب کہ امریکا میں روٹی' کپڑا اور مکان ایک ایسی سہولت ہے جو سب کو حاصل ہے یہاں کسی چیز کی کوئی

کمی نہیں ہے کسی کو بھی۔۔۔ یہاں بھی پاکستان کی طرح چار موسم ہیں تو اس لحاظ سے ہمیں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ فرزان کو نئی ٹیکنالوجی کا شوق ہے اور بازار میں جب کوئی نئی چیز آتی ہے' خواہ وہ کتنی ہی مہنگی کیوں نہ آتی ہو' وہ خرید لیتے ہیں۔۔۔ اس لحاظ سے میں ان کو فضول خرچ کہتی ہوں' مجھے بھی جو چیز اچھی لگتی ہے میں خرید لیتی ہوں' مگر قیمت کا خاص خیال رکھتی ہوں کہ مہنگی نہ ہو اور اکثر اوقات مل کر جاتے ہیں تو یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ کون خرچ کرے گا اور کون نہیں۔"

"گھر کی سجاوٹ کا کس کو زیادہ شوق ہے؟"

"گھر کی سجاوٹ کا مجھے بہت شوق ہے اور یہاں ہی نہیں' پاکستان میں بھی میں گھر کی سیٹنگ چینج کرتی رہتی تھی۔ جو چیز ڈیکوریشن کے لیے پسند آجاتی تھی' میں لے آتی تھی اور یہاں آکر مجھے گھر سجانے کے لیے بہت اچھے آپشن ملے۔ یہاں ہر وقت ایک نئی چیز نظر آجاتی ہے اور پھر مزید مواقع مل جاتے ہیں' اچھی اچھی چیزیں لینے اور سجانے کے۔"

"اپنی کمائی' اپنی سیونگ الگ رکھتی ہیں؟"

"ہم دونوں کا بینک اکاؤنٹ ایک ہی ہے۔ جہاں مجھے ضرورت ہوتی ہے' میں اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرلیتی ہوں' جہاں فرزان کو ضرورت ہوتی ہے' وہ استعمال کرلیتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے۔ فضول خرچ ہم دونوں ہی نہیں ہیں۔ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی پسند کا علم ہے اور بچوں کی پسند کا بھی ہاں۔۔۔ آپ اسے میری فضول خرچی کہہ سکتی ہیں کہ میں ہر سال پاکستان آکر فرزان کا بجٹ متاثر کرتی ہوں اور انہیں پتا۔۔۔ ہے کہ مجھے ہر سال پاکستان جانا ہی ہے۔"

"اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"جی ضرور۔۔۔ فرزان کے ساتھ شادی کا جو بندھن ہے وہ الحمدللہ محبت اور عشق اور دوستی والا ہے اور جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ہمارا ایک دوسرے سے ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ہمارا جوڑا لکھا ہوا تھا۔ اور میں اپنے رب کا بہت شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے لیے اس نے ایک ایسے ساتھی کا انتخاب کیا کہ جس کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے 25 سال گزر گئے اور پتا ہی نہیں چلا۔۔۔ خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وقت تھوڑا آہستہ آہستہ گزرے۔۔۔ زندگی میں میں نے جدوجہد بھی کی۔ کمپرومائیز بھی کیے مگر اس کا صلہ بھی ملا۔ اور زندگی اس کا نام ہے کہ جب آپ کسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیتے ہیں تو اس کے ساتھ اونچ نیچ بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

امریکہ آکر سب کچھ اچھا نہیں ہوگیا بلکہ بہت محنت بھی کرنا پڑی کیونکہ میں پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتی تھی مگر اپنے بچوں کے فیوچر اور اپنے جیون ساتھی کی خاطر میں نے پاکستان کو خیرباد کہا اور یہاں آکر مجھے پتا چلا کہ اصل میں شادی کس چیز کا نام ہے۔ بہت سی چیزیں' بہت سی باتیں فیس کرنا پڑیں۔

اور چلتے چلتے ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گی کہ اس ساری جدوجہد میں میری امی کا بہت ساتھ رہا۔ امی چونکہ امریکہ آتی رہتی تھیں تو انہوں نے کافی ٹائم میرے ساتھ گزارا اور زندگی کے ہر موڑ پر مجھے اپنی امی کی سپورٹ حاصل رہی۔ امی کی وجہ سے ہی میں میڈیا میں آئی اور میں نے نیوز پڑھی۔۔۔ اور جب وہ دو سال پہلے یہاں آکر بیمار ہوئیں اور ان کو کینسر ہوا اور اب جب میں پاکستان سے واپس آتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ زندگی ایک دم چینج ہوگئی ہے اور میرے اس چینج کے ساتھ فرزان کے رویے میں بھی بہت تبدیلی آئی ہے اور وہ بھی اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو میری قربت تھی اور ان کی وجہ سے میں اکیلا پن محسوس کرتی ہوں تو وہ میرا بہت زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں اور میں ان کی احسان مند ہوں کہ وہ اب میرے اس اکیلے پن کو محسوس کرتے ہیں کہ اب امی میرے ساتھ نہیں ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے راحیلہ فردوس سے اجازت چاہی' اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے مصروفیات سے وقت دیا۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

صائمہ ثمر خالد

میں کوثر خالد جڑانوالہ کی بہو مخاطب ہوں۔

1 "شادی کب ہوئی؟"
"25 مارچ 2012ء میں انجام پائی۔"

2 "شادی سے پہلے کے مشاغل؟"
"بس نارمل۔۔۔ بچپن سے اسکول اور گھر کے کام۔ ہر کام سیکھا۔ حتی کہ قلعی بھی خود کر لیتی ہوں۔ ایف اے کیا تو بڑی بہن جس سے بہت پیار تھا۔ شادی کے 11 سال بعد وفات پا گئی۔ تو میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا۔۔۔ آگے نہیں پڑھا۔ پھر اسی بہنوئی سے مجھ سے تین سال بڑی افشاں کی شادی کر دی گئی۔ کیونکہ رئیس بھائی بہت اچھے ہیں۔ بڑی بہن سے عمر میں چھوٹے تھے اور افشاں سے بڑے ہیں۔ مگر ماشاء اللہ جوان ہیں ابھی بھی۔ میں ان کی بات زیادہ مانتی ہوں۔ شادی کے بعد مجھے الٹیاں آئیں تو کسی کے کہنے پر کھاتی نہ تھی حتی کہ ساس (کوثر) بھی ہار گئیں۔ مگر ان کے کہنے سے کھایا۔"

3 "رشتے میں مرضی؟"
"ماں باپ کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔"

4 "جیون ساتھی کے حوالے سے تصوّر؟"
"بھئی ہر لڑکی کی طرح یہ کہ پیار کرنے والا ہو جو ہر بات مانے۔"

5 "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"
"11 ماہ۔ سادہ سی منگنی۔ صرف پیسوں کا تبادلہ۔ سسرال والوں کی طرف سے سات ہزار دیے گئے۔ میکے سے دس ہزار ادا ہوئے۔"

6 "شادی کے لیے قربانی؟"
"کوئی نہیں۔"

7 "رسموں کے لین دین پر جھگڑا؟"
"کوئی نہیں۔ البتہ ان کا گھر بھی میکے کی طرح چھوٹا تھا اور ثمر کی پھپھو کی گیلری میں دو پیٹیاں اور صوفہ کی وجہ سے مجھے منع کیا کہ یہ دو چیزیں مت لاؤ۔ پیٹی کا تو مان گئی مگر صوفہ لے آئی۔ بعد میں جگہ کی وجہ سے اونے پونے بیچ دیا۔ البتہ میکے میں گھر چھوٹا ضرور ہے مگر تین منزلہ۔ دو بھابھیاں ہیں۔ آصفہ اور بڑی بھابھی تسنیم۔ ان کا سامان اوپر پورا آ گیا۔ مگر وہ سارا دن امی کے پاس نیچے ہی رہتی ہیں۔ ممی کوثر بہت حیران ہوئیں کہ اتنی سی سیڑھیوں سے سامان اوپر کیسے لے کر گئے ہم نے کہا۔۔۔ سیڑھی کا جنگلہ کھلنے والا ہے۔ بڑی واہ واہ کی۔۔۔ اور ہمارے گھر کے کاموں کی پھرتی اور

صفائی کی بھی تعریف کی۔"

8 "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

"آکر دو نفل شکرانہ پڑھے کہ مولا شکر ہے' دس ہزار تنخواہ پر اتنی پیاری بیوی مل گئی اور سلام کیا۔ پھر دوائی دی کہ ہمیں تیز بخار تھا۔"

9 "شادی کے بعد خاص تبدیلی؟"

"شادی سے پہلے غصہ کم آتا تھا۔ اب زیادہ آتا ہے۔ کیونکہ پہلے کام کرکے تھکتی نہ تھی' اب تھک جاتی ہوں۔ مگر کام تو کرنا ہی ہے۔ سجاوٹ کی بہت چیزیں بھی بناتی ہوں۔ پرانی اشیا سے پھول و ڈیکوریشن پیس بنائے ہیں۔ اب محمد ربیع کی سالگرہ آنے والی ہے۔ 26 دسمبر تو غبارے والا کارٹون بنایا ہے۔ جو بچوں نے پھاڑ دیا۔ اب سالگرہ والے دن دوبارہ بنالوں گی پندرہ منٹ میں۔"

10 "کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

"تقریباً" دو ہفتے بعد زردہ پکا کر کام سنبھال کیا۔ سلائی بھی کرتی ہوں پھپھو (ساس) کے ساتھ۔"

11 "میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟"

"ہمارے گھر میں بھائی بہت چسکورے ہیں۔ گوشت کے بغیر بات نہیں کرتے۔ ابا جان تو مچھلیاں پکڑ کر سند بھی لے چکے ہیں تو ثمر کو بھی کھلاتے ہیں۔ گھر تو سسرال سے چند گلیاں چھوڑ کے ہے اور اسکول بھی وہی ہے۔ جہاں کوثر ممی نے تعلیم حاصل کی۔ لاہور ڈیف اور ڈمب سے ملحقہ اسکول ملی دارالاطفال ہائی سکول۔۔۔ اب کوثر ممی کی بھتیجی طوبیٰ کو بھی ادھر داخل کروایا ہے۔"

12 "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی؟"

"سارے ہی کاموں پر۔۔۔ البتہ پھپھو کو بلڈ پریشر ہے تو سالن میں نمک کم کھانے کی عادت ہو گئی مجھے بھی' مگر ثمر اور ممی نمک ڈال کر کھاتے ہیں الگ سے' جبکہ میں میکے جاکر بھی کم نمک کا تقاضا کرتی ہوں یعنی خود کو بدل لیا۔"

13 "سسرال سے وابستہ توقعات کہاں تک پوری ہوئیں؟"

"دس فیصد۔"

14 "پہلے بچے کی پیدائش؟"

"ساڑھے تین سال تک دعائیں کیں۔ کروائیں ممی کوثر سے استخارے کروائے۔ تو ربیع الاول میں ربیع ملا۔۔۔ ماں کے گھر پیدا کیا۔۔۔ البتہ الٹیاں آتی تھیں اور آرام کی غرض سے جڑانوالہ آئی تو ممی جی نے خوب آرام کروایا اور ڈرپ لگوائیں اور پسند کا کھانا دیا۔ اور یہاں مجھے الٹی نہ آئی۔ رضا دیور نے پھلوں کا ڈھیر لا دیا کہ کھاؤ۔ بچہ' ثمر اور تمہارے جیسا کمزور نہ ہونا چاہیے۔ مگر ہم نے کھا کے نہ دیا۔"

15 "سسرال میں مقام؟"

"الحمدللہ عزت بنی ہوئی ہے۔ اللہ کا کرم ہے بہت۔"

16 "میکے اور سسرال میں فرق؟"

"بھئی میکہ میکہ ہے اور سسرال سسرال ہے۔ فرق تو ہوتا ہے' جو غنڈہ گردی میکے میں چلتی ہے وہ سسرال میں تو نہیں چلا سکتے۔ یہ تو عزت دو اور لو والا رشتہ ہے۔"

18 "شوہر سے تعلقات؟"

"جناب پیار بھی بہت ہے' لڑائی بھی ہوتی ہے۔ شوہر محنتی تو بہت ہے مگر کمائی کم ہے۔ ڈبل کام کررہے ہیں تو تھک جاتے ہیں اور میں بھی تھک جاتی ہوں اور بھی بہت مسئلوں پر ہو جاتی ہے۔ جڑانوالہ آئے ہوئے ہیں اور ممی ہی میرا سروے پوچھ کر لکھ رہی ہیں۔ کل ربیع ـــــ بیمار تھا تو میں نے کہا ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں' ثمر نے کہا۔ دکھانے کی ضرورت نہیں ـــــ ہے۔ میں دوا لادیتا ہوں۔ ممی نے فیصلہ کیا۔ چلو ڈاکٹر کے پاس گئے تو ڈاکٹر آپریشن کررہا تھا۔ دیر بہت لگی۔ ممی تو دعا پڑھتی رہیں جبکہ میں تھک گئی تو ثمر سے کہا چلتے ہیں مگر ممی ڈٹ گئیں۔ ڈاکٹر آنے والا ہے۔ تم جاؤ میں دوا لکھوا کر جاؤں گی اور ڈاکٹر آگیا اسی وقت' دوائی گھر آئے۔ دی اب ذرا فرق پڑ گیا ہے اور ہم۔۔۔ تصویر کھنچوانے بازار جارہے ہیں کیونکہ ہم اپنی تینوں کی تصویر بھیجنا چاہتے ہیں۔"

☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ج ۔ ن

میں زندگی میں پہلی بار کسی سلسلے میں شرکت کر رہی ہوں ہو سکتا ہے آپ کے حساب سے یہ بہت کچی تحریر بھی ہو لیکن پلیز اس کو ضرور چھاپیے گا کیونکہ میں نے پین' دستہ اور لفافہ بڑی مشکل سے منگوایا ہے۔ میرے بیٹوں نے میرا بڑا مذاق اڑایا ہے کہ آپ کی یہ تحریر کبھی نہیں چھپے گی۔ آپ کا جو کام ہے' وہ کریں اور ہمیں کڑاہی گوشت بنا کر کھلائیں۔ بس میں نے ان سے بڑے دعوے کے ساتھ کہا ہے کہ ضرور چھپے گی کیونکہ یہ پرچا ہم جیسی عام بہنوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس لیے پلیز میرے کہے کی لاج رکھ لیں۔

س : "شادی کب ہوئی؟"

ج : "20 فروری 1998ء۔"

س : "شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے۔ شادی کے بعد کیا تبدیلی آئی؟"

ج : "شادی سے پہلے کزنز کے ساتھ گھومنا پھرنا' عمران سیریز پڑھنا' پینٹنگ کرنا' شاہ رخ خان اور دلیپ کمار کی پرانی فلمیں دیکھنا' دل لگا کر پڑھنا' پڑھنے میں' میں بہت اچھی تھی۔ شادی کے بعد سب ختم' یہاں تک کہ ہم لوگ ہنی مون پر بھی نہ گئے۔ شادی سے پہلے میں چوڑی دار پاجامے پہنتی تھی۔ شوہر صاحب نے کہا کہ نہیں پسند تو تمام پاجامے ضائع کر کے شلواریں سلوالیں۔"

س : "کیا شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی؟"

ج : "میری سسرال میری خالہ کے ہمسائے تھے۔ جب وہ لوگ مجھے دیکھنے آئے تو مجھے کافی پینڈو سے لگے۔ گھر کافی اچھا تھا۔ امیر بھی تھے۔ فیملی بھی بڑی تھی۔ ہم لوگ ملتان میں رہتے تھے۔ میرے ننھیال اور سسرال والے گوجرانوالہ میں رہتے تھے۔ جس دن مجھے دیکھ کر گئے۔ اگلے دن ہم لوگ ملتان چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ ملتان جا کر امی سے بات کروں گی کہ لڑکا اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں ہے لیکن پتا چلا کہ نانو نے تو ہمارے روانہ ہونے کے بعد مٹھائی دے کر ہاں کردی۔ میں نے سوچا چلو گھر کی بڑی بہو بنوں گی تو عزت بھی بہت ہو گی۔ پھر منگنی پہ کپڑے بھی بہت اچھے تھے۔ چھوٹی تھی' بہل گئی۔"

س : "جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟"

ج : "جیون ساتھی کے بارے میں سوچا تھا کہ محبت کرنے والا ہو' ساتھ نبھانے والا ہو' رعب والا ہو' دیو قسم کے مرد مجھے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے اور کانوں کا کچا نہ ہو۔"

س : "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

ج : "ایک سال رہی۔"

س : "شادی کے لیے کوئی قربانی دینا پڑی؟"

ج : "مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ایم بی اے کروں لیکن ایف ایس سی کے بعد میری منگنی ہو گئی اور تھرڈ ایئر میں تھی تو شادی ہو گئی۔ اس بات کا افسوس مجھے آج بھی ہے کہ میری پڑھائی ادھوری رہ گئی۔"

س : "شادی کی رسموں کے دوران لین دین پر کوئی جھگڑا؟"

ج : "دودھ پلائی کے وقت میرے سسر نے پیسوں کا لفافہ پکڑا دیا۔ میری کزن نے لفافے میں موجود پیسے گن کر لفافہ پیچھے کی طرف پھینک دیا اور کہا کہ پیسے تھوڑے ہیں۔ اتفاق سے وہ لفافہ میرے سسر کے منہ پر لگا۔ اس کے فوراً" بعد انہوں نے مطالبے کے مطابق پیسے دیے اور اٹھ گئے۔ سب لوگ خوش دولہا والے تو بڑے دل والے ہیں۔ وہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے غصے میں دیے تھے اور میری طبیعت

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

بھی خوب صاف کی۔"

س : "شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار دیکھا تو کیا کہا؟"

ج : "میری تعریف میں ایک پیراگراف کہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا جیسے رٹ کے آئے ہیں۔"

س : "شادی کے بعد سسرال والوں کا رویّہ کیسا تھا؟"

ج : "شادی سے پہلے جب میرا رشتہ طے ہوا تو میرے گھر والوں نے بتا دیا تھا کہ مجھے کوکنگ نہیں آتی تو انہوں نے کہا ہم سکھا دیں گے۔ شادی کے بعد سکھایا ضرور۔ لیکن طعنوں کے ساتھ۔ گھر کی ملازمہ جو دن رات رہتی تھی اُس کو ملازمت سے نکال دیا' دھوبی اور ٹیوٹر کو جواب دے دیا اور ان سب کے کام میرے ذمہ لگ گئے۔

رات بارہ بجے سے پہلے مجھے کمرے میں جانے نہ دیتے کہ چائے بنا دو' ادھر ادھر کی باتوں میں الجھاتے رہتے۔ ولیمے والے دن صبح کا ناشتہ بھی ہم نے ساتھ نہ کیا کہ میرے آٹھ سال کے دیور نے کہا کہ بھائی اب ہم سے الگ ہو گئے ہیں۔ میرے میاں اپنا ناشتہ اٹھا کر باہر لے آئے' مجبوراً' مجھے بھی ناشتہ باہر کرنا پڑا۔ باہر گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اگر کبھی میں اپنی خالہ یا نانو کی طرف جاتی تو چھوٹے دیور کو ساتھ بٹھا دیتے اور اس سے پوچھتے کہ کیا کیا باتیں کیں' کیا کھایا پیا۔

دوپہر کو میرا دیور میرے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا تو مجبوراً' مجھے باہر بیٹھنا پڑتا۔ رات ایک ڈیڑھ بجے سونا۔ صبح اسکول بچوں کو بھیجنے کی ذمہ داری بھی میری تھی۔ اس کے بعد دکان والوں کے کپڑے نکالنا۔ ان کو ناشتا کروانا۔ پھر کچن سمیٹنا۔ مجھے دوپہر کو باہر بیٹھے نیند آجاتی تو اس کا بھی مذاق اڑتا۔ میرے سونے کی نقل کی جاتی۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوتی پھر میں نے باتھ روم میں جا کر سونا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس منٹ کموڈ پر بیٹھ کر سونے سے میرا دماغ فریش ہو جاتا۔ میری ساس نے مجھے منع کیا کہ میں لاؤنج میں اپنے شوہر کے پاس نہ بیٹھوں' بچوں (میرے دیور) کے کچے ذہن ہیں' خراب ہوں گے۔ رات کو جلدی سو جایا کرو اور باتیں نہ کیا کرو کیونکہ میرے سسر کی چارپائی بالکل ہمارے کمرے کی دیوار کے ساتھ تھی۔ ایک کنال کی کوٹھی کا لاؤنج چھوٹا نہ تھا لیکن ان کو اسی دیوار کے ساتھ چارپائی بچھانی تھی۔ جب میرے میاں صاحب رات کو لیٹ آتے اور میں انتظار کرتی کہ وہ آئیں تو اکٹھے کھانا کھائیں گے تو میرے سسر مجھے بہت ڈانٹتے اور کہتے کہ تمہارے خاندان میں اس طرح کی حرکت ہوتی ہو گی ہمارے رواج نہیں ہے۔ کھانا ہے تو سب کے ساتھ مل کر کھاؤ۔ اگر شوہر کے ساتھ کھانے کا اتنا شوق ہے تو اپنا پکاؤ اور اپنا کھاؤ۔ بس میں نے ان کی یہ بات نہ مانی' جھڑکیں سن لی' طعنے سن لیے لیکن یہ بات نہ مانی۔ اتنی ذمہ داری اٹھانے کے بعد ہفتے میں ایک بار شوہر کے ساتھ کھانے کی اجازت مل ہی گئی۔"

س : "شادی کے کتنے عرصے کے بعد کام سنبھالا؟"

ج : "میکے میں فیملی چھوٹی تھی' میں اور میری آٹھ سالہ بہن' جبکہ سسرال میں میرے پانچ دیور اور ایک نند تھے۔ سب ہی جوان تھے' بس ایک دیور تھا چھوٹا آٹھ سال کا۔ اسی لیے کھانے کی مقدار میں فرق تھا۔ کھانا میرے میکے میں دو وقت بنتا تھا اور سسرال میں ایک وقت۔ میں نے سوچا کہ بڑی ہنڈیا کا نمک مرچ اور دوسرے لوازمات کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس لیے میں تیسرے دن کچن میں گئی کہ دیکھوں کیسے پکاتے ہیں۔ تو میری نند نے مجھے لہسن اور پیاز چھیلنے پر لگا دیا۔ چلو فارغ بیٹھی یہ ہی چھیلے جاؤ۔ ولیمہ کے آٹھ دن بعد میں ملتان چلی گئی اور پندرہ دن رہ کر آئی تو کام سنبھال لیا۔ جس میں ہنڈیا کی نمک مرچ ڈالنے کے علاوہ تمام کام شامل تھے۔ پر پھر بھی' بھابی کو تو کچھ پکانا نہیں آتا۔"

س : "سسرال اور میکے کے کھانوں میں کیا فرق تھا؟"

ج : "کوئی خاص فرق نہ تھا۔ بس ایک دو ڈشز جیسے مچھلی' پائے اور بروسٹ انہیں میری امی کے ہاتھ کا پسند آیا تو فرمائش کی کہ طریقہ سیکھ کے آؤ اور پکاؤ' اور اب انیس سال سے دونوں ڈشز میری امی کے طریقے سے پک رہی ہیں۔ میں نے اپنی دیورانیوں کو بھی سکھا دیا

ہے۔“

س : ”میکے اور سسرال کے ماحول میں کوئی فرق محسوس ہوا؟“

ج : ”میکے میں پڑھے لکھے لوگ تھے۔ خاص طور پر نئی نسل میں خود بھی کانونٹ اسکول میں پڑھی ہوں۔ جبکہ میرے سسرال میں ریکارڈ ہے کہ کوئی لڑکا میٹرک تک نہیں گیا اور اگر کوئی پہنچا ہے تو پاس نہیں ہوا۔ میرا بیٹا پہلا لڑکا ہے جس نے میٹرک میں اے گریڈ حاصل کیا۔“

س : ”سسرال میں کس بات پر تعریف ہوئی‘ کس پر تنقید؟“

ج : ”میرا تعلق جس خاندان سے تھا۔ اس خاندان کی ایک لڑکی میرے سسر کے چچا کی بہو تھی اور اس کی اپنے سسرال میں بالکل نہ بنی اور آئے دن ناراض ہو کر میکے جاتی رہتی۔ میرے سسرالی خاندان میں ہمارے خاندان کے بارے میں بہت غلط باتیں مشہور تھیں کہ یہ لوگ بڑے چالاک ہیں‘ ان کی لڑکیاں بہت تیز ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے میرے سسر اپنے رشتہ داروں کے سامنے میری تعریف کرتے کہ دیکھو ہم بھی اسی خاندان سے لڑکی لائے ہیں۔ جو ہمارے رنگ میں رنگ گئی ہے اور کام بھی کرتی ہے لاڈلی ہونے کے باوجود گھر سنبھالا ہوا ہے کیونکہ ہم لوگ اچھے ہیں‘ بہو کو عزت دی‘ پیار دیا‘ اس لیے وہ بھی ہمارے ساتھ اچھی ہے۔ لڑکی کو پیار چاہیے ورنہ تو وہ میکے ہی گھسی رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ اور گھر میں میری ہر عادت کو پسند نہیں کیا جاتا۔ میرے کپڑوں‘ فرنیچر‘ کھانے طریقے میں نقص نکالتے ہیں۔ میں تو کہوں گی سسرال وہ اکیڈمی ہے جو آپ کو بتاتی ہے کہ آپ میں کتنی برائیاں ہیں جو دُنیا میں کسی کو نظر نہیں آتیں۔“

س : ”کیا سسرال میں آ کے وہ مقام ملا جس کی مستحق تھیں؟“

ج : ”سسرال والوں نے مجھے کوئی مقام نہیں دیا۔ شادی کے چھ سال بعد جب میرے اپنے تین بچے تھے‘ میرے شوہر نے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ میرے ساس سسر نے بہت کوشش کی کہ ہم الگ نہ ہوں کیونکہ گھر بھی سنبھالا ہوا تھا اور کبھی کسی کڑوی بات کا جواب بھی نہ دیا لیکن بچے چھوٹے تھے۔ سسرال والے چاہتے ہیں کہ بہو کام بھی کرے اور اس کے بچے شور بھی نہ مچائیں‘ شرارت بھی نہ کریں۔ ماں اکیلی باہر کام کرے اور بچے شرافت سے کمرے میں بند رہیں۔ ایسا تو ممکن نہ تھا۔ بچوں کو ڈانٹنا اور ان کی شکایات لگا کر باپ سے مار پڑوانا تو جیسے گھر میں سب لوگوں کا اولین فرض تھا۔ عورت جب ماں باپ کے لیے قربانی دیتی ہے تو بچوں کے ساتھ زیادتی بھی برداشت نہیں کرتی۔ ہم نے بہتر سمجھا کہ گھر میں لڑائی جھگڑا کرنے کی بجائے شرافت سے الگ ہو جائیں لیکن میرے سسر نے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا اور ہم سے بیر باندھ لیا۔ انہوں نے کوئی ایسا موقع نہ گنوایا جب انہوں نے میری بے عزتی نہ کی

جبیں چیمہ کو صدمہ

پچھلے دنوں چترال میں طیارے کو پیش آنے والے حادثے میں جواں سال ڈپٹی کمشنر چترال‘ اسامہ احمد وڑائچ بھی شہادت کے درجے پر فائز ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ آمنہ وڑائچ اور بیٹی مہ رخ بھی تھیں۔

اسامہ مشہور افسانہ نگار جبیں چیمہ کے صاحب زادے تھے۔

جبیں چیمہ کے لیے یہ عظیم صدمہ ہے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے اور شہید اسامہ کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔

ہویا مجھ سے معافی نہ منگوائی ہو۔"

س : "سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟"

ج : "میں نے سوچا تھا کہ عام ساس بہو کی طرح جھگڑے فساد میں نہیں پڑوں گی بلکہ اپنا ظرف بڑا رکھوں گی اور بھلی بری برداشت بھی کروں گی۔ میں نے ایسا کیا بھی 'بڑے سے بڑے طعنے یہاں تک کہ انہوں نے میرے ابو' میرے خاندان والوں کا مذاق اڑایا۔ میرے سسرال والے تو کہتے تھے یہ (میں) تو اونچا سنتی ہے 'کیونکہ نہ میں نے پلٹ کر جواب دیا اور نہ کبھی موڈ آف کیا۔ کہیں سسرال والے یہ نہ کہیں کہ ہمیں تو سیدھے منہ بلاتی نہیں۔ بڑی بہو ہونے کے ناتے گھر کی ذمہ داریاں نبھانے میں اپنے بچوں کو اگنور (نظرانداز) بھی کیا۔ لیکن جب بھی میری ساس گھر سے باہر دوسرے شہر جاتیں 'گھر کا خرچہ میری دیورانی کو پکڑاتیں جو میرے سسر کی بھانجی تھی۔ خاندان میں کہیں جانا ہوتا اس کو لے کر جاتیں۔ میری حیثیت صرف ایک نوکرانی کی تھی۔ اچھا کام کیے جاؤ ورنہ کوئی آپ کو سیدھے منہ نہیں بلائے گا۔"

س : "پہلے بچے کی پیدائش پر سسرال والوں کا رویہ کیسا تھا؟"

ج : "میرا پہلا بیٹا میکے میں پیدا ہوا۔ جب مہینے کا ہوا تو واپس اپنے سسرال آگئی۔ میری ساس مجھے مدر فیڈ نہیں کروانے دیتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ جتنی دیر بچے کو دودھ پلانے میں لگتی ہے۔ اتنی دیر میں سو کام ہو جاتے ہیں۔ میری ایک ہی نند ہے جس کی ان دونوں شادی تھی۔ میری ساس کوکنگ بالکل نہیں کرتی تھیں

حالانکہ ان کے سارے بچے کنوارے تھے نہ کپڑے دھوتی تھیں اور نہ برتن۔ جب میں نے زیادہ توجہ نہ دی تو چار پانچ دن بعد میری شکایت میرے سسر سے لگائی۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور کہا اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور جاؤ یہاں سے 'پھر سارا دن فیڈر ہوتا' چوسنی ہوتی 'کبھی دودھ پی لیتا' کبھی بھوکا رہتا اور میرے نہ ختم ہونے والے کاموں کا سلسلہ۔"

س : "کیا آپ جوائنٹ فیملی سسٹم کی قائل ہیں؟"

ج : "جوائنٹ فیملی سسٹم ہو تو باہمی عزت واحترام ہونا چاہیے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہوں یا نہ ہوں 'محبت ہو یا نہ ہو لیکن ایک دوسرے کے لیے احترام اور عزت ضرور ہونا چاہیے اور گھر کے بڑوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں میں انصاف کریں۔ کیونکہ عزت صرف رب کے ہاتھ میں ہے۔ بڑوں کو بڑے کی جگہ رکھیں اور چھوٹوں کو چھوٹے کی جگہ رکھیں۔ ایک دوسرے کی زیادتیوں کو درگزر کریں۔

میرے دیور دیورانیوں نے میرے ساتھ زیادتی کی اور میرے سسر نے ان کا ساتھ دیا اور کہا اس کو کھینچ کر رکھو۔ میں نے صبر کیا اور اللہ کا فرمان کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض نہیں ہونا چاہیے' پر عمل کیا اور کسی سے ناراض نہیں ہوئی اور اللہ کی کرنی دیکھو جب بھی میری کسی دیورانی کے ہاں بچے کی پیدائش ہوتی تو حالات ایسے ہوتے کہ میں ہی سنبھالتی۔ شاید اللہ نے ان کو شرمندہ کرنے کے لیے یا میرے صبر کا پھل دینے کے لیے ایسے حالات پیدا کیے۔

آج میرے تمام دیور دیورانیاں مجھ سے خوش ہیں میری عزت کرتے ہیں۔ اللہ نے مجھے اپنا گھر بھی دے دیا ہے اور میری تمام بہنوں سے گزارش ہے کہ وقت کتنا بھی کٹھن ہو بالآخر کٹ جاتا ہے۔ صرف کہانیوں اور ڈراموں میں اینڈ اچھا نہیں ہوتا بلکہ عام زندگی میں بھی اینڈ اچھا ہوتا ہے۔ اگر ہم لوگوں سے توقعات نہ رکھیں بلکہ صرف اللہ سے توقع رکھیں تو اللہ ہمیں کبھی خالی ہاتھ نہیں رکھے گا۔ ہم تب مایوس ہوتے ہیں جب ہم اللہ کے بجائے انسانوں سے توقعات وابستہ کرلیتے ہیں۔

صائمہ اکرم چوہدری

شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے' تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔
محتشم علی خان ایم این اے ہیں' ان کے تین بیٹے وہاج' برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔
خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں' پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت

بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔
خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو' توان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔
ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔
انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے' لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔
ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیورو کریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔
پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں' بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔
اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہو ئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فارسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔
محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے' لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔
ٹینا بیگم، شہزاد کے ساتھ ایک آستانے پر جاتی ہیں۔ واپسی پر گھر کے گملے ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے تیسرے شوہر ہارون رضا بتاتے ہیں کہ رومیصہ نے پھر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ ٹیبو دکھاتے ہیں تو ٹینا بیگم کا سر گھوم جاتا ہے۔
بریگیڈیر وقار درانی کی بیٹی کنزہ درانی کی گاڑی کی ٹکر سے جسٹس محمود کا بیٹا روحیل محمود ہلاک ہو جاتا ہے۔ رومیصہ اس وقت کنزہ کے ساتھ تھی۔ کنزہ کے والد اسے کیس سے نکال لیتے ہیں، مگر رومیصہ پھنس جاتی ہے۔ "ہم زاد" کے مشورے سے شہزاد اس کا کیس لڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ رومیصہ کی وجہ سے ٹینا اور ہارون رضا کے درمیان تلخی بڑھ جاتی ہے۔ درشہوار، طوبیٰ اور نمرہ تینوں امتحان میں فیل ہو جاتی ہیں۔ مگر شرارتیں عروج پر ہیں۔ بالآخر محمد ہادی تنگ آکر برہان سے ان کی شکایت کرتا ہے۔ گھر والے تینوں کو ڈانٹتے ہیں۔ درشہوار اور طوبیٰ واک کے لیے نکلی ہوتی ہیں کہ ایک کتا ان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ درشہوار ڈر کے مارے جنگل میں گھس جاتی ہے۔ جہاں اتفاق سے محمد ہادی موجود ہوتا ہے۔ وہ کتے کو مار دیتا ہے۔ اس کا ہمدردانہ رویہ درشہوار کے دل کی دنیا بدل دیتا ہے۔

خاقان صاحب کا نام کسی اداکارہ کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر انابیہ کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ایسے میں برہان کا نرم رویہ اس کے لیے ڈھارس بنتا ہے، مگر اسی لمحے برہان کے سیل پر کسی لڑکی کی کال اسے خدشات میں مبتلا کر دیتی ہے۔
وہاج کی فرمائش پر صندل کو نور محل بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک دن وہاج کو اپنی شیطانی خواہش پوری کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ صندل کو بے دست و پا کر کے کمرے میں لے جاتا ہے۔

چوتھی قسط

"کس قدر عجیب ہو گئی ہے یہ صندل۔"
انابیہ شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا بھاری بھرکم دروازہ کھول کر پچھلے لان میں نکلی تو اس کی پہلی نظر اسی پر پڑی تھی۔
پچھلے لان میں تاجدار بیگم نے آج اپنا مخصوص تخت پوش نکلوا کر باہر رکھا ہوا تھا اور اس پر وہ اپنی دیورانی شارقہ بیگم کے ساتھ براجمان تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر سردیوں کی جاتی ہوئی تیز اور چمکیلی دھوپ میں صندل کیاری کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔
انابیہ نے چائے کی ٹرے تاجدار بیگم کے پاس رکھی اور اپنا کپ اٹھا کر ان کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے بغور صندل کو دیکھا، اس کا جسم انتہائی کمزور، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، رنگ و روپ اجڑا ہوا، وہ بالکل اس خزانے کی مانند لگ رہی تھی جسے کسی نے سرعام لوٹ لیا ہو۔
ایک ہفتہ پہلے جب وہ ایک سو تین بخار کے ساتھ "میر ہاؤس" پہنچی تو اس کے والدین کے ساتھ ساتھ گھر کے مالکوں کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ وہ بالکل بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔
"ہائے ہائے دیکھو، کہیں مر مرا تو نہیں گئی۔" ندرت امی نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔
"نہیں نہیں چھوٹی امی، سانس لے رہی ہے۔" طوبیٰ نے فوراً کان لگا کر اس کی سانسوں کا زیر و بم محسوس کر کے انہیں تسلی دی۔
"لیکن کیسی بے سدھ ہے یہ۔" شارقہ بیگم کو بھی پریشانی لاحق ہوئی۔
"مجھے لگتا ہے بیگم صاحبہ! نمانی کا دل نہیں لگا ادھر۔" صندل کی والدہ رشیدہ بیگم دوسروں سے زیادہ خود کو تسلی دینے کے انداز میں بولیں۔

"کم بخت کو دل لگانے کے لیے تھوڑی بھیجا تھا وہاں۔" تاجدار بیگم نے بےزاری سے سر جھٹکا۔
"لگتا ہے کسی چیز سے ڈر گئی ہے یہ۔۔۔" رشیدہ بیگم نے بوکھلا کر صفائی دی۔
"لو وہاں کون سا جن بھوت بستے ہیں' انسانوں میں ہی تو گئی تھی۔۔۔" ندرت امی کے طنزیہ لہجے پر صندل کی ماں گڑبڑا سی گئی۔
"لیکن پھر بھی اکثر چیخیں مارتی ہے رات کو نیند سے اٹھ کر۔" اس کی ماں نے فکرمند انداز سے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"اچھا۔۔۔؟" یہ بات گھر کی باقی خواتین کے لیے تشویش کا باعث بنی۔
"اسے دم کروا کر لاؤ کیکر والے بابے سے۔"
تاجدار بیگم کے مشورے پر رشیدہ بیگم اگلے دن ہی اپنی بیٹی کو لے کر پیر مراد علی شاہ کے آستانے پر پہنچ گئیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔
صندل کو "میر ہاؤس" آئے ہوئے پورے پندرہ بیس دن ہو چکے تھے لیکن اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر جو پہلے دن سے ثبت ہو چکی تھی' وہ کسی صورت بھی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بخار تو جلد ہی اتر گیا تھا لیکن اس کے ہونٹوں کی ہنسی' آنکھوں کی شرارت اور سارا لاابالی پن بھی ساتھ ہی لے گیا تھا اور یہ بات گھر کے سب ہی مکینوں کے لیے باعث تشویش تھی کیونکہ اس کے ہونٹوں سے تو بات بات پر ہنسی کے جھرنے پھوٹتے تھے اور اس بات پر اسے اکثر ہی تینوں خواتین سے جھاڑ بھی پڑتی تھی۔
"بی بی جی! سارے لحاف نکال کر دھوپ میں پھیلا دیے ہیں۔" ایک ملازمہ نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اطلاع دی۔
"اچھا اچھا ٹھیک ہے اور دو گھنٹے کے بعد ان کو اندر بھی رکھنا ہے۔" تاجدار بیگم کے اگلے حکم پر ملازمہ نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
شارقہ بیگم جو کہ کروشیے میں الجھی ہوئی تھیں' ان کی نظر اچانک صندل پر پڑی۔
"بھابھی! مجھے تو لگتا ہے اس کم بخت صندل پر کوئی سایہ وایہ ہو گیا ہے۔" شارقہ بیگم نے پاس بیٹھی اپنی جٹھانی کو مخاطب کیا۔
"کیوں' کیا ہوا۔۔۔؟" تاجدار بیگم نے بےساختہ ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا' سامنے بیٹھی صندل پچھلے کئی منٹوں سے ایک ہی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی' جاتی ہوئی سردیوں کی تیز دھوپ میں بیٹھنا کوئی آسان کام نہیں تھا' دس منٹ میں ہی بندے کو ٹھیک ٹھاک پسینہ آجاتا' لیکن صندل تو لگتا تھا سارے ہی موسموں سے بےنیاز ہو گئی تھی۔
"جب سے نور محل سے ہو کر آئی ہے' لگتا ہے اپنی زبان بھی وہیں چھوڑ آئی ہے۔" شارقہ بیگم نے منہ بنا کر کہا۔
"اگر یہ نور محل کا کمال ہے تو میرا خیال ہے اس گھر کی ساری لڑکیوں کو دو چار مہینوں کے لیے چھوڑ آتے ہیں وہاں۔" تاجدار بیگم کے جلے کٹے انداز پر اناتبیہ کو ایک دم ہنسی آگئی۔
"یہ تمہارے کیوں دانت نکل رہے ہیں۔۔۔؟" شارقہ بیگم نے اپنی بڑی صاحبزادی کو آڑے ہاتھوں لیا۔
"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔" وہ ہلکا سا ہکلا کر سنجیدہ ہوئی۔
"ادھر آؤ رشیدہ۔" تاجدار بیگم نے اندر جاتی صندل کی ماں کو پکارا۔
"جی بی بی جی۔۔۔"

"یہ مسئلہ کیا ہے تمہاری بیٹی کے ساتھ 'ایسی صُمٌ بُکمٌ کیوں ہو گئی ہے؟" انہوں نے اس دفعہ قدرے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں بی بی جی 'آپ کے سامنے ہی تو واپس آئی ہے نور محل سے تب ہی سے یہی حالت ہے اس کی۔" صندل کی ماں نے گڑبڑا کر اپنی صفائی پیش کی 'جو کہ باہر آتے برہان نے بڑی توجہ سے سنی تھی۔

"میرا تو خیال ہے 'اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں۔"

برہان کے سنجیدہ انداز پر انابیہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ اس نے تھوڑا سا چہرہ موڑ کر کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ سیاہ پینٹ کے ساتھ براؤن رنگ کی شرٹ میں وہ کافی جاذب نظر لگ رہا تھا۔ سیاہ گھنی مونچھوں کے نیچے موجود لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی 'اس نے شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کیوں اس شخص کو دیکھ کر انابیہ کا سارا وجود مجسم سماعت بن جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے پوری دنیا ایک نقطے میں سمٹ گئی ہو۔

وہ محبت کے نہ جانے کس مقام پر تھی 'جہاں اسے 'اس شخص کی ہر بات 'کسی خوب صورت ادا کی صورت بھاتی تھی۔

"کس کے پاس لے کر جاؤں صاحب جی؟" رشیدہ کی سمجھ میں سائیکاٹرسٹ کا لفظ نہیں آیا۔

"ڈاکٹر کے پاس۔" انابیہ کی زبان پھسلی اور برہان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارا رزلٹ آگیا ہے گریجویشن کا 'اچھی پرسنٹیج بنی ہے 'مبارک ہو۔"

برہان کے منہ سے نکلنے والی اس خلاف توقع بات نے انابیہ کے دل کا موسم ایک دم ہی دلکش کر دیا 'اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح مبارک باد بھی دے سکتے ہیں۔

"تمہیں آج پتا چلا ہے 'رزلٹ آئے ہوئے تو تین دن ہو گئے۔" تاجدار بیگم نے اپنے بیٹے کی کلاس لی۔

"پتا تو تھا 'لیکن ذہن سے نکل گیا تھا۔۔۔" ایک دم خجالت کا شکار ہوئے۔ "ویسے اب کیا سوچا ہے تم نے؟" انہوں نے فوراً ہی بات کا رخ بدلا۔

"پراسپیکٹس چاہیے تھا یونیورسٹی کا۔۔۔" انابیہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"ایڈمیشن لینا ہے کیا۔۔۔؟" وہ خوش گوار حیرت میں گھر کر بولے۔

"کیا ضرورت ہے 'گھرداری سیکھو 'ساری زندگی ماں باپ کے گھر بھوڑی رہنا ہے تم نے۔" شارقہ بیگم نے اس کے ارمانوں پر اوس ڈالی۔

"چچی جان 'کم از کم ماسٹرز تو کرنا چاہیے ہر لڑکی کو 'اور آپ ایڈمیشن لینے دیں اسے۔" برہان کے دوٹوک سنجیدہ انداز پر ایک لمحے کو تو شارقہ بیگم کو بھی چپ لگ گئی اور انابیہ کے دل میں کئی کلیاں ایک ساتھ چٹکی تھیں۔

"آپ کیا کہتی ہیں امی۔۔۔؟" برہان کے سوالیہ انداز پر وہ فوراً" بھانپ گئیں کہ وہ کیا چاہتا ہے 'ظاہر ہے زمانہ شناس عورت تھیں اور جانتی تھیں کہ ان کا پی ایچ ڈی بیٹا 'اپنی بیوی کی صرف گریجویشن کی ڈگری پر کہاں سمجھوتا کر سکتا ہے۔

"ہاں ہاں لا دو تم اسے داخلہ فارم 'اچھا ہے تمہارے ساتھ آئے جائے گی۔" تاجدار بیگم کی بات پر برہان کے چھکے چھوٹے۔

"کیا مطلب؟ میرے ساتھ کیوں؟" وہ ہلکا سا سنبھل کر گویا ہوئے۔

"ظاہری بات ہے 'جس یونیورسٹی میں تم پڑھاتے 'وہیں جائے گی ناں یہ۔۔۔" وہ لاپروائی سے سر جھٹک کر

بولیں۔

"جس نے ایڈمیشن لینا ہے اس سے تو پوچھ لیں۔" وہ ہلکی سی کوفت کا شکار ہوا۔

"ہاں ہاں بتاؤ انابیہ..." تاجدار بیگم بیٹھے بیٹھے سارے معاملات نبٹا لینا چاہتی تھیں۔

"جیسا آپ کہیں بڑی امی۔"

"کس سبجیکٹ میں لینا ہے ایڈمیشن...؟" اس دفعہ سوال ان کی طرف سے آیا تھا۔

"اکنامکس میں..." انابیہ نے سر جھکائے آہستہ سے جواب دیا۔

"پڑھ لوگی...؟" وہ تھوڑا تذبذب کا شکار ہوئے۔

"کیوں نہیں پڑھ سکتی..." انابیہ کے پراعتماد انداز پر وہ ہلکا سا گڑبڑائے۔ اس سے جوابی شکوے کی کہاں امید تھی۔

"اٹس اوکے' پراسپیکٹس لا دوں گا۔" انہوں نے اپنی طرف سے بات ختم کی اور تاجدار بیگم کی طرف متوجہ ہوئے۔

"فارحہ بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آپ کو بلوا رہی تھیں نور محل..."

"کیا ہوا...؟" وہ کچھ پریشان ہوئیں۔

"پتا نہیں' میں نے پوچھا نہیں ڈیٹیل سے' آپ خود بات کر لیجیے گا۔"

"اچھا' اچھا کر لوں گی' اللہ جانے کون سا آسیب بستا ہے نور محل میں' جو جاتا ہے' بیمار ہی رہتا ہے۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھیں اور ایک گہری نظر سامنے کیاری کے پاس بیٹھی صندل پر ڈالی' جو ابھی تک گم صم حالت میں تھی۔

"انابیہ بیٹا' دیکھو اسے' کہیں سکتہ تو نہیں ہو گیا بے وقوف کو..." انابیہ نے دہل کر ان کی نظروں کے تعاقب میں صندل کی طرف دیکھا۔

"میرا تو خیال ہے اسے لے چلیں کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس۔" برہان کا لہجہ بھی ہمدردی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"خود ہی لے جانا اور کس کے پاس ٹائم ہے یہاں۔" تاجدار بیگم کی پریشانی محسوس کر کے برہان نے فوراً سنجیدگی سے سر ہلا دیا' وہ جانتا تھا کہ تاجدار بیگم اس گھر کے ملازمین پر جتنی سختی کرتی تھیں' اس سے زیادہ ان کے دکھ یا پریشانی میں ان کا ساتھ دیتی تھیں۔

"کب چلنا ہے صاحب جی۔" صندل کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آج ٹائم لیتا ہوں ڈاکٹر سے' کل یا پرسوں لے چلیں گے۔"

وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جب کہ انابیہ کے دل کی دنیا ایک دم ہی رنگین ہو گئی تھی' وہ خیالوں ہی خیالوں میں خود کو برہان کے ساتھ کیمپس میں گھومتے پھرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے خوش ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ برہان نے اس معاملے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
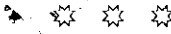
"دماغ خراب ہو گیا ہے اس چیف کنزرویٹو کا..."

محمد ہادی' اپنے دوست سعد کے ساتھ انتہائی غصے میں آفس میں داخل ہوا' اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل بیزاری سے میز پر پٹخی اور تپے تپے انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا' اس کا ماتھا شکنوں سے پُر تھا۔ وہ سعد کے ساتھ میٹنگ اٹینڈ کر کے ابھی ابھی لوٹا تھا۔

"اور اس خبیث ڈی ایف او کو دیکھا تھا۔" سعد نے منہ بنا کر اپنے باس کی بات یاد دلائی۔ "کمینہ بات تو ایسے کر رہا تھا جیسے ہم نے خود ساری لکڑی کاٹ کر پکڑائی ہو اس ٹمبر مافیا کو۔"

"دو نمبر انسان کو ساری دنیا دو نمبر ہی لگتی ہے۔" محمد ہادی نے بیزاری سے سر جھٹکا۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" سعد نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"مجھے پتا تھا یہ میٹنگ بس ہم لوگوں کو ذلیل کرنے کے لیے رکھی گئی ہے۔" ہادی غصے سے ٹہلنے لگا۔

"الو کا پٹھا کہہ رہا تھا گزشتہ دو دہائیوں سے محکمہ جنگلات میں کوئی ایسا آفیسر نہیں آیا جس نے جنگلات کی ترقی یا اس کو بچانے کے لیے کوئی قابل فخر کارنامہ سرانجام دیا ہو۔" سعد نے بھی بھڑاس نکالی۔

"جب چیف کنزرویٹو سے لے کر ڈی ایف او رینج آفیسر بلاک آفیسر اور فارسٹ گارڈ تک حرام کا مال بحفاظت اوپر تک پہنچائیں گے وہاں ہرے بھرے جنگلات چٹیل میدانوں کا روپ نہیں دھاریں گے تو اور کیا کریں گے۔" ہادی کی زبان سے گویا انگارے جھڑ رہے تھے۔

"ویسے آپس کی بات ہے جنگلات کے فروغ کے لیے جتنی بھی اسکیمیں گزشتہ کئی سالوں میں شروع ہوئی ہیں ان میں سے کوئی بھی آج تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی۔" سعد نے سائیڈ میز پر رکھی الیکٹرک کیٹل جلائی اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ چائے کی شدید طلب جاگی تھی۔

"ان اسکیموں نے افسران کی دولت میں تو خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور لاکھوں روپے کی ریکوریاں خوامخواہ بیچارے فارسٹ گارڈز اور فارسٹرز وغیرہ پر ڈالی جا رہی ہیں۔" ہادی کے اکتائے ہوئے انداز پر سعد تیزی سے اٹھا اور آفس کا دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔

"ابے آہستہ بول کیوں مروائے گا۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی جھنجلاہٹ ابھری۔

"تو میں کون سا ڈر تا ہوں کسی سے یہ فضول میٹنگ کرنے کے بجائے یہ گھٹیا لوگ کسی غیر جانبدار اور ذمہ دار اتھارٹی سے انویسٹی گیشن کیوں نہیں کرواتے۔ ہمیں کیوں اپنی تھرڈ کلاس باتیں سنانے کے لیے بلا لیتے ہیں۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

"انویسٹی گیشن کون کروائے گا یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں میرے پیارے دوست۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے خشک دودھ قہوے میں ملانا شروع کیا۔

"دل تو کرتا ہے ایک رپورٹ بنا کر میں ہی بھجوا دوں اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ میں۔" اس کی بات پر سعد کو کرنٹ لگا۔

"اوئے بیٹا بریک پر پیر رکھ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔" وہ تڑپ کر بولا۔

"مرنا تو تم نے ویسے بھی ہے اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں سے بچے گا تو ٹمبر مافیا اڑا دے گا تجھے یاد نہیں وہ شاہد رضوی ان ہی جنگلات سے ملی تھی ناں اس کی لاش جس کو ایمان داری کے دورے پڑتے تھے۔" ہادی کی بات پر سعد بے چین ہوا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں آج۔" وہ خوفزدہ ہوا۔

"صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اس خبیث کی باتوں نے دماغ گھما کر رکھ دیا ہے آج میرا۔" وہ بیزاری سے ریوالونگ چیئر گھمانے لگا۔

"میری تو کل والے کیس نے نیندیں اڑا رکھی ہیں ہم جرأت دیکھو خاقان علی کے بندوں کی اتنی قیمتی لکڑی دن دیہاڑے اسمگل کر رہے تھے مری سے۔" سعد کے پریشان لہجے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بھی دوڑ گئی۔

"میر خاقان کے خاندان کو عادت پڑ گئی ہے حرام کھانے کی۔" وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوا۔

ایک دن پہلے ہی پنجاب پولیس نے ایک گاڑی کو پکڑا تھا' جس کے ذریعے عمارتی لکڑی کو پنڈی منتقل کیا جارہا تھا اور جس شخص کی زمینوں سے اسے چرایا گیا تھا' اس کی شکایت پر پولیس پہلے سے الرٹ تھی' یہی وجہ تھی کہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔

"تم نے مخالف پارٹی کو کیس کرنے کا مشورہ دے کر اچھا نہیں کیا۔۔۔" سعد نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"اچھا ہے یار! کوئی تو ہو جو میر فیملی کو بھی لگام ڈالے' ان کی غنڈہ گردی بڑھتی ہی جارہی ہے دن بہ دن میں نے تو ماما کی فرم میں بھجوا دیا ہے ان لوگوں کو' یقیناً" کوئی اچھا وکیل ناکوں چنے چبوائے گا ان لوگوں کو۔۔۔" ہادی اچھا خاصا مطمئن تھا۔

"میری مانو' مٹی ڈالو اس قصے پر جن کا نقصان ہوا ہے' وہ جانیں اور میر خاقان جانے۔" سعد دل ہی دل میں ڈرا ہوا تھا۔

"سوری یار' یہ کیس ڈائریکٹ آیا تھا میرے پاس اور اس شخص کا ایریا بھی میرے ہی انڈر میں آتا ہے' اس لیے میں تو کسی کو پیچھے ہٹ جانے کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔" ہادی چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر کھڑا ہوا۔

"کدھر کے ارادے ہیں اب۔۔۔؟" سعد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر چلو' ذہن کچھ ڈسٹرب سا ہے آج' جا کر تھوڑا ریسٹ کرتے ہیں۔" ہادی نے میز پر رکھا اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں ڈالا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم' آج کا دن ہی منحوس تھا۔" وہ بھی میز پر رکھا اپنا سیل فون اٹھا کر کھڑا ہوا۔

"میں تو گھر جاتے ہی شاور لوں گا اور لمبی تان کر سو جاؤں گا۔" ہادی نے اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے گاڑی میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ ہادی نے تھکے تھکے انداز میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور سعد نے میوزک چلا کر کے خود کو تھوڑا تروتازہ کرنے کی کوشش کی اور جیسے ہی گاڑی میر ہاؤس کے پاس پہنچی' سامنے کھڑے ارسل نے انہیں دیکھ کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔

"مارے گئے۔۔۔" سعد نے بے اختیار بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"کیا مصیبت ہے یار۔۔۔" ہادی زیر لب بڑبڑایا' اس وقت وہ کسی بھی قسم کی مروّت کا مظاہرہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"تم آج کل ہوتے کہاں ہو' شام کی واک تک چھوڑ رکھی ہے' یقین مانو تمہارے بغیر بالکل مزا نہیں آتا۔" ارسل بڑی بے تکلفی سعد کی طرف کے شیشے پر جھکا اس کی کلاس لے رہا تھا۔

"بس یار' آج کل کام کا کافی پریشر ہے' ایک دفعہ گھر آکر دوبارہ نکلنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔" سعد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو' آج تھوڑی سی ہمت تو کرنی پڑے گی۔" وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

"مطلب۔۔۔؟" وہ دونوں ہی نہیں سمجھے تھے۔

"گھر میں بڑے مزے کے چائنیز سموسے اور رول بنے ہیں' اس لیے آج تو چائے پیے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" ارسل نے بے تکلفی سے اس کی طرف کا گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہادی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"نہیں یار' پھر سہی۔۔۔" سعد نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"آج تو بالکل نہیں سنوں گا' فوراً" نکلیں آپ لوگ۔۔۔"

ارسل ان دونوں کے باربار منع کرنے کے باوجود زبردستی انہیں میرہاؤس کے اندر لے آیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں میرہاؤس کے شان دار سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔
کمرے کا فرنیچر خاصی قیمتی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور درمیان میں ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں طرف کی دیوار پر اس گھر کے مکینوں کے آباؤ اجداد کی تصویریں بڑے قیمتی اور نازک فریموں میں آویزاں تھیں۔ ڈرائنگ روم کی بائیں دیوار پر صادقین کی ایک خوب صورت پینٹنگ اور کارنر ریک میں کرسٹل اور ہاتھی دانت کی بنی نازک اشیا رکھی ہوئی تھیں۔
"تم مانو یا نہ مانو' یہ سارا فرنیچر' چوری کی لکڑی کا بنا ہوا لگ رہا ہے مجھے۔" ارسل جیسے ہی اندر چائے کا کہنے کے لیے گیا' ہادی نے نسبتاً" ہلکی آواز میں بے لاگ تبصرہ کیا' جسے سن کر سعد نے دہل کر دروازے کی طرف دیکھا۔
"آہستہ بکواس کرو' کسی نے سن لیا' تو یہیں پھانسی گھاٹ بنا دے گا ہمارا۔"
"ہاں' ان کے باپ کا راج ہے ناں..." ہادی نے طنزیہ انداز میں سر جھٹکا۔
"باپ کا نہ سہی' دادا کے پاس تو اچھی خاصی منسٹری ہے' اس لیے زبان دانتوں کے نیچے ہی رکھو۔" سعد نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔
اسی وقت دروازہ دھڑ کر کے کھلا اور دُرِّ شہوار' اپنی کزن انابیہ کے ساتھ منہ بناتی ہوئی اندر داخل ہوئی' اس نے ہاتھ میں نوٹس اٹھا رکھے تھے اور وہ ڈرائنگ روم کے بالکل ساتھ بنے ڈائننگ روم والے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی' درمیان میں ویلوٹ کا پردہ تھا۔ اس لیے وہ دونوں سعد اور ہادی کی موجودگی سے بے خبر تھیں' در شہوار نے ہاتھ میں پکڑے نوٹس لا کر ڈائننگ ٹیبل پر پٹخے۔
"ایک تو اس گھر میں کوئی سکون کی جگہ بھی نہیں ہے' جہاں بیٹھ کر انسان ڈھنگ سے دو چار رٹے ہی لگا سکے۔"
"تو کس نے کہا تھا فیل ہونے کو' پہلی دفعہ ہی نکل جانا تھا محنت کر کے..." انابیہ ہنسی۔

"ویسے بیا! آپ سے توقع نہیں تھی مجھے' اس گھٹیا بات کی' پہلے کیا اس گھر کی خواتین کم تھیں' جو آپ بھی اتر آئی ہیں میدان میں' طعنے دینے کے لیے۔" وہ ٹھیک ٹھاک برا مان گئی۔
"نہیں' نہیں میں کیوں طعنہ دوں گی بھلا' اچھی طرح جانتی ہوں' علم کی تلاش میں تو تم جنگلوں کی خاک تک چھان آئی ہو اور آوارہ کتے تک پیچھے لگوا لیتی ہو' پیر تک زخمی کروا لیتی ہو..." انابیہ کا موڈ خاصا اچھا تھا اس لیے وہ ایک دفعہ پھر شرارت کر گئی۔
"خدا کا نام لیں بیا' کیوں وہ خوفناک واقعہ یاد کرواتی ہیں' وہ سڑیل ہمسایہ نہ ہوتا وہاں تو قسم اللہ پاک کی' مزار بن چکا ہوتا میرا یہیں کہیں' اوپر سے میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی' پتا ہے ناں کتنا شوق ہے مجھے شادی کا۔"
در شہوار کی بات پر ہادی نے بیزاری سے پہلو بدلا اور سعد نے بمشکل اپنے قہقہے کو حلق میں دبایا۔
"شرم کرو' ایک تو اس نے تمہاری جان بچائی اور اوپر سے تم اس بے چارے کو سڑیل کہہ رہی ہو۔"
"بھئی فرض بنتا تھا اس کا' آخر کو ہمسائی ہوں میں اس کی اور پتا ہے ناں' اسلام میں ہمسایوں کے کتنے حقوق ہیں۔" در شہوار کو باتوں میں ہرانا کون سا آسان کام تھا لیکن برا ہو ارسل کا' جو ایکدم ہی کمرے میں آیا تھا۔
"ارسل کے بچے' کہاں غائب ہو تم صبح سے..." وہ بے تکلف انداز سے گویا ہوئی۔
"آہستہ بولو' ڈرائنگ روم میں گیسٹ بیٹھے ہوئے ہیں۔" ارسل کی دبی دبی سی جھنجلائی ہوئی آواز پر دُرِّ شہوار اور انابیہ کا سانس حلق میں اٹک گیا۔
"اوہ مائی گاڈ' کون آیا ہے۔" اس کی سرگوشی بھی پردے کے دوسری طرف سعد اور ہادی کی سماعتوں تک آسانی سے پہنچی تھی۔

"سعد اور ہادی' جو پڑوس میں رہتے ہیں۔۔۔" ارسل کی اطلاع پر در شہوار کا رنگ فق ہوا۔
"کوئی شکایت لے کر آئے ہیں کیا۔۔۔؟" در شہوار کی زبان پھسلی اور اگلے ہی لمحے اس نے دانتوں تلے دبالی۔
"کیسی شکایت۔۔۔؟" ارسل مشکوک ہوا۔
"ان کے لان سے خوبانیاں توڑ کر کھائی تھیں ناں' اور پکڑی بھی گئی تھیں یہ سب۔" انابیہ نے بات سنبھالی۔
"کبھی انسانوں والے کام بھی کر لیا کرو' کیا سوچتا ہو گا وہ۔۔۔" وہ خفا ہوا۔
"سوچنے دو' وہ کون سا منسٹر لگا ہوا ہے ہمارے اوپر۔۔۔" در شہوار نے ناک چڑھائی۔
"فضول باتیں مت کریں آپ لوگ' اور نکلیں یہاں سے' بیا' چائے کی ٹرالی اچھی طرح سیٹ کر کے بھجوایئے گا۔" ارسل جھنجلایا۔
"اچھا اچھا' تم جاؤ' بھجوادیتے ہیں چائے وائے۔" انابیہ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔
ارسل نے بیزاری سے سرہلایا اور ہلکا سا گلا کھنکھار کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ سعد اور ہادی دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ در شہوار کی گفتگو نے ہادی کا موڈ تھوڑا سا خراب کر دیا تھا اور رہی سہی کسر اندر سے آنے والی چائے نے پوری کر دی تھی۔
چائے کی ٹرالی لے کر صندل کا چودہ سالہ بھائی آیا تھا' جس نے در شہوار کی خاص ہدایت پر ایک طرف رکھا چائے کا کپ ہادی کی طرف بڑھایا تھا' جس کا پہلا گھونٹ لیتے ہی ہادی کا دل چاہا کہ وہ کہیں جا کر الٹی کر آئے' چائے میں بے تحاشا نمک نے طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا' ہادی نے کن انکھیوں سے سعد کی طرف دیکھا' جو بڑے مزے سے چائے پی رہا تھا۔ ہادی سمجھ گیا تھا وہ ایک دفعہ پھر ان کی تخریبی کارروائی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس نے وہ کپ جس طرح سے ختم کیا' وہ جانتا تھا یا اس کا دل' یہی وجہ تھی کہ جب وہ سعد کے ساتھ گھر لوٹا تو حلق تک بدمزا ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس سعد کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"مزا آگیا یار' چائنیز سموسے تو کمال کے تھے۔" سعد نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے باقاعدہ چٹخارہ لیا۔
"اور چائے۔۔۔؟" ہادی نے انجان بن کر پوچھا۔
"اچھی بنی ہوئی تھی' سبز الائچی والی۔۔۔" وہ سادگی سے مسکرایا۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
"اس لیے کہ میری بھی اچھی بنی ہوئی تھی لیکن سفید نمک والی۔۔۔" ہادی کے لہجے میں ناگواری در آئی۔
"کیا مطلب۔۔۔؟" سعد حیران ہوا۔
"مطلب یہ کہ میں ایک دفعہ پھر ان کی غنڈہ گردی کا شکار ہو گیا۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔
"او مائی گاڈ۔۔۔!" سعد اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ اسے در شہوار گینگ کی یہ حرکت مزے کی لگی تھی۔ جب کہ ہادی اسے غصے سے گھورتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

✡ ✡ ✡

"او مائی گاڈ۔۔۔!" طوبیٰ کا منہ حیرانی کے اظہار کے طور پر کھلا۔
"تم نے ہادی کے ساتھ یہ بدتمیزی کی' شرم نہیں آئی تمہیں۔" طوبیٰ کو سارا قصہ سنتے ہی غصہ آگیا۔
"نہیں۔۔۔" اس نے چکن رول پر ڈھیر سارا کیچپ ڈالا اور مزے سے کھانے لگی۔
"بہت ہی احسان فراموش ہو تم' افسوس ہوا تمہارے اس گھٹیا پن پر۔۔۔" طوبیٰ نے اسے لتاڑا۔
"تھینک یو۔۔۔" اس نے ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑے۔
"اور اگر امجد کا بچہ وہی پیالی' ارسل بھائی کو دے دیتا تو۔۔۔؟" طوبیٰ نے اسے ڈرایا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ بچہ صندل کا بھائی ہے' اسی گھر میں ہماری چالاکیاں اور مکاریاں دیکھ دیکھ کر تو جوان ہوا ہے' اوپر سے پورے پانچ سو کا کڑکتا نوٹ دیا تھا اسے رشوت میں' کام تو پکا ہونا ہی تھا۔" درشہوار نے تفصیل سے اپنا کارنامہ بتایا۔

"کیا سوچتا ہوگا وہ....؟" وہ تاسف کا شکار ہوئی۔

"یہی سوچتا ہوگا لڑکی "دلیر" اور "بہادر" ہے....." وہ ایک آنکھ کا کونا دبا کر شرارت سے ہنسی اور مزید گویا ہوئی۔

"قسم سے کیا کروں' اسے دیکھ کر میری زبان اور ہاتھ پیروں میں کوئی نہ کوئی کھجلی ہونے لگتی ہے۔" درشہوار نے انگلی پر کیچپ لگا کر مزے سے چاٹا۔

"سچ سچ بتاؤ' تمہیں مسئلہ کیا ہے اس سے....؟" طوبیٰ کمر پر ہاتھ رکھ کر عین اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"کیا کہوں ہائے' کچھ کچھ ہوتا ہے۔" اس نے ایک ہوش ربا انگڑائی لے کر طوبیٰ کو اپنی طرف سے مکمل مشکوک کیا۔ وہ دونوں اس وقت درشہوار کے کمرے میں موجود تھیں اور صبح ان کا کیمسٹری کا پرچہ تھا۔

"انسان بن جاؤ تم....."

"اب تو بس دلہن بننے کو دل چاہتا ہے....." وہ شرارتی لہجے میں ہنسی تو طوبیٰ نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی محبت وحبت کا سین تو آن نہیں کرلیا تم نے....." وہ اس طرح جھک کر درشہوار کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے دل کا راز بھانپ لینا چاہتی ہو۔

"جانِ من! جو کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

درشہوار نے لہک لہک کر شرارت سے شعر پڑھا' اور اس سے اس کی آنکھوں میں کچھ تھا' طوبیٰ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی' اس نے اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو گھما کر درشہوار کا چہرہ اپنی جانب کیا اور جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ایکسرے مشین فٹ کروائی ہے اپنی آنکھوں میں....." درشہوار نے ہلکا سا گھبرا کر اپنی نظریں چرائیں اور وہیں.... رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔

"اٹس ناٹ فیئر....." طوبیٰ ہلکا سا خوف زدہ ہوئی۔ وہ اس کے دل کا راز جان چکی تھی۔

"کیوں....؟" اس کی آنکھوں میں بغاوت کا رنگ ابھرا۔

"ہمارے خاندان میں ایسی محبتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے درشہوار۔" طوبیٰ نے اس کے جذبات پر بند باندھنا چاہا۔

"گنجائش نکالی بھی تو جاسکتی ہے۔"

"درشہوار ہوش کے ناخن لو' یہ ناممکنات میں سے ہے....." یارے گھبراہٹ کے وہ بے ربط بولی۔

"دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔" سامنے بھی درشہوار تھی' ہر چیز کو چٹکیوں میں اڑانے والی۔

"داجی' تایا ابا' بلکہ کوئی بھی نہیں مانے گا۔" اس کے پریشان انداز پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ درشہوار کے چہرے پر ابھری۔

"تمہیں پتا ہے ناں' اپنی ضد کی تو غلام ہوں میں' اس گھر کے مردوں سے ایک ہی چیز تو وافر مقدار میں لی ہے میں نے' جو دل چاہے' وہ کرو' چاہے اس کے لیے کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔" اس کا لہجہ پراسرار ہوا۔

"ہوسکتا ہے' ہادی کسی اور سے....." طوبیٰ کا باقی فقرہ ابھی منہ میں ہی تھا' اس نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"جہاں درشہوار آجائے' وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں رہتی' یہ بات تو سارا خاندان جانتا ہے ہمارا۔" اس کی خود پسندی طوبیٰ کو خوف زدہ کر گئی۔

"لیکن وہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہے۔"

"تو بن جائے گا' آخر کو تین بول پڑھنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔" وہ خوش فہمی کی آخری سیڑھی پر تھی۔

"فی الحال تو تم اس کیمسٹری کی کتاب کا رٹا لگاؤ' اس ٹاپک پر پھر بات کریں گے۔" طوبیٰ نے پریشانی سے موضوع تبدیل کیا' لیکن اس کے دل میں اندیشوں کی کئی کونپلیں ایک ساتھ پھوٹ چکی تھیں۔ وہ آنے والے وقت سے ابھی سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"بھئی تم نے رٹے لگانے ہیں' شوق سے لگاؤ' مابدولت تو سوفٹ سا میوزک سنیں گے۔" درشہوار نے اٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے اس کا والیوم فل کیا۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ تم گھنا سایہ
آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا

جگجیت کی خوب صورت آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی' درشہوار نے اٹھ کر ہادی کے کمرے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی اور پردہ پیچھے کیا' اس کے چہرے پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ تھی' طوبیٰ کو اپنا دل مزید ڈوبتا محسوس ہوا۔

☆ ☆ ☆

رومیصہ کے کمرے میں تاریکیوں کا بسیرا تھا ——— تیرگی اس کے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس شکنجے میں پھنس چکی تھی' جس سے نکلنے کا اسے فی الحال کوئی بھی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹینا بیگم اور شہزاد کی خصوصی تلقین کی وجہ سے اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ ویسے بھی راحیل محمود کیس کا پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں اتنا چرچا تھا کہ وہ باہر جانے کا رسک لے ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میڈیا کے نمائندے اسے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتے نظر آتے تھے' اسی وجہ سے ٹینا بیگم نے پرائیوٹ سیکورٹی کمپنی کے دو گارڈز بھی رکھ لیے تھے۔

وہ منہ پر کشن رکھے آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی تھی' جب اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا' اس نے ڈرتے ڈرتے سیل فون کی اسکرین پر دیکھا' سامنے "کنزہ کالنگ" کے الفاظ ابھر رہے تھے۔

"ہیلو۔" اس نے جیسے ہی کنزہ کی آواز سنی' آنسوؤں کا ایک گولا اس کے گلے میں امنڈ آیا۔

"آئی ایم سوری رومی۔" دوسری طرف اس کا لہجہ شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"سوری فار واٹ۔؟" وہ بے رخی سے گویا ہوئی۔

"پلیز رومی' اس طرح بات مت کرو مجھ سے۔" دوسری طرف کنزہ بھی رندھی ہوئی آواز میں بولی' شاید اس حادثے نے اس کو بھی ذہنی طور پر کافی زیادہ ڈسٹرب کر رکھا تھا۔ اس کی صدمے سے چور آواز سن کر رومیصہ کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ' دوست ایسے ہوتے ہیں بھلا۔" اپنی بے بسی کے احساس سے رومیصہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

”میں بہت شرمندہ ہوں تم سے....“ کنزہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کنزہ‘ گاڑی میں نہیں ہم ڈرائیو کر رہی تھیں‘ پھر تم نے اس بات سے انکار کیوں کیا۔“ رومی کی حالت پھانسی گھاٹ پر پہنچنے والے اس قیدی کی سی تھی۔ جو کسی اور کے کیے کی سزا بھگتنے جا رہا ہو اور دوسروں کو چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہتا ہو۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو رومی! لیکن ٹرسٹ می‘ میں نے جان بوجھ کر ہٹ نہیں کیا تھا روحیل کو‘ خود گاڑی سے ٹکرایا تھا وہ‘ یہ بات تو تم بھی بہت اچھی طرح جانتی ہو۔“ اس نے بوکھلا کر صفائی دی۔

”میں جانتی ہوں کنزہ! لیکن دنیا کو نہیں معلوم اور تمہارے فادر تو جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

”ہزار دفعہ بتا چکی ہوں انہیں لیکن....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

”لیکن وہ جانتے ہیں روحیل کی فیملی کو ہینڈل کرنا اتنا ایزی نہیں ہوگا‘ اس لیے انہوں نے تمہیں اپنا بیان بدلنے پر مجبور کر دیا‘ ہے ناں۔“ رومیصہ نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

”میں کیا کروں‘ تم بتاؤ مجھے....؟“ رومیصہ کو وہ اس لمحے بہت بے بس لگی۔

”مجھے تو خود نہیں معلوم‘ کیونکہ تمہاری اس بزدلی نے میری لائف کو مشکل میں ڈال دیا ہے کنزہ! اور مجھے اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا‘ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا‘ روحیل کی فیملی تو نہیں چھوڑے گی مجھے۔“ وہ آزردگی سے گویا ہوئی۔

”میرے پاس کچھ ایسے پوائنٹس ہیں‘ اگر تمہاری فیملی ان پر کام کرے تو یہ کیس تمہارے حق میں ہو سکتا ہے۔“ کنزہ کی بات پر اس کا دل بے اختیار دھڑکا اور اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”کیسے پوائنٹس....؟“

”اسی سلسلے میں تم سے ملنا چاہتی ہوں میں‘ کیا تم ”ہارڈیز“ پر آ سکتی ہو....؟“ کنزہ نے اس کے سیکٹر میں واقع ایک ریسٹورنٹ کا نام لیا۔

”نہیں‘ تم گھر آ جاؤ میرے۔“ اس نے فوراً انکار کیا۔

”یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے‘ ڈیڈی کو پتا چل گیا تو شوٹ کر دیں گے مجھے۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”لیکن‘ میں کیسے آ سکتی ہوں کنزہ! میرے لیے حالات زیادہ مشکل ہیں۔“

”پلیز تم کوشش کر کے دیکھو‘ ان شاء اللہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہوگا‘ ورنہ بعد میں پچھتاتی رہو گی‘ کیونکہ روحیل کی فیملی‘ کسی صورت بھی کوئی کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں ہے۔“ کنزہ نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔

”لیکن....؟“ وہ شش و پنج کا شکار ہوئی۔

”پلیز رومی! یہ لیکن ویکن چھوڑو‘ فوراً آ جاؤ‘ ٹرسٹ می‘ کوئی نہ کوئی سلوشن نکل آئے گا۔“

”ٹھیک ہے‘ میں ماما سے پوچھ کر بتاتی ہوں تمہیں۔“ رومی کی اس بات پر کنزہ ایک دم بوکھلائی۔

”فار گاڈ سیک رومی‘ آنٹی تمہیں کبھی بھی مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں دیں گی‘ کبھی تو عقل کا استعمال کر لیا کرو۔“ اس کے بری طرح جھنجلانے پر رومیصہ ہلکی سی خفت کا شکار ہوئی۔

”اوکے‘ کب آنا ہے....؟“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

”میں گھر سے نکل رہی ہوں‘ بس دس منٹ میں وہیں ہوں گی۔“ کنزہ نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔

”اوکے.... آئی ایم کمنگ....“ رومیصہ نے جلدی سے سیل فون بند کیا۔

وہ سستی سے ڈریسنگ کے شیشے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کئی دن پرانی جینز کے ساتھ اس نے بے بی پنک کلر

کی ملگجی سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی' بالوں میں جلدی جلدی برش کر کے اس نے ایک اونچی سی پونی بنا کر ربربینڈ لگایا اور اپنا سیل فون اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ اس وقت ٹینا بیگم اور شہزاد دونوں ہی گھر میں نہیں تھیں۔ اس لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

''آخر ایسے کون سے ثبوت ہیں' جو کنزہ اسے دینا چاہتی ہے۔'' مختلف سوچوں میں غلطاں وہ جلدی سے لاؤنج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی' اس کے دماغ میں مختلف سوچیں اودھم مچا رہی تھیں۔

جیسے ہی وہ لاؤنج میں پہنچی' سامنے کاؤچ پر ہارون رضا' گھٹنوں تک آتی بلیک شارٹس کے ساتھ وائٹ ٹی شرٹ پہنے' انتہائی بے ہودہ انداز میں نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر ہارون نے ہاتھ میں پکڑے لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا' رومیصہ نے سرد مہری سے ان کی طرف دیکھا' جو بڑی وارفتہ نظروں سے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہے تھے۔

''ویلکم سویٹ ہارٹ۔۔۔'' وہ تھوڑا قریب ہوئے' ان کے لباس سے اٹھتی قیمتی کولون کی مسحور کن مہک کو محسوس کر کے وہ خوفزدہ انداز سے دو قدم پیچھے ہٹی ان کی بے باک نظروں سے اسے گھن سی محسوس ہوئی۔

''ڈارلنگ' کہاں اڑان بھرنے کے ارادے ہیں۔'' ان کے ہونٹوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ تھی۔

''آپ سے مطلب؟'' رومیصہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا' اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔ روحیل محمود والے واقعے نے اس کا سارا اعتماد ختم کر دیا تھا۔

''کبھی کوئی بات خود بھی سمجھ لیا کرو سویٹی۔۔۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر سگار کا سارا دھواں بدتمیزی سے اس کے چہرے پر چھوڑا۔

''شٹ اپ۔۔۔'' اس کی آواز میں لرزش محسوس کر کے ہارون کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

''وہ دن یاد ہے ناں تمہیں جب۔۔۔'' ہارون نے فقرہ ادھورا چھوڑا' لیکن وہ اس ان کہے فقرے کا پورا مطلب جانتی تھی' رومیصہ کا دل ڈوبنے لگا۔ ہارون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ رومی کے شانے پر رکھا' رومیصہ کو لگا جیسے کسی نے سلگتا ہوا کوئلہ اس کے کندھے پر رکھ دیا ہو۔

''شرم آنی چاہیے آپ کو۔۔۔'' وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

''اس خوفزدہ ہرنی کی مانند لگ رہی ہو' جو پورے جنگل میں ظالم شکاری سے اپنی جان بچاتی بھاگتی پھر رہی ہو' لیکن تم جانتی ہو' میں اتنا بھی ظالم نہیں' ہے ناں۔۔۔'' انہوں نے بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

''پیچھے ہٹیں' میرے راستے سے۔۔۔'' اس نے بدقت اپنے اشکوں کو قابو کیا۔

''اور اگر نہ ہٹوں تو۔۔۔؟'' انہوں نے اس کی بے بسی سے حظ اٹھاتے ہوئے رومی کے بالوں کی جھولتی لٹ کو اپنی انگلی میں لپیٹنے کی کوشش کی' اور اس کے ساتھ ہی رومی کے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔ اس نے گھما کر ایک زوردار تھپڑ ہارون کے چہرے پر رسید کیا' وہ جو اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے' ہلکا سا لڑکھڑا کر رہ گئے' جبکہ رومی میزائل کے گولے کی طرح اڑتی ہوئی اپنی گاڑی تک پہنچی اور جب تک ہارون سنبھلتے' وہ گھر سے نکل کر جا چکی تھی۔

جیسے ہی وہ مین روڈ پر آئی اس کا دل بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ ہارون رضا کی اس کمینگی نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے' تبھی تو اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ جیسے ہی وہ گھر سے نکلی تھی' سیاہ رنگ کی ایک پراڈو اس کے تعاقب میں تھی۔

رومیصہ نے جیسے ہی اپنی گاڑی' سروس روڈ پر ڈالی' وہی پراڈو' بہت تیزی سے ٹیک اوور کرتی ہوئی' اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی' رومیصہ نے بڑی قوت سے بریک لگائی' ٹائروں کے چرچرانے کی آواز فضاؤں میں گونج

کر رہ گئی۔
پراڈو سے دو نوجوان لڑکے بجلی کی سی سرعت سے اُترے اور انہوں نے پستول دکھا کر رومیصہ کی گاڑی کا دروازہ کھلوایا' گھبراہٹ اس کے چہرے پر مترشح تھی۔
اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی' انہوں نے بے دردی سے اسے گھسیٹ کر اپنی گاڑی میں پھینکا اور ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر پاؤں جمائے' "آنا" "فانا" گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی گلیوں میں گم ہو گئی۔
"کک... کون لوگ ہیں آپ؟ کہاں لے کر جا رہے ہیں مجھے..." وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔
"چپ کر کے بیٹھی رہو' ورنہ گولی مار کر بھیجا خالی کر دوں گا۔" سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس نوجوان غرایا' اس کے اوسان خطا ہو گئے۔
"میں نے کیا کیا ہے...؟" رومیصہ کے اعصاب جواب دینے لگے' اسے لگا جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گی۔
"جلدی کا ہے کی ہے' ساری باتیں بتا دیں گے اور بہت اچھے ماحول میں بیٹھ کر بتائیں گے۔" اس کے پاس بیٹھے لڑکے نے عامیانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ رومیصہ کے حلق میں کانٹے اگ آئے۔
"پلیز مجھے جانے دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا..." وہ رو دی۔
"استاد! یہ تو بہت بولتی ہے..." اس کے پاس بیٹھا لڑکا بے زاری سے گویا ہوا۔
"اب بولے تو بینڈ بجا دینا اس کی یہیں سڑک پر..." اگلی سیٹ پر بیٹھا لڑکا سفاکی سے مسکرایا۔ رومیصہ نے بے دردی سے اپنے لب سی لیے۔ دہشت اور خوف نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔
اس کو چند ہی لمحوں میں سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کسی بڑی سازش کا شکار ہو چکی ہے اور اس بار بھی اسے پھنسانے والی اس کی فرینڈ کنزہ وقار ہی تھی۔ رومیصہ کو مارگلہ کی ساری پہاڑیاں اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

قریشی ایسوسی ایٹس کا پورے ملک میں ایک نام اور مقام تھا' اس لا فرم میں چوٹی کے وکیل شامل تھے۔ بیرسٹر عالیہ قریشی نے اپنا سارا سیٹ اپ ہی بہت شان دار بنا رکھا تھا۔ وہ ٹینا بیگم کی مستقل کسٹمر تھیں اور ہمیشہ ان ہی کے بیوٹی سیلون کی خدمات حاصل کرتی تھیں' اس لیے دونوں کے درمیان اچھی خاصی فرینڈ شپ تھی۔
شہزاد اپنی مام ٹینا بیگم کے ریفرنس سے وہاں پہنچی تھی' لیکن کچھ ہی دنوں میں اس نے اپنی ذہانت اور محنت سے عالیہ قریشی کی نظروں میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا اور عالیہ مختلف کیسز پر اس کی رائے کو بہت غور اور دلچسپی سے سنتی تھیں۔
اس دن موسم صبح ہی سے خاصا خراب تھا۔ رات سے ہونے والی بارش رک تو گئی تھی' لیکن وقفے وقفے سے ہونے والی بوندا باری پھر بھی جاری تھی۔ شہزاد صبح نو بجے سے اپنے لیپ ٹاپ پر کام کرنے میں مصروف تھی' وہ رومیصہ کیس کے سارے کمزور پہلوؤں پر ایک دفعہ پھر غور و فکر کرنا چاہتی تھی۔
"اوہ شٹ..." لیپ ٹاپ کی بیٹری بالکل ختم ہونے کے قریب تھی اور وہ اپنا چارجر بھی گھر بھول آئی تھی۔
اس نے جلدی جلدی اپنی مطلوبہ فائل اپنی ای میل آئی ڈی میں محفوظ کی اور ساتھ ہی لیپ ٹاپ بند کر کے مسز قریشی کے آفس میں آ کر کونے میں رکھے سسٹم پر کام کرنے لگی۔ اسے مسز قریشی کی طرف سے کھلی اجازت تھی۔ جب کہ وہ خود کسی کیس کی پیروی کے لیے کورٹ گئی ہوئی تھیں۔
"مجھے اس کلب کے مالک سے بھی ملنا چاہیے' جہاں رومی اور روحیل کا جھگڑا ہوا تھا..." وہ دل ہی دل میں اپنے کاموں کی فہرست بنانے لگی' اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی' دوسری طرف ٹینا بیگم سخت غصے میں تھیں۔

"یہ لڑکی تو مجھے پاگل کر کے ہی دم لے گی۔ ایک تو حالات اتنے خراب ہیں' اوپر سے پھر گاڑی لے کر نکل گئی ہے۔"

"آپ کو کس نے بتایا...؟" شہرزاد چونکی۔

"ہارون کی کال آئی تھی۔ اس نے منع کیا تھا باہر جانے سے' لیکن وہ کہاں سنتی ہے کسی کی' الٹا اس کے ساتھ بھی بدتمیزی کی اور خود سیر سپاٹے کے لیے نکل گئی۔" ٹینا بیگم کے بے زار لہجے پر شہرزاد ایک دم کوفت کا شکار ہوئی۔

"یہ ہارون صاحب کیوں اتنے زیادہ چکر لگا رہے ہیں آج کل گھر کے..."

"اللہ جانتا ہے' کون سی فلم چل رہی ہے اس کے دماغ میں..." وہ خود بھی اپنے میاں پر ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھیں۔

"آپ نے کال کی رومی کو...؟" شہرزاد سابقہ موضوع پر آگئی۔

"کی تھی' لیکن میڈم نے اٹینڈ نہیں کی' اللہ جانے کہاں کی خاک چھاننے گئی ہے' اب تو اس کے باہر جانے کا سن کر ہی ہول اٹھنے لگتے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ڈونٹ وری' آجائے گی' آپ ٹینشن نہ لیں..." شہرزاد نے انہیں تسلی دی۔

"اوکے' تم جلدی آجانا گھر' تھوڑا کام ہے مجھے..." ٹینا بیگم نے جیسے ہی فون بند کیا' وہ ایک دفعہ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

وہ بڑی پھرتی اور تندہی سے اپنا کام نبٹا رہی تھی۔ جب کوئی آفس کا دروازہ کھول کر بڑے عجلت بھرے انداز میں اندر داخل ہوا۔ شہرزاد نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا' سیاہ پینٹ کے ساتھ گرے رنگ کی شرٹ کی آستینوں کو کہنیوں تک موڑے' وہ ہاتھ میں ایک فائل اٹھائے مسز قریشی کی ذاتی کیبنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شہرزاد نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیبنٹ کھول کر اس میں سے فائلوں کا ایک پلندہ نکال چکا تھا اور اب بڑے غور سے ان کو ایک ایک کر کے دیکھ رہا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کمرے کے ایک کونے میں شہرزاد بھی موجود ہے۔

"ایکسکیوزمی..." شہرزاد کی بلند آواز پر وہ ایک دم اچھلا اور مڑ کر دیکھا۔

"اوہ آئم سوری' میں نے آپ کو دیکھا نہیں..." وہ بہت سلجھے ہوئے انداز میں گویا ہوا۔

"مسز قریشی' آفس میں نہیں ہیں۔ آپ کو کوئی کام ہے ان سے؟" شہرزاد نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر قدرے رکھائی سے پوچھا۔

"جی' بہت ضروری کام ہے ان سے..." وہ اس کے قریب سے گزر کر دائیں طرف والی دیوار پر بنے ریک کی طرف بڑھا' اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو نے پورے کمرے کا احاطہ کیا' وہ شاید پرفیوم کا بے دریغ استعمال کرنے کا عادی تھا۔

"کب تک آجائیں گی وہ..." وہ ایک کیبنٹ کھول کر بے تکلفی سے فائلیں نکالنے لگا جب کہ شہرزاد نے ناگواری سے اس کے بے تکلف انداز کو دیکھا۔ وہ شاید کسی خاص فائل کی تلاش میں تھا۔

"میں پرسنل اسسٹنٹ نہیں ہوں ان کی..."

"جانتا ہوں میں..." بڑی سادہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری جسے شہرزاد سمجھنے سے قاصر تھی۔

"کسی کی غیر موجودگی میں ان کی چیزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا' مینرز کے خلاف ہے۔" شہرزاد کے ٹوکنے پر وہ ہلکا سا ٹھٹکا۔

"سوری' آپ کو برا لگا شاید..." اس کے مفاہمت آمیز رویے پر وہ چونکی' اسی وقت آفس کا دروازہ کھلا اور مسز

قریشی بڑے مصروف انداز میں اندر داخل ہوئیں۔
"السلام علیکم ماما۔۔۔" اس کے لہجے میں ایک جتاتی ہوئی شوخی تھی۔ شہزاد پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
"اوہ مائی گاڈ ہادی تم۔۔۔" مسز عالیہ قریشی کے چہرے پر بڑی بے ساختہ سی مسرت چھلکی۔ "اپنے باپ کی طرح سرپرائز دینے کی عادت کب بدلے گی تمہاری۔" انہوں نے انتہائی محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔
"آپ ساری باتوں کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں، ملک شاہ نواز کی فائل کہاں رکھی ہے آپ نے، وہی لینے کے لیے ہنگامی دورہ کرنا پڑا ہے مجھے۔"
"وہ بھی مل جائے گی، پہلے شہزاد سے تو ملو۔۔۔" وہ رسانیت سے گویا ہوئیں۔ "شیری، یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے محمد ہادی۔۔۔"
"ماما، پلیز اب یہ مت بتائیے گا کہ یہ شادی کے پورے تیرہ سال بعد پیدا ہوا تھا اور آپ نے کہاں کہاں منت مانی تھی اور کس کس ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ کروایا تھا۔" اس کے شرارتی انداز پر شہزاد نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی کیونکہ مسز قریشی اسے مصنوعی ناراضی سے گھور رہی تھیں۔
"میں نہ بھی بتاؤں تو وہ میرے چہرے پر پھیلی خوشی کو دیکھ کر خود ہی بھانپ چکی ہوگی۔" انہوں نے مسکرا کر اپنی سیٹ سنبھالی۔
"میرا کام کردیں پلیز، صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں اسلام آباد۔" وہ شہزاد کو نظرانداز کر کے سامنے میز پر رکھی فائلوں کو دیکھنے لگا۔
"اب اس کی ضرورت کیوں آن پڑی۔۔۔" انہوں نے دراز کھول کر اس کے مطلوبہ ڈاکومنٹس نکالے۔
"اپنے اسٹوپڈ باس کو ایک دو ڈاکومنٹ دکھانے تھے۔" وہ جلدی جلدی صفحات پر نظریں دوڑا رہا تھا۔
"یہ کیس میں نے شیری کو دے دیا، وہ ہی دیکھے گی اسے۔۔۔" مسز قریشی کی بات پر ہادی نے چونک کر شہزاد کی طرف دیکھا، جو سامنے رکھے کمپیوٹر پر ایک دفعہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھی۔

"دیکھ لیں۔۔۔" ہادی کے اس جملے میں کچھ تھا جو شہزاد کو سخت برا لگا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر فوراً کھڑی ہوئی۔
"آپ کسی اور اچھے اور قابل وکیل کو بھی ہائر کر سکتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔" اس نے اپنے ڈاکومنٹس اٹھائے اور جلدی سے آفس سے نکل گئی۔ ہادی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
"انہوں نے شاید مائنڈ کر لیا ہے۔۔۔"
"کرنا بھی چاہیے، تم نے بھی تو ڈائریکٹ اس کی قابلیت پر شک کیا تھا۔" مسز قریشی نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔
"آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے اپنے کان کھجاتے ہوئے شرمندہ لہجے میں وضاحت دی۔
"اینی ہاؤ، تمہارا جو بھی مطلب تھا، جاتے ہوئے اس سے ایکسکیوز کر کے جانا، کافی منگواؤں تمہارے لیے۔"
"نہیں ماما، دیر ہو رہی ہے مجھے۔۔۔" اس نے جلدی سے اپنی مطلوبہ فائل نکالی۔
آدھے گھنٹے کے بعد وہ باہر نکلا تو اسے معلوم ہوا وہ اپنے گھر جا چکی ہے، ہادی کو ایک لمحے کو افسوس ہوا اور اگلے ہی منٹ وہ سر جھٹک کر ایک دفعہ پھر مری کے لیے نکل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑی پراسرار سی رات تھی اور چاند بھی اپنے پورے جوبن پر تھا، شاہ میر ایک دن کی چھٹی پر کھاریاں سے گھر

پہنچا تھا۔ اگرچہ وہ نور محل سے گاڑی لے کر ہی مری کے لیے نکلا تھا لیکن اسے گھر پہنچتے پہنچتے بھی رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔

احمد بخش چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ وہاں میر خاقان کی سیاہ پراڈو پہلے سے کھڑی تھی جس سے اسے اندازہ ہوا کہ خاقان چچا پورے ایک مہینے بعد گھر پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنی سیاسی مصروفیات کی بنا پر زیادہ تر ملتان اور لاہور میں پائے جاتے تھے۔

شاہ میر نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ اٹھایا اور جلدی سے اندر کی جانب بڑھا۔ پورے گھر کی لائٹیں بند تھیں اور یقیناً "سب ہی اپنے اپنے کمروں میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

اس نے جیسے ہی ہال میں قدم رکھا سامنے سے طوبیٰ لمبی لمبی جمائیاں لیتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ شاہ میر کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو چمکے۔ طوبیٰ اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ اس کا دوپٹا اس کے پیروں میں جھول رہا تھا۔ شاہ میر کو شرارت سوجھی اس نے اپنا بیگ خاموشی سے زمین پر رکھا اور ایک دم اچھل کر طوبیٰ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ طوبیٰ کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی شاہ میر نے بوکھلا کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا۔ وہ اس کی گرفت میں کسی مچھلی کی طرح تڑپی۔

"خدا کا خوف کرو طوبیٰ! کیوں پورے گھر کو اٹھانا ہے....؟" اس نے ہلکا سا جھنجلا کر اسے چھوڑا۔

طوبیٰ کے چہرے پر ابھی بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں جب کہ شاہ میر کے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"انسانوں کی طرح نہیں آسکتے تم...." وہ ہلکا سا چڑ کر بولی۔

"نہیں...." وہ مزے سے بولا۔ "ویسے تم کیوں آدھی رات کو بدروح بن کر گھوم رہی ہو یا پھر تمہارے دل نے بتادیا تھا تمہیں کہ میں پہنچنے والا ہوں۔" اس نے شوخ نظروں سے طوبیٰ کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"ہمیشہ خوش فہمیوں میں ہی رہنا" بیپر ہے صبح میرا اور در شہوار کا' چائے بنانے آئی تھی میں۔" خفا خفا سی وہ شاہ میر کو اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوئی۔

"میں چلوں تمہارے ساتھ کچن میں...." وہ شوخ ہوا۔

"شکریہ' کوئی ضرورت نہیں ہے...." اس نے منہ بنایا۔

"اچھا' پھر ایک کپ میرے لیے بھی بنا کر لے آنا' یقین مانو' دل سے دعا کروں گا تمہاری کامیابی کی...." اس نے شرارتی نگاہوں سے اس کا تپا تپا سا چہرہ دیکھا' وہ بھی شاید کسی اچھے موڈ میں تھی۔

"اچھا' اچھا بنا دوں گی لیکن خبردار' کچن میں آکر میرے سر پر سوار ہونے کی ضرورت نہیں...." طوبیٰ نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی اور جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کچھ لمحے تو مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا اور پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دل کی دنیا ایک دم ہی روشن ہو چکی تھی۔

وہ ہلکا سا گنگناتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں داخل ہوا' جیسے ہی اس نے سوئچ بورڈ سے کمرے کی لائٹ کا بٹن دبایا' بھک کر کے اس کا دماغ اڑ گیا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے کا منظر دیکھنے لگا' اگرچہ پاک آرمی کی ٹریننگ نے اس کے حواس خاصے مضبوط بنا دیے تھے لیکن اندر کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ ایک لمحے کو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ

نیر کاشف

بالوں کی لمبی سیاہ آبشار پشت پہ پھیلتی جا رہی تھی اور وہ خوب اچھی طرح برش پھیرنے کے بعد اب اس آبشار کو خوب صورت سنہری کلپ میں قید کر رہی تھی۔ ہلکے اور گہرے سبز رنگ کے امتزاج کا ہلکا کامدار کرتا خوب بچ رہا تھا اور دوپٹے کے کنارے پر لگی سنہری بیل پر کھڑکی سے پڑتی روشنی کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ اس کی ہلکی سی حرکت سے کانوں کے جھمکے جھوم جھوم جاتے اور چوڑیاں کھنکھنا اٹھتیں۔

طلحہ کمرے کے دروازے سے ٹیک لگائے محویت سے اسے تک رہا تھا اور طاہرہ اس کی موجودگی سے یکسر بے خبر اس کی منتظر تھی۔ لبوں پہ شرمیلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں بے چینی' کتنا حسین امتزاج ہے۔ طلحہ نے سرشار نظروں سے اسے دیکھا اور کھنکھارا' وہ تیزی سے کھڑی ہوتی ہوئی پلٹی۔

"آپ آگئے؟" جلدی اور گھبراہٹ میں سلام بھی نہ کر پائی۔

"جی جناب' میں آگیا۔" طلحہ نے اندر قدم بڑھائے اور دروازے پر لگا پردہ برابر کیا۔ "کیسا رہا پہلا دن؟ میرے بغیر؟" سوال کے دونوں حصے معنی خیز انداز میں ادا کرتے وہ اس کے پاس آبیٹھا۔

"ٹھیک گزرا۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ انگلیاں خواہ مخواہ ہی ایک دوسرے میں پیوست ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ اسی حیا پر تو دل نثار ہو ہو جاتا ہے' طلحہ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ اسے نظریں بھر کر دیکھا۔

"اچھا؟ تمہارا دن ٹھیک گزرا' میرا تو بہت بے چین' بہت بے قرار گزرا۔" حال دل الفاظ و انداز سے خوب عیاں ہوا "یار! افسوس ہوا کہ صرف ایک ہفتے کی کیوں لی شادی کی چھٹی۔" اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرایا۔ نئے فرنیچر' پھول اور پرفیوم کی ملی جلی خوشبو کو کھینچ کر سانسوں میں اتارا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"طاہرہ! تم میری زندگی میں اتنی تبدیلی لے کر آؤ گی' یہ میں نے سوچا نہیں تھا' سچ پوچھو تو اتنی مصروف زندگی میں شریک حیات کا کوئی تصور ذہن میں تھا ہی نہیں۔ بس اماں نے بات طے کر دی اور میں نے ہامی بھرلی اور اچھا ہی کیا' تم جو مل گئیں۔" طاہرہ کے شرمگیں لب اور حیا سے بوجھل آنکھیں اکٹھے مسکرائے۔

"طلحہ' کہاں رہ گئے بھئی' چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" ساس کی آواز میں ناگواری نہ تھی تو خوش گواری بھی نہ تھی۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سر ڈھکتی ہوئی کمرے سے باہر کی جانب تیزی سے بڑھی۔ طلحہ بھی گہری سانس لیتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم اتنا تیار کیوں ہوئی ہو؟ کہیں جا رہی ہو کیا؟" ساس نے تنقیدی نظروں سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

شادی کو پانچ ہی روز ہوئے تھے' طلحہ کو دفتر سے مختصر ہی چھٹیاں ملی تھیں' وہ تو اس کی دفتر سے واپسی کے وقت کا سوچ کر تیار ہوئی تھی لیکن اب ساس کے سوالات سن کر چکرا گئی تھی۔

"نہیں اماں! کہیں جا تو نہیں رہے وہ تو میں بس یونہی۔"

"کیا یونہی؟" ساس کی آواز ہلکی ہوئی اور لہجہ تیز۔ "گھر میں جوان نند ہے' کچھ تو حیا کرو' یہ کیا طریقہ ہے کہ میاں کے دفتر سے آنے کا وقت ہوا اور بیگم سج بن

کے بیٹھ گئیں۔" طلحہ منہ ہاتھ دھو کر کرتے کی آستین موڑتا اسی طرف آ رہا تھا' اسے دیکھ کر لہجے کی تیزی میں بھی کمی آئی۔

"حرا! چائے لے آؤ بھئی۔ آ گئے تمہارے بھائی جان۔" اماں نے اپنے تخت پر بیٹے کے لیے جگہ بناتے ہوئے بیٹی کو آواز دی۔

"میں دیکھتی ہوں اماں۔" وہ تو پہلے ہی ان کی باتوں سے خائف ہو رہی تھی' اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی۔

"آیئے بھابھی آیئے۔ چائے تو کب کی بن چکی'

بس کباب تل رہی تھی میں۔" حرا نے خوش دلی سے اسے بتاتے ہوئے چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھیں۔ "یہ لیں آپ لے کر چلیں' میں کباب لے کر آئی۔"

"ایسا کرو نا حرا! تم چائے لے جاؤ' میں کباب دیکھتی ہوں۔" اس نے جلدی سے بڑھ کر حرا کے ہاتھ سے کفگیر لے لیا۔ جانے کیوں اب وہاں اماں کے سامنے جانے سے شرمندگی ہو رہی تھی' حرا نے اثبات میں سر ہلایا اور چائے لے کر باورچی خانے سے نکل گئی' ابھی کباب تل کر پلیٹ میں ڈالے ہی تھے کہ ہاتھ میں خالی گلاس لیے طلحہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔

"کہاں رہ گئی ہو یار؟ دل بھر کے دیکھا بھی نہیں تمہیں۔" بے تابی سے وہ بیوی کے قریب آیا۔

"تمہیں کیا شوق ہو گیا کباب تلنے کا۔" اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ دیکھتے ہوئے وہ مصنوعی سا خفا ہوا۔

"آپ یہ پلیٹ پکڑیں' میں پانی دیتی ہوں آپ کو۔" اس نے ایک ہاتھ سے اسے پلیٹ تھمائی اور دوسرے سے گلاس لینا چاہا لیکن جانے کیا ہوا' دونوں ہی زمین بوس ہو گئے' گلاس بھی اور کبابوں کی پلیٹ بھی۔

"کیا یار! ڈرتی ہو مجھ سے؟" وہ بھی طاہرہ کے ساتھ ہی زمین پہ جھک کر کانچ اٹھا رہا تھا اور زیر لب مسکرا بھی رہا تھا۔ جانے اس منظر میں ایسی کیا بات تھی جو چھناکے کی آواز سن کر اس طرف آتی اماں کو شدید ناگوار گزری تھی۔

"حد ہوتی ہے اتاؤلے پن کی' حیا تو آنکھوں میں ہے ہی نہیں۔" انہوں نے زور سے کہا اور دروازے سے ہی پلٹ گئیں' طاہرہ اور طلحہ خوامخواہ ہی چور سے بن گئے۔

☆ ☆ ☆

اگلا دن دفتر میں گزارنا طلحہ کو بے حد مشکل محسوس ہو رہا تھا' اس نئے رشتے میں اتنے رنگ' کتنا لطف ہے' اسے ہر دن یہ احساس نئے طریقے سے ہو رہا تھا۔ چھٹی کے بعد وہ گاڑی کو تقریباً" اڑاتا ہوا گھر پہنچا تھا۔

"السلام علیکم اماں۔" گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کے سامنے سر جھکایا۔ جو حسب معمول صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی تھیں۔ شکر ہے اماں تسبیح میں مصروف ہیں' وہ بچوں کی طرح دل ہی دل میں خوش ہوا اور بے چینی سے کمرے کی جانب قدم بڑھائے۔

"السلام علیکم۔" طاہرہ کے سلام کا جواب دینے سے پہلے ہی اس کا سارا جوش ماند پڑ گیا تھا۔ دھلا دھلایا چہرہ اور سادہ سا سوتی جوڑا پہنے وہ کملائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بے دلی سے سلام کا جواب دیتا وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"کیسا گزرا آپ کا دن؟" طاہرہ نے محبت سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوال کیا' برف جو ایک دم سے مزاج پر پڑ گئی تھی' کچھ پگھلی۔

"سارا دن تو شام کے انتظار میں گزرا کہ کب گھر جاؤں اور اس کا دیدار کروں جو سارا دن میری منتظر رہ کر اب میرے لیے سج سنور رہی ہوگی۔" الفاظ میں شکوہ خوب خوب ظاہر ہو رہا تھا۔

"وہ' طلحہ! دراصل! اماں نے مجھے سختی سے منع کیا ہے گھر میں تیار ہونے کو' کہتی ہیں حرا پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔" وہ وضاحت کرتی ہوئی سر جھکا گئی۔ طلحہ لب بھینچ کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بہو! آج آپا کے گھر جانا ہے تم بھی ساتھ چلوگی۔" اطلاع دیتے دیتے حکم دیا گیا۔

"جی اچھا اماں!" طاہرہ کی تربیت میں ہی اطاعت شامل تھی۔

"دوپہر کا کھانا کھاتے ہی تیار ہو جانا' طلحہ کی واپسی تک ہم آ بھی جائیں گے۔" انہوں نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور حرا نے رسالہ' وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کے لیے باورچی خانے میں آ گئی۔

کھانا کھا لیا گیا تو وہ کمرے میں آئی اور الماری کی طرف بڑھی۔ ہلکے پھلکے کام والے کتنے ہی جوڑے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لٹکے ہوئے تھے جن کو بنواتے ہوئے بھابھی اور آپی دونوں کا ہی کہنا تھا کہ شادی کے ابتدائی ایام میں شام کی تیاری کے لیے خوب رہیں گے۔ اس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کپڑوں کی قطار پر ہاتھ پھیرا اور ایک سادہ سا جوڑا نکال کر الماری بند کر دی۔

"یہ پہن کر جاؤ گی آپا کی طرف؟" اماں کے ساتھ ساتھ حرا نے بھی دل بھر کے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو طاہرہ نے خاموشی سے اسی قطار میں سے سرخ اور سیاہ امتزاج کا جوڑا زیب تن کر لیا۔

"بھابھی! خدا کے لیے کچھ میک اپ بھی کر لیجیے گا۔" حرا نے صحن سے ہی آواز لگائی' لائنر' کاجل' اور ہلکے سے میک اپ کے بعد آئینہ دیکھا تو دل نے اسی کو یاد کیا جس کا اس کے سجنے سنورنے پر حق تھا' جانے کیا سوجھی اسے' اس نے پرس میں موبائل فون رکھتے رکھتے باہر نکالا اور طلحہ کے لیے پیغام لکھنے لگی۔

"سلام محبت' ہم خالہ امی کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے سرخ اور سیاہ جوڑا پہنا ہے۔" مسکراتے ہوئے اس نے پیغام کو برقی لہروں کے حوالے کر دیا اور کمرے سے باہر قدم بڑھا دیے جہاں اماں اور حرا اس کی منتظر تھیں۔

☼ ☼ ☼

خالہ امی کے گھر وقت بہت اچھا گزرا' ان کی بیٹیاں طاہرہ کی گرویدہ ہو چلی تھیں' ابھی بھی سب اسے گھیرے بیٹھی تھیں کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

"اوہو! ارے واہ طلحہ بھائی آئے ہیں بھئی۔"

"ارے طلحہ اور یہاں اس وقت؟" اماں کی نظروں میں حیرانی سی حیرانی تھی۔

"ارے بھئی میرا بھانجا اپنی بیوی کے پیچھے آیا ہے بھئی۔" خالہ نے محبت سے اسے اور طلحہ کو دیکھا جو نظروں ہی نظروں میں اسے سراہ رہا تھا۔

"حد ہوتی ہے۔" اماں غصے سے بس اتنا ہی کہہ پائی تھیں۔

"کیوں بھئی! تمہیں میرے بھانجے کا خالہ کے گھر آنا برا کیوں لگا؟" خالہ نے بھنویں جوڑتے ہوئے مصنوعی خفگی دکھائی۔

واپسی پر سارے راستے اماں خفا رہیں اور حرا محتاط۔

حرا کے سسرال والے تاریخ لینے آ رہے تھے' طاہرہ صبح سے باورچی خانے اور گھر کے کاموں میں گھن چکر بنی پھر رہی تھی' طلحہ بھی اندر باہر کے کاموں میں مصروف تھا' شام تک سب کاموں سے فراغت پا کر اس نے کمرے کا رخ کیا تو طلحہ آنکھوں پر بازو رکھے پہلے سے لیٹا تھا۔ بستر نظر آیا تو دکھتی کمر نے دہائی دی۔ لیکن ابھی اپنی تیاری باقی تھی' جس کے لیے خاص ہدایات دی گئی تھیں۔

"طلحہ دیکھیں تو ذرا اس فون جوڑے کے ساتھ یہ والی چوڑیاں ٹھیک ہوں گی یا یہ والی۔" اس نے دونوں سیٹ ہاتھ میں لے کر اس کے سامنے کیے تو وہ آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کچھ بھی پہن لو' کون سا میرے لیے تیار ہونا ہے تم نے۔"

طلحہ کے لہجے کی کاٹ اس کے اندر تک اتر گئی تھی' اپنی ماں کا طرز عمل جانتے ہوئے بھی یہ رویہ؟ وہ بے طرح اداس ہوئی۔ گاڑی میں میرا آگے بیٹھنا بے حیائی' درمیان میں مناسب فاصلہ رکھ کر بھی ایک صوفے پر بیٹھنا بے شرمی' طلحہ کا میری طرف محبت سے دیکھنا غلط' رات میرا جلد کمرے میں آنا تو خیر قیامت' جب تک ساس اور نند لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہیں' میں بھی وہیں بیٹھوں' کمرے میں آؤں تو طلحہ طاہر ہے سو چکے ہوتے ہیں۔ پھر سارا وقت موڈ خراب رہتا ہے ان کا' میں کروں تو کیا کروں اللہ جی! رات گئے وہ جائے نماز بچھائے ہاتھ اٹھائے بلکتی رہی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد بنا کپڑے تبدیل کیے وہ پھیلاوا سمیٹنے کے بعد کمرے میں آئی تو طلحہ سو چکا تھا۔ اب وہ رب سے راز و نیاز کرتے کرتے آنسوؤں میں بھیگ چکی تھی کہ کندھے پر لمس محسوس ہوا' وہ جانے کس وقت ساتھ آ بیٹھا تھا۔

"میں خود تم سے شرمندہ ہوں طاہرہ! اماں کا رویہ

سمجھ سے باہر ہے' تمہاری غلطی نہ ہونے کے باوجود میرا ابھی غصہ تم پر اتر جانا واقعی ناانصافی ہے' تم بھی مجھے معاف کردو یار۔'' آواز میں بے چارگی در آئی تھی۔
وہ خاموشی سے ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ کافی دیر دونوں خاموش رہے۔ پنکھے کی گھرر گھرر کے علاوہ کبھی کبھی آنسو پونچھتی طاہرہ کی چوڑیاں کھنک جاتیں تو وہ ڈر کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتی' طلحہ اسے دیکھ کر مسکراتا اور وہ جھینپ جاتی۔
اگلا دن چھٹی کا تھا' فجر کے بعد چائے بنانے کی نیت سے اس نے کمرے سے باہر کی جانب قدم اٹھایا تو طلحہ ایک دم سے سامنے آگیا۔
''سنو! پہلے میری بات سن جاؤ' مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا سا مسئلہ نہیں ہے' لیکن تم نے اس بات کو کبھی کسی سے نہ کہا۔ مجھے لگتا ہے کہ اماں حرا کی وجہ سے زیادہ محتاط ہو جاتی ہیں' ایک ماہ کی تو بات ہے حرا کی شادی ہو جائے گی تو یقیناً مسائل ایسے نہیں رہیں گے۔'' وہ سر جھکائے بول رہا تھا' طاہرہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور باہر نکل گئی' اس تھپتھپاہٹ میں بہت سے پیغام تھے' وہ دل سے اللہ کا شکر گزار ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

''حرا! اپنے بھائی جان کو بلا لاؤ' ناشتہ لگ گیا ہے۔''
طاہرہ نے میز پر جلدی جلدی سامان رکھا اور حرا کو مخاطب کیا' جانتی تھی کہ اس کا خود بلانے کے لیے جانا ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔
''اوہو' کیا خوش بو ہے بھئی' آملیٹ اور پراٹھوں کی۔'' کرسی کھینچتے ہوئے طلحہ نے بے ساختہ تعریف کی تو طاہرہ زیر لب مسکرا دی۔
''طلحہ! مووی والے سے بات کرلی تم نے؟''
اماں نے ہاٹ پاٹ سے پراٹھا نکال کر اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔
''اماں! مووی اتنی ضروری ہے کیا؟'' طلحہ کی آواز میں بے زاری تھی۔ اس نے اپنی شادی بھی سادگی سے ہی کی تھی۔ اب بہن کی بھی سادگی سے کرنا چاہتا تھا۔
''بھائی! میری بات سن لیں' آپ کی جیسی پھیکی سیٹھی شادی میری نہیں ہوگی' سب کچھ ہوگا جو آج کل ہوتا ہے۔'' حرا نے ٹھنک کے کہا۔
''ارے ہاں ہاں بیٹا! تمہاری مرضی کے ہوں گے سارے کام' ایک ہی بیٹی ہے میری۔'' اماں نے لاڈ سے حرا کو گلے سے لگایا اور طاہرہ کے حلق میں نوالہ اٹک سا گیا۔

☼ ☼ ☼

شادی ہال میں گھپ اندھیرا تھا' موسیقی کی تیز آواز سے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے' ہر رنگ کی روشنی دلہن بنی حرا پر مرتکز تھی جو مووی میکر کی ہدایات پر عمل کرتی مختلف ادائیں دکھا رہی تھی۔ طاہرہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسٹیج کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اگلی ہدایت کے مطابق دولہا دلہن کے بے حد قریب آچکا تھا۔ تمام مہمانوں کی نگاہیں ان کی جانب تھیں' اسٹیج پر مصنوعی برف باری بکی جا رہی تھی' دولہا کا ہاتھ حرا کے گرد رکھوایا گیا تھا' حرا کا ایک ہاتھ دلہا کے کندھے پر تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھتری تھی' دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھتے شاید حقیقت میں اردگرد سے بے خبر ہوگئے تھے۔
اب اسٹیج پر لگے فرشی قمقموں کے پاس سے مصنوعی دھواں چھوڑا جا رہا تھا اور پس پردہ موسیقی کے ساتھ انتہائی واہیات الفاظ پر مشتمل گانا چل رہا تھا۔ اس قدر گھپ اندھیرے میں جب سارے مہمانوں کی نظریں دلہن اور دلہا کی جانب تھیں' طاہرہ کی نظریں اپنی ساس کو تلاش کر رہی تھیں۔

شازیہ الطاف ہاشمی

حاصل زیست

وہ شروع سے دو اور دو چار کرتی آئی تھی۔ پیسوں کے ان ہی جوڑ توڑ کے سلسلوں میں عمر کٹ گئی تھی۔ ابا کی وفات تو اس کی سوچ سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ ایک امی۔ ایک وہ اور ایک اکلوتا بھائی سمیر۔ اماں کو سمیر کی دل جوئی اس کے خرچوں سے کبھی فرصت ہی نہ ملی کر وہ مڑ کر بڑی بیٹی فرحانہ پر بھی نظر کرلیتیں' وہ تو بس سمیر۔ سمیر کرتی پھرتیں۔

"سمیر ٹنڈے گوشت کھاتا ہے' بڑیانی شوق سے کھائے گا اور آج کوفتے بنیں گے۔ دال گوشت نہیں پکے گا۔" حالات نے اسے خاموش طبیعت اور صابر بنا دیا تھا۔ باپ کی شفقت دیکھی نہیں تھی اور ماں کی محبت سے ویسے ہی محروم رہی تھی' ماں بھائی کی زندگی سہل' آسان بنانے میں جتی رہتیں اور وہ کھانے پکانے میں یا پھر کپڑے سلائی کرتی رہتی۔ اس سے اچھا خاصا خرچ نکل آتا تھا۔

وہ جتنا بھی کماتی' ماں کے ہاتھ پر رکھتی اور ماں جوں کا توں سمیر کو تھما دیتی اور وہ اس کے خون پسینے کی کمائی لمحوں میں اڑا ڈالتا تھا۔ اسے کبھی بھی گھر کی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف اپنی فکر کرتا تھا بس۔ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا قد اور مسلسل فیل ہو ہو کر تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ نہ کبھی اماں کو احساس ہوا تھا کہ سمیر کو اب کام سے لگنا چاہیے تھا۔ وہ سر جھکائے مشین پر جھکی رہتی یا پھر پیسوں کا جوڑ توڑ کرتی رہتی۔

ایک کلو گھی آ گیا۔ آدھا کلو قیمہ۔ دس روپے کی مرچیں' ہرا دھنیا' ادرک بیس روپے کا لہسن' دالیں ساری پاؤ پاؤ تو کتنا لگ سکتا ہے' کیا بچ سکتا ہے۔ وہ سارا سارا دن حساب کتاب کرتی تھی۔ اماں ہانڈیاں بھونتی تھیں یا پھر بیٹے کو بہلانے میں مصروف رہتیں۔ سمیر اب اٹھارہ سال کا ہونے کو آیا تھا' مگر اس کا کام کاج کا ارادہ دور' دور تک نہیں تھا۔

فرحانہ انار کے سوکھے پھولوں کو اکٹھا کر رہی تھی۔ انار کے اس گھنے پیڑ سے اسے بہت محبت تھی۔ یہیں بیٹھ کر وہ اپنے اسکول کا کام کرتی تھی۔ تب مشین اماں کے ہاتھ میں تھی۔ اب وہ چلاتی تھی۔ سرخ سرخ خوب صورت کلیوں کی بڑی تعداد تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے اناروں کا بور دکھتا تھا۔ شاخ پہ لگے پھلتے پھولتے انار کار آمد تھے اور نیچے گرے پھول گندگی کے ڈھیر کا مقدر۔

انسان بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنے مقصد سے چمٹے ہی اچھے لگتے ہیں۔ جونہی بے مقصد ہوئے' راہ سے ہٹے' بھیڑ میں گم ہوگئے۔ بے کار ہوگئے۔ اس نے کپڑے کی کترنوں اور سبزی کے چھلکوں کو قیمے والے شاپر میں ڈالا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

وہ بہت صاف ستھری طبیعت کی سلیقے والی لڑکی تھی اور سمیر بالکل اس کے الٹ۔ وہ ہر وقت حالات سرہائے کارونا روتا تھا اور وہ ہمت سے بہت آگے تک دیکھتی تھی۔ وہ کم ہمت تھا۔ کام سے نظر چرانے والا۔ اماں اسے سلجھتی تھیں۔ مگر چپ تھیں' کیونکہ وہ بیٹے کی ماں تھیں۔ ادھر سارے بیٹوں کی مائیں ایسی ہوتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ اماں کو اسے بیاہنے کی فکر تھی۔ رشتے کی تلاش تھی۔ مگر یہ تلاش ختم ہوتی

نظر نہیں آتی تھی۔ فرحانہ اب بیسویں میں لگی تھی۔ چہرہ تازہ اور رونق بھرا تھا' مگر ساتھ جہیز کی رونق نہیں تھی۔ آنکھوں کو خیرہ کرتے زیورات نہیں تھے تو کچھ نہیں تھا' اس کا سلیقہ' صلح جو صابر سی طبیعت گئی بھاڑ میں۔ آنے والے اسے پیسے میں تولتے تھے اور پھر اٹھ جاتے تھے۔ کوئی تو ہو گا جسے سلیقے کی محبت کی بہت ساری خوبیوں کی چاہ ہو گی' جسے زیور لتے نہیں' وہ چاہیے ہو گی' کوئی جوہری جسے سچے موتیوں کی تلاش ہو گی' چلا آئے گا' وہ سوچتی اور دعائیں مانگے جاتی' کیونکہ سمیر اب اماں اور اس کے ساتھ بدتمیزی بھی کرنے لگا تھا۔ اسے دبئی جانے کو سرمایہ چاہیے تھا۔ ڈھیروں روپیہ درکار تھا۔

جو یہاں ناکام تھا۔ وہ دبئی جا کر' کون سا تیر مار لیتا' وہ کہنا چاہتی تھی' مگر کہتی نہیں تھی جن گوریوں کے لیے

وہ پردیس جانا چاہتا تھا' وہ تو خود جاب کر کے گزارہ کرتی تھیں۔ وہاں کوئی بھی اس کی طرح بے کار نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کے لیے جیبیں بھری ہونا درکار ہوتا ہے' مگر اسے کون سمجھاتا۔

پھر اس کی زندگی میں ایک رشتے کی صورت ارباز آگیا اور اس کی زندگی کا ساتھی بن گیا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ ارباز اور اس کی ماں دونوں ہی اچھے تھے۔ روز گوشت کا سالن پکتا اور وہ اور ارباز مل کے کھاتے۔ ارباز اسے محبت بھری نظروں سے تکتا تو اسے بے یقینی سی گھیر لیتی کہ کوئی اس پر بھی اتنا دھیان دے سکتا تھا۔

مہینے بھر بعد ہی اس نے محسوس کیا' اماں خرچے کے لیے تنگ ہو رہی ہیں۔ ارباز کام وام پر بھی نہیں گیا۔ وہ حیران سی ہو کر جھاڑو دیتی' مگر وہ حیرانی زیادہ دیر نہ رہی' کیونکہ ایک دن ساس نے اسے کمرے میں بلایا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تھی۔ سامنے کے پلنگ پر۔ پھر وہ نیچے جھکیں اور پلنگ کے نیچے سے کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ انہوں نے غلاف اتارا۔ وہ سلائی مشین تھی اور ایک تیل کی شیشی۔۔۔۔

"لے تیل دے اسے اور جھاڑ پونچھ لے' ہنر ہاتھ میں ہے تو اسے کام میں لا' ارباز کو ابھی کام نہیں مل رہا' جب مل جائے گا کر لے گا' ابھی تو کچھ دال روٹی چلے۔"

فرحانہ بیٹھے بیٹھے تھک سی گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے بھنگے سے اڑتے تھے۔ اماں نے مشین رکھوا کر بیٹے کے جوتوں سے بچانے کو بیاہا تھا تو ساس نے بیٹے کی خاطر مشین واپس تھمائی تھی۔

زندگی تو یہی تھی' مشین سے شروع ہو کر پھر مشین پر آرکی تھی۔ پہلے مشین کا پہیہ گھوما تو بھائی کے خرچے نکلے' اب اپنا گھر چلانا تھا اور پہلے کی طرح یہ سب اسے ہی کرنا تھا۔ ساس بھی اس کی اپنی ماں ہی کی طرح بیٹے پر نثار پھرتی تھی۔ اب اسے بھی قربان ہونا تھا۔ مشین چل پڑی۔

ہاتھ میں صفائی تھی' کام چل نکلا تھا' ارباز کے کام کی تلاش تمام ہوتی نظر آتی تھی۔ اب وہ ٹھسے سے

بیٹھ کر کھاتا تھا اور کام ڈھونڈنے والا ڈراما بھی' اب تمام ہوا تھا' اماں نے بھائی کو سدھارنے کی خاطر اس کی شادی کی تھی اور آنے والی کا جو حشر بھائی نے کیا تھا' اماں کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا۔ سمیر روز جوتے مار مار کے اس یتیم لڑکی کی بددعائیں سمیٹتا تھا۔ اوپر سے کھانے کی چاٹ۔ مسالے دار بھنائی والے مہنگے پکوان کیسے پک سکتے تھے جب اس نے کمانا نہیں تھا اماں کی سانسیں بھی اب مشکل میں تھیں۔

نکما مرد گھر بھر کے لیے کتنا بڑا عذاب بنتا ہے' یہ تو ایسے حالات سے گزرنے والیاں ہی جان سکتی ہیں۔ فرحانہ کا اپنا جیون ساتھی ایسی ہی دلدل سے نکلا تھا۔ جس میں وہ پور پور ڈوبی ہوئی تھی۔ مگر ایک اچھی بات اس میں یہ تھی کہ وہ مارتا نہیں تھا۔ ورنہ اتنی محنت اور اتنی موٹی عینک والی کمزور سی فرحانہ کیسے سہتی' ایسی وحشیانہ مار کٹائی۔

اللہ کا شکر تھا کہ وہ مار پیٹ نہیں کرتا تھا۔ بس اپنے مضبوط بازوؤں اور صحت مند جسم کو سمیٹے سارا سارا دن سوتا رہتا تھا اور سو سو کر تھک جاتا تھا۔ اب اسے وہ کیسے

بتاتی کہ خالی خولی لیٹے رہنے سے بھی انسان تھک جاتا ہے۔ جسم پڑے پڑے باسی ہونے لگتا ہے‘ مگر یہ بات کہتا کون ساس کپڑے پہنچاتی جاتی اور وہ سیتی جاتی‘ بہرحال وہ بری عورت نہیں تھی۔ اس نے اوپر تلے دو بیٹے پیدا کیے تھے۔ آخر میں بیٹی۔ تینوں بچوں کو ساس نے سنبھالا تھا۔ کھانا پانی‘ نہلانا‘ سلانا سب اماں کے ذمے تھا۔

اب جاوید اور انصار بڑے ہو رہے تھے۔ انہیں اسکول کا خرچا بھی چاہیے تھا۔ اس کے ہاں دور دور سے آرڈر آرہے تھے۔ دونوں لڑکے اسکول جانے لگے تھے۔ اس نے محلے کی پانچ‘ چھ لڑکیاں پاس بٹھالی تھیں‘ انہیں بھی معقول اجرت دے کر کام میں شامل کیا تو آرڈرز جلد تیار ہونے لگے تھے۔ وہ کبھی کبھار اماں کی مٹھی میں بھی سو دو سو تھمانے لگی تھی۔ سمیر تو خود بھوکا مر رہا تھا۔ اماں کو کہاں سے کھلاتا۔ اسے پتا تھا۔

بھابھی نے مقامی بسکٹ فیکٹری میں کام ڈھونڈ لیا تھا۔ اس طرح وہ بھی محنت کرنے لگی تھی یا کروائی گئی تھی یا بہرحال اس نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ نہ کچھ خرچا چلنے لگا تھا۔ میکے میں اس کا کوئی تھا نہیں اور اس کا تو ہو کر بھی کون سا تھا۔ سب مقدر کی بات تھی‘ کس کے نصیب میں کیا لکھ دیا ہے اللہ نے یہ وہی جانتا ہے‘ بس۔۔۔

ارباز اس کی زندگی میں شامل تھا اور ہو کر بھی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں پر مجبوریوں کی موٹی موٹی گانٹھیں پڑ گئی تھیں اور آنکھیں اب موٹے موٹے شیشوں کے بنا ادھوری تھیں۔ وہ یہ کام گھر چلانے شوہر کا ہاتھ بٹانے کو کرتی تو بخوشی کر رہی ہوتی‘ مگر وہ اس محاذ پر اکیلی تھی۔ اسے اکیلے ہی اپنی جنگ لڑنی تھی۔

بچوں کو آگے لے جانا تھا۔ ان کا مستقبل بنانا تھا۔ ارباز کے تعاون کے بغیر دکھ تو ہوتا تھا‘ مگر زبان پر حرف شکایت نہیں لائی۔ بے حسوں سے بھی کوئی سر پٹکتا ہے۔ بھلا اگر کوئی یہ لاحاصل کام کرتا بھی تھا تو وہ تو ہرگز بھی یہ غلطی کرنے والی نہیں تھی۔ جسے بیٹھا نظر نہیں

آیا' اسے کھڑے ہو کر بھی دکھانا بھی کوئی دکھانا ہوا بھلا۔

☆ ☆ ☆

جاوید میٹرک تک آتے آتے سلجھے ہوئے خوددار نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے باپ کا الٹ تھا۔ اس کی دادی کے مطابق وہ اپنے دادا جیسا تھا' جس نے ایک عورت کو مرد بن کے سنبھالا تھا۔ گھر چلایا تھا۔ اسے زمانے کے سرد گرم سے دور رکھا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے باپ کا سایہ بھی نہیں پایا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ ابو کیسے تھے۔ مگر اس کی ماں کے آنسو بتاتے تھے کہ وہ بہت اچھا آدمی ہی ہو گا جو اتنے سال گزرنے کے بعد بھی آنسوؤں میں زندہ تھا۔ اچھے لوگ چاہ کر بھی فراموش نہیں کیے جاسکتے اور برے لوگوں کو اچھے لفظوں میں یاد رکھنا بھی مشکل کام ہے' بلکہ ناممکن۔۔۔۔

جاوید اس کے بھائی سمیر جیسا بھائی بھی نہیں تھا۔ اسے چھوٹے بھائی انصار اور بہن ثمرین سے بھی محبت تھی۔ روٹی کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر پچھلا روٹی کا حصہ چھوٹے بہن' بھائیوں کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔ جب اماں دوسری روٹی اتار لیتیں' پھر شامل ہو جاتا۔ اس نے زندگی صرف مشین گھمانے میں صرف نہیں کی تھی' بلکہ بچوں کی تربیت پر بھی پورا پورا دھیان دیا تھا اور وہ دھیان آج سامنے تھا جو اسے خوش کر دیتا تھا۔ بڑا بھائی ہونے کے ناتے وہ اسکول کے بعد خود ہی ایک سموسے والے کے ہاں چلا جاتا' جہاں سے اپنے اخراجات نکال کر وہ ماں کو بھی سو پچاس دے دیتا تھا۔ فرحانہ نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے کرنے دیا تھا۔ اسے محنتی ہونا چاہیے تھا اور موقع اسے ملنا چاہیے تھا۔

انصار بھی بھائی کی دیکھا دیکھی کریانے کی دکان پر کام کرنے لگا تھا۔ وہ دونوں پڑھائی میں اچھے تھے۔ رات گئے تک وہ پڑھتے رہتے تھے۔ اس لیے اس نے ٹوکا نہیں تھا۔ ثمرین گھر کے معمولی کام کاج میں دادی کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ دور سے دیکھتی' رب کا شکر ادا کرتی تھی۔ جاوید اور انصار کے قد بڑھتے گئے۔ وقت سرکتا رہا' آگے اور آگے۔

جاوید کی سرکاری ملازمت اور انصار کی پرائیویٹ فرم میں تگڑی تنخواہ آنے کے بعد آہستہ آہستہ مشین پر غلاف دوبارہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ ثمرین ایف اے کر رہی تھی۔ گھر کے حالات اب اچھے نہیں بہترین تھے۔ اماں' اب بوڑھی بلکہ بہت بوڑھی تھیں۔ وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ اسے اماں کے جانے کے بعد اپنی ساس اماں سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ دونوں نے ایک سے حالات بھگتے تھے۔ بیٹوں کے ہاتھوں درد اٹھائے تھے۔

اسے دونوں امائیں ایک سی لگتی تھیں۔ مگر اماں جلد ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ اس سرد شام فرحانہ کا ایک بازو جدا ہو گیا تھا۔ اس نے خزاں کے دن اماں کے ساتھ گزارے تھے۔ اب بہار آئی تھی تو وہ چل پڑی تھیں۔ گھر ایک دم خالی ہو گیا تھا اور اندر بھی۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی۔

جب وہ جاوید کے لیے رشتہ ڈھونڈنے نکلی تھی تو وہ اسی انار والے گھر کے دروازے پر رک گئی تھی جس کی چھاؤں تلے بھی اس نے مشین چلائی تھی۔ اندر اس کی بھتیجی فضا پرائی فرحانہ بنی گھر گھر میں گھوم رہی تھی مسل رہی تھی' کٹ رہی تھی' وہ مشین چھوڑ کر پھوپھی کے گلے لگ گئی تھی۔

آنسو صرف فضا نے نہیں بہائے تھے' بلکہ آنسو فرحانہ کے بھی فضا کا کندھا گیلا کر گئے تھے۔ گھر کی حالت بھی وہی تھی' بلکہ اس سے بھی زیادہ تنگ دستی گھر کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ جب اس نے انگوٹھی ڈبیہ سے باہر نکالی تو خود اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کیونکہ اب مشین کا قصہ ختم ہونا تھا۔ اس کا عزم تھا کہ وہ انصار کے لیے بھی کوئی ایسا ہی گھر ڈھونڈے گی جس میں انار کے درخت تلے کوئی فرحانہ بیٹھی ہو گی۔ ارباز کے چہرے پر موجود ملال نے اس کا دل بوجھل کر دیا تھا۔

وہ بے اختیار اس کے بندھے ہاتھوں پر آنسو بہاتی چلی گئی تھی۔ کیونکہ یہی حاصل زیست تھے۔

☆

ناولٹ

اسے کافی پیتے ہوئے یوں ہی خیال سا آیا کہ اگر اسے یہاں بیٹھے اس کا باپ یا باپ کا جاننے والا دیکھ لے تو کتنا برا ہوگا اس کے ساتھ۔ اس کا باپ کیا سوچے گا اور اسی سوچ نے اسے جھٹکے سے وہاں سے اٹھنے پہ مجبور کردیا۔ وہ نرمل پہ لعنت کے دو بول بھیج کر ابھی ہوٹل کے داخلی دروازے کے پاس پہنچی ہی تھی کہ باہر سے فائرنگ کی زوردار آواز سنائی دی۔ اس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی اور ایسی ہی چیخ اس کے آگے پیچھے کئی لوگوں نے ماری تھی۔

فائرنگ کی آواز جب بالکل دروازے کے پاس سے آنے لگی تو ریسٹورنٹ میں موجود ہر فرد نے اپنی جان بچانے کی خاطر آگے پیچھے دوڑنا شروع کردیا۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ اس نے بھی بھاگنا چاہا لیکن اس کی ہمت وہیں دم توڑ گئی۔ اسی اثنا میں کوئی بھاگتا ہوا اس سے آن

نادیہ جہانگیر

وہ ناسمجھ تھی، بے وقوف تھی، جب ہی نرمل کے اصرار پہ اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ نرمل جس کام کے لیے اسے ساتھ لائی ہے وہ کتنا برا اور گھٹیا کام ہے۔ اب جو نرمل کو کونے والی میز پہ اس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف دیکھا تو اسے خود پہ جی بھر کے غصہ آیا کہ وہ کیوں نرمل کی باتوں میں آکر یہاں ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔

وہ بے شک سولہ سال کی تھی۔ لیکن نرمل کو یوں بے باکی سے لڑکے سے باتیں کرتے اور اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے دیکھ کر اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ٹکرایا تھا۔ وہ گرنے لگی تھی، جب ٹکرانے والے نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کو باندھ لیا تھا۔ اس کی بے ساختہ چیخیں بلند ہوگئیں۔

آہنی گرفت والے نے اس کے گرد اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔ چیخیں مارتے مارتے اس کا ماتھا اس شخص کے گلے میں لٹکے تعویذ سے ٹکرایا اور اس کی نظروں نے تعویذ دیکھ کر اس کا سرخ و سفید چہرہ دیکھا تو دل اور اچھل کر حلق میں آگیا۔ خان یعنی "خودکش بمبار" گرفت والے کا سینہ بھی چوڑا تھا۔ یقیناً" اس نے بارودی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ذہن میں آئے "دو نکتے" کو جھٹلا نہ سکی اور اب کی بار جو اس کی چیخیں

بلند ہوئیں' آسمان کو بھی چھو آئیں۔
اتنی بلند ہوتی چیخوں پہ گرفت والے نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھنا چاہا تھا' لیکن وہ سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی تھی۔ مجبوراً" بازل خان کو جما کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھنا پڑا تھا اور اس کے لاکھ چھڑانے کی کوششوں کے باوجود اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کامنی سی لڑکی اس کے بازوؤں میں ہی جھول جائے گی۔ لڑکی کا سانس بند ہو گیا تھا اور ساتھ اس کا بھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ دمہ کی مریضہ ہیں۔ سانس گھٹنے کی وجہ سے ان کی ایسی حالت ہوئی ہے۔ شکر ہے وقت پہ آپ لے آئے' اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" ایمرجنسی وارڈ سے نکلتے ہوئے ڈاکٹر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔
"یہ کب تک ہوش میں آجائیں گی؟" اسے وقت پہ حویلی پہنچنا تھا کہ بابا جان کی کوئی ایک سو ایک کالز آچکی تھیں۔ اب اس لڑکی کو یوں بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جایا جا سکتا تھا۔ یہاں ٹھہرنا اس کی مجبوری تھی اور حویلی پہنچنا بہت ضروری۔ تب ہی ڈاکٹر سے اس نے پوچھا۔
"ایک آدھ گھنٹہ لگ سکتا ہے۔"
"اور تب تک بابا جان کی جان سولی پہ لٹکی رہے گی۔" اس نے سوچا اور گہری سانس لے کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کے ہاتھ میں آئے اور اس نے بنا گنے اور دیکھے وہ سب ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیے۔
"پلیز' اس لڑکی کا خیال رکھنا ہے۔ جب تک یہ ہوش میں نہیں آجاتیں' ان کے پاس رہنا ہے اور ان سے ایڈریس وغیرہ لے کر ان کو بہ حفاظت گھر تک پہنچا دیجیے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا۔ جو اتنے سارے نوٹ دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"ہاں... ہاں کیوں نہیں۔"
"ایسا ہے کہ مجھے جلدی حویلی پہنچنا ہے۔ بابا جان سخت پریشان ہیں' ورنہ میں خود یہاں رکتا۔"
"آپ بے فکر ہو کر جائیں سائیں! میں... میں ان کا مکمل خیال رکھوں گا۔" پیسے پکڑتے ہوئے ڈاکٹر نے بے حد عاجزی کا ثبوت دیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔
"میں ایک نظر انہیں دیکھ لوں۔"
"ایسا ہے سائیں' ہم انہیں ذرا وارڈ میں منتقل کرلیں۔ پھر آپ دیکھ لیجیے گا۔ ابھی ذرا مشکل ہے۔"
ڈاکٹر کی بات پہ اس نے ذرا سا پیشانی کو رگڑا اور کچھ سوچا۔
"یار' بڑی دیر ہو جائے گی۔ آپ ان کا خیال رکھیے گا۔ مجھے جانا ہے۔" وہ کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ دوڑاتا پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر نے زور' زور سے سر ہلایا۔ وہ باہر نکلا تو ڈاکٹر نے ہاتھ میں پکڑے پیسوں کو غور سے دیکھا۔
"واہ مولا! تیری کرم نوازیاں۔" ڈاکٹر پیسوں کو چوم کر فوراً" آگے بڑھ گیا تھا کہ کوئی اور نہ دیکھ لے اور دروازے کے پار زمین پہ کروفر سے چلتے بازل خان نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔
"حریص لوگ۔" اس نے سوچا اور جیپ میں جا بیٹھا۔

☼ ☼ ☼

اسے ہوش آیا تو خود کو نامعلوم جگہ پہ دیکھ کر دل اچھل کر حلق میں آگیا۔
"ایزی... ایزی۔" ڈاکٹر نے اسے اٹھتے دیکھ کر بے ساختہ کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
"یہ میں کہاں ہوں؟"
"آپ اسپتال میں ہیں' آپ کو خان سائیں یہاں لائے ہیں۔ اگر آپ بہتر محسوس کر رہی ہیں تو پلیز اپنا ایڈریس وغیرہ بتائیں۔ تاکہ آپ کے گھر والوں سے رابطہ کیا جا سکے۔" ڈاکٹر کی بات پہ وہ حیران ہوئی کہ یہ

خان سائیں کون ہے بھلا' جو اسے یوں اٹھا کر یہاں ڈال گیا اور پھر ریسٹورنٹ والا واقعہ اس کے ذہن میں دوڑ گیا تو اس کے اندر سنسناہٹ پھیل گئی۔

"تو اس شخص نے دھماکا کر دیا ہوگا۔" اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ پیر ہلائے' سب کچھ سلامت تھا۔ وہ زندہ تھی۔

"وہ شخص تو مجھ سے لپٹا تھا۔ پھر اس خودکش دھماکے میں' میں کیسے بچ گئی؟" اس کے ذہن میں دور' دور تک یہی سوال گونج کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔

"سنیں... میں زندہ ہوں کیا؟" اس کے بچکانہ سوال پہ ڈاکٹر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"کیوں... آپ کو یقین نہیں آرہا؟"

"میں معذور تو نہیں ہوئی؟" اس نے پھر سے ہاتھ پیر ہلا کر اپنے صحیح سلامت ہونے کا یقین کرنا چاہا۔

"بی بی! آپ زندہ ہیں' مکمل ہوش میں ہیں۔ آپ کا کون سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جو آپ معذور ہوتیں صرف دم گھٹا تھا اور اب آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔" ڈاکٹر مجبور تھا کہ اسے مکمل جواب دیتا کہ بازل خان سے ان گنت پیسے جو لے کر جیب میں ڈال رکھے تھے۔ ورنہ اب تو اس کا اپنے ذاتی کلینک میں ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے والا تھا اور وہ یہاں سے فوراً" بھاگنا چاہتا تھا' لیکن خان سائیں کے پیسے اور ان کے غصے کا خوف اسے یہیں بیٹھنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

پتا نہیں وہ سمجھی تھی یا نہیں' مگر اس نے سر ہلا دیا۔ حالانکہ وہ بے چین اب بھی تھی کہ جب وہ خودکش بمبار اس کے ساتھ لپٹا تھا تو وہ دھماکے میں زندہ بچ کیسے گئی اور وہ بھی صحیح سلامت' حیرت ہے۔

"پلیز آپ اپنا کوئی کانٹیکٹ نمبر دیں۔ آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" ڈاکٹر کی بات پہ اسے فوراً" اپنے بابا کا خیال آیا تھا اور اسے جھرجھری سی آگئی کہ اگر انہیں اس کا ریسٹورنٹ میں بے وجہ موجود ہونا' پھر دھماکے میں اڑ جانا' پھر بچ کر یوں اسپتال تک پہنچ جانا پتا چلا تو ان کی حالت و کیفیت کیا ہوگی۔

یوں بھی اس کے امتحانات ہو رہے تھے۔ پرسوں آخری پیپر تھا۔ اگر بابا کو اس واقعہ کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ اسے پیپر نہیں دینے دیں گے۔ وہ پہلے ہی اس کی وجہ سے بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ اب تو اور ہو جائیں گے اور وہ آخری پیپر نہ دے کر بہت کچھ گنوا دیتی' بہتر تھا' بابا کو خبر نہ ہی ہوتی' تب ہی اس نے بنا سوچے سمجھے نرمل کا نمبر ڈاکٹر کو لکھوا دیا جو اگلے پندرہ منٹ میں اس کے پاس تھی۔

"تم زندہ ہو رمل؟" وہ اسے بھی زندہ سلامت دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔

"ہاں... اب تک تو زندہ ہوں' لیکن اگر تم نہ ملتیں تو تمہارے' باپ نے ضرور مجھے اوپر پہنچا دینا تھا۔" رمل اس کی گمشدگی سے پہلے ہی تپی ہوئی تھی' اب تو اس کے سر ہی ہو گئی۔

"تم غائب کہاں ہو گئی تھیں بدتمیز لڑکی... سارے ریسٹورنٹ میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے مر چلی تھی میں' حتیٰ کہ ٹیبل' کرسیاں تک کھنگال ڈالے کہ شاید کسی سے چپکی ہوئی ہو۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا منحوس..." جواباً" وہ بھی بگڑی۔

"نہ تم مجھے ساتھ لاتیں' نہ وہ دھماکا ہوتا۔" اس کی بات پہ رمل چونکی۔

"دھماکا...؟ کون سا دھماکا..."

"وہ جو ریسٹورنٹ میں ہوا۔"

"وہ دھماکا نہیں فائرنگ ہوئی تھی۔ وہ بھی ہوائی۔ صرف روڈ پہ..."

"لیکن خودکش بمبار تو میرے ساتھ چپکا تھا۔" وہ اسی بات میں الجھی ہوئی تھی۔

"ارے کون سا بمبار..."

"ہیلو لیڈیز... پلیز اب آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔ مجھے بھی کچھ کام ہے۔ مجھے نکلنا ہے۔" ڈاکٹر نے تپ کر درمیان میں مداخلت کی وہ دونوں نان اسٹاپ بول رہی تھیں۔ اس بے چارے کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھیں' جو بوجہ مجبوری وہاں کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کی

بات پہ وہ دونوں تیزی سے سر ہلا کر اٹھیں۔

"پلیز خان سائیں پوچھیں تو یہ لازمی بتایئے گا کہ میں آخر تک آپ کے پاس ہی کھڑا رہا تھا۔" ڈاکٹر ماہ نور سے مخاطب تھا۔ رمل نے حیرت سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"یہ خان سائیں کون ہیں؟" ماہ نور نے جواباً کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ تب ہی رمل کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پہ شہباز محمود کا نمبر دیکھ کر رمل کے ہاتھوں' پیروں سے جان نکل گئی۔

"تمہارے بابا کا ہے۔" وہ رونی سی شکل بنا کر بولی۔

"جلدی سے کوئی بہانہ بناؤ' ورنہ دونوں کا قتل یقینی ہے۔"

"السلام علیکم انکل... انکل سوری... ہم لیٹ ہو گئے۔ ہم دونوں منگلا ڈیم پہ آئے تھے۔ گاڑی خراب ہو گئی۔ نہ... نہ پلیز گاڑی نہ بھیجنا' اب تو گاڑی ٹھیک بھی ہو گئی' بس یہاں میگا مارٹ میں ہیں۔ تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی' ابھی بس پہنچتے ہیں۔ اوکے... بائے۔" اس نے ساری بات ایک ہی سانس میں ختم کی اور فون بند کر کے ایک لمبی گہری سانس لی۔

"یار اگر بابا کو پتا چل گیا تو..." وہ سہم کر بولی۔

"ایک تو تم ڈرپوک بہت ہو۔"

"تو کیا کروں' مجھ سے یہ دوغلا پن نہیں ہوتا۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"تو یہ لو فون' بابا کو بتا دو سب۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے..."

"چھوڑو یار' میں نے اتنی بزدل لڑکی ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ لڑکیوں کو بہادر ہونا چاہیے' تاکہ لوگ انہیں شیرنیاں کہیں' شیرنیاں۔"

"یہ شیرنی تم ہی بن سکتی ہو' خوف ناک بندہ دیکھ کے میرا تو دم پہلے ہی گھٹنے لگتا ہے' میں بھلا کیسے بنوں شیرنی۔"

"پتا ہے کیا' تم نے جو خود ساختہ ڈر و خوف اندر گھسا رکھے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اتنا بزدل' ڈرپوک اور گیدڑ بنا رکھا ہے۔ اوہ... سوری گیدڑ نہیں گیدڑی۔"

آخری جملے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تو اس نے زور سے ایک مکا اس کے کندھے پہ جڑ دیا۔

"دفع ہو تم..."

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو شہباز محمود نے تیزی سے کچھ پیچھے چھپایا۔

"کیا' کیا شاپنگ کی میرے بیٹے نے؟" تکیے کے نیچے کوئی چیز چھپاتے ہوئے انہوں نے یوں ہی پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

"وہ بابا شاپنگ... شاپنگ تو رمل کو کرنی تھی۔" اس کے بوکھلائے ہوئے انداز پہ شہباز محمود نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سب خیریت ہے نا؟" بابا کی زیرک نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ ان کے پاس آن بیٹھی اور ان کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔

"بابا..."

"ہوں..."

"پرسوں میرا پیپر ہے۔"

"اور مجھے پتا ہے' مجھے ساری رات جاگنا ہے۔" شہباز محمود نے معصومیت سے کہا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔

"کتنے سیانے ہیں آپ؟" اس کی بات پہ وہ بھی ہنس دیے۔

"تم مجھے یہ بتاؤ اپنی میڈیسن لی؟" باپ کی بات پہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی' تب ہی سر جھکا دیا۔

"کتنی لیزی ہو تم مانو... ایک وقت کی دوا چھوڑنے پہ جانتی ہو تمہاری حالت کیسے ہو جاتی ہے اور تم پھر بھی سستی دکھاتی ہو۔" باپ کی ذرا سی سرزنش نے اسے نادم سا کر دیا۔

"اوکے... تم بیٹھو' میں تمہاری دوا لے آؤں اور یہ بتاؤ' چائے پیو گی یا کافی؟" انہوں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جو میرے بابا پئیں۔"

"تو پھر اسٹرونگ سی چائے چلے گی۔"

"بالکل۔" اس نے سر ہلایا تو شہباز محمود ملازم کو آواز دیتے باہر نکل گئے۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ اب انہیں کیا بتاتی کہ دوا کے بغیر ہی اس کو اسپتال جانا پڑ گیا تھا۔ تبھی اس کی نظر تکیے پہ پڑی، جس کے نیچے شہباز محمود نے اسے دیکھتے ہی کچھ چھپایا تھا۔ اس نے یوں ہی غیر ارادی طور پر تکیہ اٹھا دیا۔

نیچے سیاہ رنگ کا پستول پڑا تھا۔ یقیناً" وہ آج پھر اسے نکال کر صاف کر رہے تھے اور اسے دیکھ کر چھپا دیا کہ وہ ایسی چیزوں سے ڈر جاتی تھی۔ ڈر تو وہ اب بھی گئی تھی اس نے جھٹکے سے تکیہ پستول کے اوپر رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں کہتی ہوں بازل خان! بات مان لے میری، پینتیس برس کا ہو گیا ہے تو، تیری عمر پیچھے نہیں آگے ہی آگے جاری ہے۔ آج نہیں تو کل بڈھا ہو جائے گا۔ کیا یوں ہی بے سہارا رہ کر زندگی گزار پائے گا۔" اپنا من چاہا "موضوع" یاد آگیا تھا اور ان کے سینے کے بائیں جانب شدید درد نے پھر سے سر اٹھایا تھا۔

"دیکھ بازل! میں تیری ماں ہوں، میرے دل میں بھی تیرے لیے ارمان ہیں۔ میں تجھے سہرے میں سجا اور گھوڑی پہ چڑھا دیکھنا چاہتی ہوں، بی جان کی لجاجت سے بھرپور آواز پہ اس کے چہرے پہ تاریک سا سایہ آکر لہرایا اور وہیں ٹھہر گیا۔ آنکھوں میں ایسی سرخی اتری کہ وہیں جم کر رہ گئی۔ اس نے بہت تکلیف دہ سانس اندر کھینچی تھی۔ بی جان نے تاسف سے اسے دیکھا اور اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرنے لگی تھیں۔

"مان لے بات میری، تیرے ہی فائدے کی ہے۔"

"پلیز بی جان۔ جو بات ناممکن ہے اس کے لیے بحث کرنا بے سود ہے۔" اس کا لہجہ ترشی لیے ہوئے تھا۔ بی جان کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئیں۔

"کیوں بے وقوفانہ ضد میں لگا ہے۔ مجھے یہ بتا تو بیٹھا کس آسرے پہ ہے، جس سے تو محبت کرتا تھا، مدتوں ہوئی اس کا تو کفن بھی میلا ہو گیا۔ اب کیا قبر پہ ہی بیٹھ کے ساری رات گزارنی ہے؟" بی جان کی بات پہ وہ تڑپ ہی تو گیا تھا۔

"جو دل میں زندہ ہوتے ہیں۔ وہ کبھی مرتے ہی نہیں بی جان۔ صنوبر میرے دل میں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اس کی قبر ہی میں میری متاع حیات ہے۔"

"ہچ۔ مردوں کو زندہ کہنے والے تیرے جیسے ہی بے عقل ہوتے ہیں۔"

"پلیز بی جان۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ وہ سمجھ گئیں مگر تاسف سے بھرپور سانس لے کر اتنا ضرور کہہ دیا۔

"مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں کرتے بازل خان۔"

"یہاں کوئی زندہ ہو گا تب نا۔" اس نے اندر ہی اندر گرتے آنسوؤں کے ساتھ سوچا تھا۔ درد کی ایک اور تیز لہر جسم میں دوڑی تھی۔

"جا تجھے تیرے بابا سائیں بلا رہے ہیں۔" بی جان نے اس پتھر سے سر پھوڑنے کے بجائے ایک بار پھر چپ ہو جانا ہی بہتر سمجھا اور موضوع بدل دیا۔ وہ سر ہلاتا اٹھ گیا۔

"عادل لالہ کہاں ہیں؟"

"مظفر آباد گیا ہے۔"

"خیریت۔"

"کوئی میٹنگ تھی اس کی۔"

"کتنے دن رکیں گے وہاں؟"

"شاید ایک ہفتہ۔ نوال بھی ساتھ گئی ہے۔ دیکھ لو، بندہ شادی شدہ ہو تو جہاں چاہے بیوی کو لے کر گھومے پھرے۔" بی جان کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے بات گھما پھرا کر پھر سے شادی پہ لے آئی تھیں۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ بی جان مایوس ہو گئیں۔

"پتا نہیں، میں کب وہ دن دیکھوں گی۔" دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ماں کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ بابا سائیں کے پاس آیا تو انہوں نے ایک چمکتا دمکتا بنڈل اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے بابا سائیں؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"یہ اپنے کشمیر کی چند خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔"

"تو...؟"

"تمہارے لیے منگوائی ہیں۔" انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

"کس لیے؟" اس کے ماتھے پہ ایک ساتھ کئی بل پڑے۔

"تم بچے نہیں ہو بازل خان۔" زیان خان نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کہا تو اس سے چپ نہ رہا گیا۔

"یہاں کوئی بھی بچہ نہیں ہے بابا سائیں۔"

"بے شک... گئے وقت کو کوئی واپس نہیں بلا سکتا۔"

"آنے والے وقت کو تو تھاما جا سکتا ہے نا۔"

"تم فضول ضد کرتے ہو۔"

"معذرت بابا سائیں۔ آپ جانتے ہیں صنوبر کے بعد میں کسی کو بھی اپنا نہیں سکتا۔"

"صنوبر تو عرصہ ہوا مر بھی گئی۔"

"مری نہیں، ماری گئی۔" اس نے تصحیح کی۔

"اس کا جرم ہی ایسا تھا۔"

"صرف دوستی نبھانا اتنا بڑا جرم ہے کیا؟"

"صرف دوستی نہیں، ہماری نسل کو داغ لگانے کی بھی اس نے کوشش کی تھی۔"

"بابا! یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، افشین آپی نے خود محبت کی تھی۔ صنوبر نے انہیں محبت کرنے پہ مجبور نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ افشین اور سفیان کی ملاقاتوں کی عینی گواہ تھی۔"

"نام مت لو اس ذلیل، کتے انسان کا۔" زیان خان کا سفید چہرہ غصے کی شدت سے بھڑک اٹھا تھا۔ ایسی ہی سرخیاں بازل خان کے چہرے پہ پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہم نے جو کیا اپنی نسل، اپنا خاندان اور اپنے نسب کو بچانے کے لیے کیا۔"

"آپ افشین اور سفیان کو قتل کروا دیتے، لیکن صنوبر کیوں؟" وہ بے بس ہوا۔ آواز کانپ گئی۔

"افشین نے ہمارے خاندان کا نام ڈبونے کی کوشش کی اور صنوبر نے اس کا ساتھ دیا۔ جتنا جرم افشین کا تھا اتنا ہی جرم صنوبر کا بھی تھا۔"

"میں آج بھی کہتا ہوں بابا سائیں! آپ لوگوں نے افشن اور صنوبر کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"بکواس بند کرو۔ وہ ہمارا حسب نسب ڈبونے پہ لگی تھیں اور ہم ان کے ساتھ بہتری کرتے۔ تم میرے سپوت ہو بازل، زیان خان کے، کیا تمہیں خاندان کی عزت، اپنے باپ، دادا کی عزت عزیز نہیں؟" زیان خان کی چنگھاڑتی آواز پہ وہ کچھ بول نہ سکا۔

بے شک وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ اتنے اعلا خاندان کی بیٹی ایک گھٹیا خاندان کے لڑکے کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام بنا رہی تھی اور اس کی سہیلی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ ان کا جرم واقعی ناقابل معافی تھا لیکن یہ دل... دل بہت بے ایمان تھا۔ جو اس سہیلی "صنوبر" کے پیار میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس میں کسی اور کی گنجائش تھی نہ جگہ، پھر کیسے وہ بی جان اور بابا سائیں کی بات مان لیتا۔

"بازل خان! بہتر ہے تم شادی کا فیصلہ خود کر لو، ورنہ مجبوراً مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔" زیان خان بے حد سنجیدہ تھے۔

"آئم سوری بابا سائیں۔ آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" اس نے بھی آرام سے کہہ دیا۔

"میں مجبور ہوں۔ مجھے عادل کے برابر تمہیں بھی حصہ دینا ہے، مگر تمہاری شادی کے بعد...."

"اور میں بھی مجبور ہوں، میں نے صنوبر کو قول دیا ہوا ہے۔"

"تمہیں زندہ لوگوں کے بجائے مرے ہوئے لوگوں کو دیے گئے قول زیادہ عزیز ہیں۔"

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" زیان خان اسے دیکھ کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

رات آئی بھی اور گزر بھی گئی۔ ساری رات دل بھرا

رہا اور آنکھ روتی رہی۔ بیڈ پہ پڑے صنوبر کے تمام خط بولتے رہے' گئے وقت کی باتیں بتاتے رہے اور اسے بے حساب رُلاتے رہے۔ وہ اس کی بچپن کی دوست تھی۔ اس کی ہم راز' ہر چیز میں' ہر کھیل میں اس کی ساتھی۔ بڑی ہوئی تو اس کے ساتھ کی تمنا جاگی۔ لیکن برے وقت نے برا کیا۔ کسی کی سزا اس کا بھی مقدر بن گئی۔ سہیلی کا ساتھ دیتے دیتے اپنی جان گنوادی اور ساتھ اس کی جان بھی لے گئی۔

☆ ☆ ☆

''وہ نالائق کہاں ہے؟'' صبح منشی زمینوں کے کاغذات لے کر اندر آیا تو بابا سائیں کو کھد بد لگ گئی۔

''سو رہا ہے۔'' بی جان نے کاغذوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''دن کے گیارہ بج گئے ہیں۔''

''میں نے دو' تین بار باہر بلایا' مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''اس سے کہو منشی آیا ہے۔''

''وہ پھر بھی نہیں آئے گا۔''

''میں اس ضدی لڑکے سے عاجز آچکا ہوں۔'' وہ تپے۔ ''اس سے کہو' کل ہماری زمینوں کا فیصلہ ہے۔ میرے کہے بنا خاموشی سے عدالت چلا جائے۔''

''آج تو اس نے اپنی عدالت لگا رکھی ہوگی۔'' بی جان نے گہری سانس لی۔

''عجیب انسان ہے۔ لوگ دس دس عورتیں ایک ساتھ رکھ لیتے ہیں اور یہ ایک ہی عورت کے پیچھے مر رہا ہے۔''

''اور وہ بھی مری ہوئی عورت کے پیچھے۔'' بی جان نے تصحیح کی اور منشی سے کاغذات لے کر پڑھنے لگیں۔ ذیان خان نے غصے سے لب بھینچ لیے۔

''تم شادی کیوں نہیں کرلیتے۔'' اس کا بکھرا حلیہ دیکھ کر تخت پہ بیٹھی زمر آپا نے گویا اس کی مشکل کا حل نکالا تھا۔

''آپ سب جانتی ہیں۔'' سوجی اور دکھتی آنکھوں کو اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اندر کی جانب دبایا۔

''دیکھ میرے بھائی' گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ صنوبر کی موت کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی' یہ ہم سب جانتے ہیں....''

''وہ بے قصور تھی۔'' زمر آپا کی بات کو اس نے راستے میں ہی روک دیا۔

''یہ تم کہتے ہو ورنہ اس کا قصور افشین جتنا ہی تھا۔ اس نے افیشن کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ اسے بھاگنے کے لیے اپنا برقعہ تک دیا۔ پھر تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ بے قصور تھی؟''

وہ کچھ بول نہ سکا۔

''وہ بے قصور نہیں تھی بازل خان۔ ہمارے جو ریت رواج ہیں' وہاں یہی قصور اصل جرم ہوتا ہے۔ بابا سائیں نے حکم دیا۔ عادل اور شایان نے اس آدمی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ سارے خاندان کو خبر ہوگئی۔ پھر کیسے وہ اپنی قصوروار بیٹی کو چھوڑتے۔ اسے زندہ رہنے دیتے اور جب بیٹی کا بھی گلا کاٹ دیا تو اس کی ساتھی کو زندہ رکھ کر وہ آستین کا سانپ کیسے پالتے۔'' زمر آپا کے کھردرے لہجے پہ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ (بات سچ تھی' مگر بے ایمان دل تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔) دل اب بھی بے قرار تھا۔ اس مرے ہوئے وجود کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اندر محبت سانس لیتی تھی تو باہر وہ جیتا تھا۔

''لڑکیاں تو سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ دیکھیں سائیں! یہ کتنی خوب صورت ہے۔ میرے بازل کے ساتھ بیٹھی کتنی جچے گی۔'' بی جان ذیان سائیں کے پاس ساری تصویریں پھیلائے بیٹھی شوق سے دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں' واقعی....''

''یہ تصویر بازل نے دیکھی؟'' انہوں نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔''

"کیا مطلب؟" بی جان نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "آپ تو کہہ رہے تھے "آج اسے منا کر ہی رہیں گے؟"

"وہ لکیر کا فقیر ہے حاجرہ بیگم۔"

"اس کی طبیعت آپ پہ گئی ہے۔" انہوں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"اس کی محبت کا قتل ہم پہ واجب تھا۔ جب ہم نے اپنی سگی اولاد کو نہیں بخشا تو وہ تو پھر غیر تھی۔" سائیں کا لہجہ دہکتا ہوا تھا۔ سگی اولاد کے لیے بھی ترس کی گنجائش نہ تھی۔

"آہ۔" بی جان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میری جھلی بٹی۔" انہوں نے سوچا۔

"حاجرہ بیگم ہمارے لیے محبتوں سے زیادہ خاندان کی عزت اہمیت رکھتی ہے۔ خاندان پہ حرف آئے ہم میں سے کسی کو قبول نہیں۔" انہوں نے اپنے مخصوص بھاری و کڑک لہجے میں کہا تو حاجرہ بیگم چپ چاپ انہیں دیکھ کر رہ گئیں کہ یہ سخت جان، سخت دل لوگ نہ جانے کیسے پتھر تھے۔ جن کے لیے خاندان کا نام اور مقام سگی اولاد سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ حاجرہ بیگم خود بھی تو اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ افشین کی یاد بھی کبھی انہیں بے چین کرنے آجاتی تھی، لیکن خاندان کی عزت کا خیال انہیں بے سکونی اور بے چینی سے بچالیتا تھا۔ اب بھی جلد ہی وہ اس کیفیت سے نکل آئیں۔

"میں یہ تصویریں خود بازل کو دکھاؤں گی' ایک اور کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

✡ ✡ ✡

وہ دن برا تھا یا حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ صبح ہی

صبح ڈرائیور کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس نے اسے زحمت دینے کے بجائے گھر کے اندرونی کام کرنے والے ملازم کو اسکول چھوڑنے کو کہا تھا۔ ملازم نے لاکھ کوشش کی، مگر اس سے گاڑی اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ اس کا آج آخری پیپر تھا۔ اسکول پہنچنا ہر صورت لازمی تھا۔

"لگتا ہے چھوٹی بی بی! ڈرائیور کی طرح آج گاڑی کی طبیعت میں بھی گڑبڑ ہے۔" ملازم نے دانت نکوستے ہوئے کہا تو وہ روہانسی سی ہو گئی۔ ملازم نے اسے بیک ویو مرر سے دیکھتے ہوئے فوراً "پینترا بدلا۔

"آپ ایسا کریں بڑے صاحب جی کو جگا لیں' وہ آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔"

"نہیں نا فیفی! بابا ساری رات میرے ساتھ جاگتے رہے ہیں۔ اب جا کے ان کی آنکھ لگی ہے تو میں کیسے انہیں اٹھا دوں۔" وہ دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹتی بے حد پریشان اور روہانسی ہو رہی تھی۔

"آپ بھی تو چھوٹی بی بی "کمال کرتی ہیں۔ پڑھنا آپ نے ہوتا ہے اور جاگنا بڑے صاحب کو پڑتا ہے۔ ایسا بھی کیا ڈرنا۔ آپ سوتے ہوئے صاحب جی کے پاس بیٹھ کر بھی تو پڑھ سکتی ہیں۔"

"یہ کہنا آسان ہے فیفی۔ تم سب جانتے ہو' اندھیرے سے مجھے کس قدر خوف آتا ہے اور رات تو میرا دم بند کرنے لگتی ہے۔ ایسے میں اگر بابا بھی میرے ساتھ نہ جاگیں تو میں کیسے زندہ رہوں۔"

"چھوڑیں بی بی جی! یہ آپ کا وہم ہے۔ رات باہر ہوتی ہے' اندھیرا باہر ہوتا ہے' آپ اندر۔ دروازے کھڑکیاں بند۔ اور سب سے بڑھ کر بڑے صاحب آپ کے پاس۔ پھر کاہے کا ڈر۔"

وہ جانتی تھی گھر کے ملازم اس سے چوری چھپے اس کے ڈرنے کا مذاق اڑاتے ہیں' لیکن ہمت نہیں کر پاتے کہ اس کے سامنے ہنسیں۔ آج فیفی کے منہ سے نکل گیا تو وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اکیلے میں یا اندھیرے میں اس کی خوف کے مارے جو حالت ہوتی تھی "اس حالت کی وہ خود ہی گواہ تھی یا اس کے بابا۔ اور اس کے بابا کو پوری امید تھی کہ وہ جیسے جیسے بڑی ہو گی۔ اس کا خوف خود بخود جاتا رہے گا' لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بہادر بننے سے پہلے ہی وہ "دمہ" جیسی بیماری کو بھی اپنا لے گی اور یہ بیماری لگتے ہی اس کے باپ نے

پہلے سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنا شروع کردیا تھا۔ لیکن بیماری تھی کہ علاج کے باوجود ختم نہیں ہو پارہی تھی۔

اب حالات ایسے تھے کہ امتحانات کے وجہ سے اسے ساری رات جاگ کر پڑھنا پڑتا تھا۔ ایسے میں کئی بار اس کی حالت خراب ہوئی تھی تو اس کے باپ نے بھی اس کے ساتھ جاگ کر رات گزارنا فرض سمجھ لیا۔

آج اس کا آخری پیپر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی وجہ سے اس کے بابا بہت بے سکون رہے ہیں، لیکن اس نے عہد کرلیا تھا کہ آج کے بعد وہ ان پہ کبھی اپنا خوف ظاہر نہیں کرے گی۔ انہیں سکون دینے کی کوشش کرے گی، یہ ارادہ کرتے ہوئے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے بعد سکون کسے ملنے والا ہے اور بے سکونی کسے.... اور اب صبح ہی صبح پہلی بے سکونی خراب گاڑی کی صورت میں اسے مل ہی چکی تھی۔

"فیضی! میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ تم ایسا کرو گیٹ بند کرلو۔ میں کسی ٹیکسی یا رکشے سے اسکول چلی جاتی ہوں۔" ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہی وہ تیزی سے گاڑی سے نکلی اور بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گئی کہ اب مزید وقت برباد کرنا سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ تھا۔

"لیکن چھوٹی بی بی! بڑے صاحب...." فیضی نے کچھ کہنا چاہا، جواباً اس نے ہاتھ اٹھایا۔

"تم نہیں کچھ مت بتانا۔ مجھے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ تم گیٹ بند کرلو۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی اور اوپر کمرے میں گیٹ بند ہونے کی آواز سن کر شہباز احمد نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ سامنے لگے کیلنڈر پہ سترہ مارچ پہ سرخ پنسل سے گول دائرہ لگا دیکھ کر ایک پل کے لیے ان کے دل کو کچھ ہوا تھا، لیکن اگلے ہی پل انہوں نے ہاتھ مار کر اپنے تکیے کے نیچے سے سیاہ رنگ کا پستول نکال کر اپنی آنکھوں کے سامنے کرلیا تھا۔ پستول دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا تھا۔

اسے نہ تو کوئی ٹیکسی ملی تھی اور نہ ہی کوئی اور سواری، وہ بھاگنے کے انداز سے چلتی بس اسٹاپ کی طرف جارہی تھی۔ اسکول پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹہ تو لازمی لگ جاتا اور اگر وہ پیدل چلتی تو گھنٹے بھر کا سفر تھا۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ رک کر کسی سواری کا انتظار کرے یا یوں ہی پیدل چلتی رہے۔ اس کے کندھے پہ شولڈر بیگ، جبکہ ہاتھ میں کلپ بورڈ اور کتاب تھی۔ بے حد عجلت میں وہ موبائل بھی اٹھانا بھول گئی تھی۔

اب تیز تیز چلتے ہوئے اچانک ہی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پیچھے دیکھنے کے بجائے اپنے قدموں کی رفتار اور تیز کرلی تو پیچھے سے چلتے قدموں نے بھی تیزی اختیار کرلی۔ وہ جتنا تیز چل رہی تھی، پچھلے قدم بھی اسی رفتار سے چل رہے تھے۔ اس نے کن اکھیوں سے پیچھے دیکھنا چاہا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے کندھے کے بالکل اوپر کسی مرد کا ہاتھ آچکا تھا۔

بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس چیخ کے ساتھ ہی اس کی مزید چیخیں بلند ہوئیں، جب ہاتھ اس کے شولڈر بیگ پہ پڑا تھا اور اس غنڈے نے اس کا بیگ اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

وہ خوف کے مارے وہیں کھڑے ہو کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر چیخے جارہی تھی۔ تب ہی کسی نے اس کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اسے چپ ہونے کو کہنا چاہا تھا اور وہ چیخیں مارتی ہوئی اگلے کے کندھے سے جالگی تھی۔ وہ بندہ وہیں حق دق رہ گیا تھا۔

اسکول کے سفید یونیفارم میں ملبوس کھلے بالوں والی لڑکی کا وہ چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا اس صورت حال سے وہ خود گھبرا گیا تھا کہ وہ لڑکی اس کے کندھے سے لگی ابھی بھی بس چیخے ہی جارہی تھی۔

"ری لیکس... ری لیکس ... پلیز..." اس نے ہاتھ بڑھا کر اس لڑکی کو خود سے پرے کرنا چاہا تھا لیکن وہ اور مضبوطی سے اس سے چپک گئی۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس کے ماتھے پہ ایک ساتھ کئی لکیریں

ابھریں۔

"پلیز... خود پہ کنٹرول کریں، مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟" دائیں بائیں جو اکا دکا لوگ آجا رہے تھے۔ رک کر دیکھنے لگے۔ بازل خود پہ بمشکل کنٹرول رکھ کر بولا تھا۔

لیکن وہ تھی کہ بس چیخے ہی جا رہی تھی۔

"بس کردیں پلیز... اور بند کریں یہ چیخ و پکار... حد ہوتی ہے کوئی۔" بھاری لہجے کی گرج نے ماہ نور کو جھٹکے سے پیچھے ہونے پہ مجبور کیا تھا۔ تب ہی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے اسے دیکھا تھا۔ لمبا چوڑا سرخ و سفید رنگت والا وہ مرد اسے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اس نے ذہن پہ زور دینا چاہا کہ وہ کون ہے، تب ہی اس کی نظر اس شخص کے گلے میں لٹکتے سیاہ تعویذ پہ پڑی تو وہ چونک پڑی۔

"خود کش... بمبار..." اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ بے ساختہ دو قدم اور پیچھے ہوئی۔ جھٹکے سے آگے دیکھا، پھر پیچھے اور پھر اگلے ہی پل سامنے وہ دوڑ لگائی کہ الاماں...

بازل خان کا غصے کے مارے چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ وہ پہچان چکا تھا کہ یہ لڑکی وہ ہی ہے، جو ریسٹورنٹ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس نے نیچے سڑک پہ پڑے چھوٹے سے پتھر کو زور سے ٹھڈا مارا۔ (یہ اس کے غصے کا ردعمل تھا۔) اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا جو اس نے اس لڑکی کو چیخیں مارتے ہوئے دیکھ کر جھٹکے سے روک دی تھی۔ اس نے پیچھے کی جانب بھاگتے ایک شخص کو دیکھا تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک شولڈر بیگ تھا۔ یقیناً" اس نے وہ اسی لڑکی سے چھینا تھا۔ وہ اس شخص کے پیچھے بھاگ کر اس سے وہ بیگ چھین ہی لاتا اگر یہ لڑکی اس کے پوچھنے سے پہلے ہی اس سے ایک بار پھر چمٹ نہ جاتی۔ ایسے میں وہ چور بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور اب یہ لڑکی بھی بھاگ نکلی۔

اسے خود پہ غصہ آیا کہ اس نے اتنے ضروری کام سے جاتے ہوئے یہاں بیچ راستے میں گاڑی کیوں روکی اور خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

بابا سائیں نے اسے وقت پہ عدالت پہنچنے کو کہا تھا اور اب اتنا وقت نکل گیا تھا۔ آج بابا سائیں کی کچھ زمینوں کا فیصلہ تھا اور بابا سائیں اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے عدالت حاضر نہیں ہو سکتے تھے اور بڑے بھائی عادل مظفر آباد گئے ہوئے تھے، جن کی واپسی آج ہی متوقع تھی۔ تب ہی ناچار اسے ہی آنا پڑا تھا۔ حالانکہ وہ نہیں آنا چاہ رہا تھا کہ مخالفین کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھے گا اور ایسے میں جو اگر وہ خود پہ کنٹرول نہ رکھ سکا تو پھر... پھر خون بہاتے دیر نہیں لگتی۔ اس کا ایک دم جی چاہا واپس پلٹ جائے۔ اگلی تاریخ پہ بابا خود حاضر ہو جائیں گے لیکن یہ بھی ناممکن تھا کہ بابا کو دل کا عارضہ لاحق تھا اور وہ ان دنوں نئے نئے اسپتال سے لوٹے تھے اور بیڈ ریسٹ کر رہے تھے اور چونکہ فیصلے کی تاریخ تھی۔ سو بہتر تھا وہ عدالت میں حاضر ہو ہی جاتا۔ اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی جیپ اسٹارٹ کرلی۔

☆ ☆ ☆

عین اسی دن حویلی میں بھونچال اس وقت آیا جب ظہر کی اذانوں کے تھوڑی دیر بعد ہی عادل خان اور شایان خان نماز پڑھنے کی غرض سے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے سیاہ کرولا سے کئی گولیاں آکر انہیں وہیں گرا گئیں۔ عادل تو موقع پر ہی دم توڑ گیا جبکہ شایان نے اسپتال کی راہداری میں پہنچ کر موت سے ہاتھ ملایا تھا۔

حویلی میں خبر پہنچی تو بڑے سائیں ذیان علی خان نے وہیں سینہ پکڑ لیا۔ دل کا عارضہ پہلے ہی سے لاحق تھا۔ اب کی بار اس کا وار آخری ثابت ہوا اور خالی نہ گیا۔ دل کے دورے نے بڑے سائیں کو بھی ابدی نیند سلا دیا۔ حویلی پہ گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔

حویلی میں ایسی قیامت بپا تھی کہ کسی کو بھی اس خاندان کے نظر نہ آنے والے آخری مرد کا خیال نہیں

رہا تھا۔ وہ تو جب فون بجا اور کسی نوکر نے اٹھا کے پوچھا۔

"بازل سائیں! آپ تو زندہ ہیں نا؟" نوکر نے جس تجسس سے پوچھا تھا۔ بازل اس کے انداز پہ ٹھٹک سا گیا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔" اس نے جواباً غصے سے پوچھا تھا۔ نوکر فوراً" سیدھا ہو گیا۔ "میرا مطلب ہے چھوٹے سائیں! اس حویلی میں تو قیامت آگئی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"چھوٹے سائیں! اعاول سائیں' شایان سائیں اور بڑے سائیں سب ایک ساتھ چلے گئے۔ سب ختم ہو گئے۔ مر گئے ہیں سب۔"۔۔۔ بازل کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر دور جا گرا۔ اسے لگا اس کی بھی بس آخری سانسیں ہیں۔

☼ ☼ ☼

صبح کے حالات کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اسکول پہنچ گئی تھی۔ پیپر تو شروع ہو چکا تھا' لیکن اس کی منت سماجت کام آئی اور اسے بھی بٹھا لیا گیا' لیکن باقی کا سارا دن اس کا بے چینی ہی میں گزرا تھا۔ ڈرائیور بعد میں گاڑی ٹھیک کرا کے لے آیا تھا۔ ڈرائیور کو دیکھتے ہی وہ چراغ پا ہو گئی کہ اگر صبح گاڑی ٹھیک ہوتی تو اس کے ساتھ صبح والا واقعہ پیش کیوں آتا۔ ڈرائیور نے اس کی پھٹکار چپ چاپ سن لی تھی۔ وہ گھر پہنچی تو لاؤنج کا شیشے کا دروازہ دھکیلتے ہی اندر سے آتی اگر بتیوں کی تیز خوشبو نے اس کی سانسوں کو وہیں روک دیا۔ ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ پہ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ سامنے سے آتے فیضی (ملازم) کو اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ فیضی کے چہرے پہ بھی پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔

"آج کوئی خاص بات ہے؟" اس کے لب ذرا سا ہلے تھے۔

"آج چھوٹے صاحب کی برسی ہے۔" ملازم فوراً" بتا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی لاؤنج کے صوفے پہ آ بیٹھی۔ فیضی کی بیوی جو کچن میں

غریبوں کے لیے کھانا بنانے میں مصروف تھی' اسے دیکھتے ہی باہر نکل آئی۔

"چھوٹی بی بی! پانی لے آؤں؟"

"بابا اپنے کمرے میں ہوں گے؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ دن اس کے باپ کے لیے موت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اس دن سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں' باہر نہیں نکلتے' کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ سارا دن روتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔

تب ہی اس نے مرے لہجے میں ملازمہ سے پوچھا تو جواباً" اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں جی! بڑے صاحب تو صبح سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔"

"لیکن آج تو۔۔۔"

"شاید وہ چھوٹے صاحب کی قبر پہ گئے ہوں۔" وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

اسے وہ دن شدت سے یاد آیا' جب پانچ سال پہلے شہباز محمود اپنے بیٹے کے مجبور کرنے پہ اس کی کلاس فیلو افشین کا رشتہ لے کر زیان خان کے گھر گئے تھے۔ وہ بھی بابا کے ساتھ تھی۔ وہاں زیان خان نے انہیں نچلی ذات کا طعنہ دے کر دھتکار کر گھر سے نکالا تھا اور پھر جب اس کے بھائی سفیان کو باپ کی اتنی تذلیل کا پتا چلا

تو اس نے جذباتی قدم اٹھایا۔ اور عین اس وقت جب وہ لڑکی لے کر بھاگ رہا تھا ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا تھا اور پھر ٹوکے سے اس کے ہزاروں ٹکڑے کر کے شہباز محمود کے گھر پہنچائے تھے۔ اپنے بیٹے کی ناقابل شناخت لاش دیکھ کر شہباز محمود بلبلا اٹھے تھے لیکن ان لوگوں کی طاقت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ شہباز محمود اکیلے تھے اور وہ پورا خاندان۔ یہ پانچ سال شہباز محمود نے کس قدر اذیت اور تکلیف میں گزارے تھے۔ یہ بات صرف وہی جانتی تھی۔ ہر سال جب یہ دن آتا شہباز خون کے آنسو روتے۔ اپنی بے بسی پہ تڑپتے اور وہ باپ کو تڑپتا دیکھ کر خود تڑپ جاتی۔

"چھوٹی بی بی... چھوٹی بی بی... یہ پانی پئیں پلیز۔" اسے اچانک سے ملازمہ نے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ چونک پڑی۔

"آپ کا سانس پھولنے لگا ہے۔ آپ ان ہیلر لے لیں۔" اور اسے ملازمہ کے بتانے پہ احساس ہوا کہ اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے، جبکہ سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیے تو ملازمہ نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کی کوئی بھی دوا وہاں نہیں تھی۔ تب ہی وہ اندر کی طرف بھاگی اور دوڑتے ہوئے لا کر ان ہیلر اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ ذرا سا پر سکون ہوئی تو ملازم نے اس کا بجتا ہوا سیل فون لا کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ملازم کو دیکھا۔

"بڑے صاحب ہیں۔" اس نے فون پکڑ کر کان سے لگایا تو ملازم، ملازمہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔

"بابا۔" ابھی اس نے باپ کو پکارا ہی تھا کہ دوسری طرف سے شہباز محمود کا جان دار قہقہہ برآمد ہوا۔ وہ حیران ہوئی کہ آج تو بھائی کی برسی تھی۔ آج کا دن تو شہباز محمود کے لیے ماتم کا دن تھا۔ وہ تو یہ سارا دن روتے ہوئے گزارتے تھے پھر آج اور ابھی یہ اس نے کیا سنا تھا۔ وہ ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، کیوں؟ اور اس کا جواب اسے اگلے چند ثانیوں میں ہی مل گیا۔

"مانو، میری پیاری مانو، تمہیں مبارک ہو، مبارک ہو بیٹا۔"

"بابا... آپ خیریت سے ہیں۔" معصوم دل باپ کا جوش سے بھرا لہجہ سن کر بجائے خوش ہونے کے سکڑنے لگا اور ایک شبہ سا بھی گزرا کہ شاید اس کے باپ کا دماغ چل گیا ہے۔

"آج ہی تو خیریت ہوئی ہے۔ میں آج ہی تو ٹھیک ہوا ہوں۔" باپ کی بات پہ وہ الجھی ہی تھی کہ اس کے باپ نے اگلے ہی لمحے اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی۔

"تم خوشیاں مناؤ مانو، آج تمہارے بھائی کا بدلہ میں نے چکا دیا۔ آج میرے بیٹے کے قاتل بھی اوپر چلے گئے۔" باپ نے پھر سے زور کا قہقہہ لگایا تھا۔ اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"بابا! آپ نے... آپ..." مارے غم، دکھ کے اس سے بات بھی مکمل نہ ہو پائی اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

"ہاں... ہاں... میں نے... شہباز احمد نے، آج اپنے بیٹے کا حساب برابر کر دیا۔ اس کے قاتلوں کو قتل کر دیا۔" باپ کے کھنکتے لہجے پہ ماہ نور کے اندر خوف کی ایک تیز سی لہر دوڑی تھی اور اس کا لہجہ بھی کانپ سا گیا۔

"نہیں، بابا! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ ظالم ہیں۔ سفاک ہیں۔ آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے بابا۔"

"شہباز احمد کسی سے نہیں ڈرتا اور ڈرے بھی کیوں، اس کے پاس کون سا جوان بیٹا ہے جسے وہ مارنے آئیں گے، جس کے قتل کی وہ دھمکیاں دیں گے۔" اب کی بار شہباز احمد کا لہجہ ذرا سا لڑکھڑایا تھا یا شاید رندھا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل شہباز احمد نے اس پہ فوراً" قابو پایا تھا۔

"میرا جوان بیٹا تو آج وہاں اوپر بیٹھا خوش ہو رہا ہو گا۔ مجھے داد دے رہا ہو گا۔ مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا، یہ میں نے لمحوں میں کیا سے کیا کر دیا۔ میں نے کیسے

ان لوگوں کو ڈھیر کر دیا۔" ان کے ایک ایک لفظ سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

"بابا پلیز! آپ گھر آئیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ خوف سے کانپ کر رہ گئی۔ ہراساں نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ جواباً" شہباز احمد نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"میں گھر ہی آرہا ہوں مانو۔ تم ملازموں سے کہو' وہ ڈھول تاشوں کا انتظام کریں۔ آج میری حویلی میں سفیان کا ماتم نہیں بلکہ اس کے قاتلوں کی موت کا جشن منایا جائے گا۔ آج ان ظالموں نے موت کا منہ دیکھا ہے' میں ان کی موت پہ خود ناچوں گا۔" شہباز احمد یقیناً" خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ جب ہی تو خوف و ہراس میں گھری ماہ نور نے انہیں ہوش میں آنے کو کہنا چاہا تھا۔ لیکن چاہنے کے باوجود اس کے گلے سے آواز نہیں نکل سکی تھی اور اس کی آواز نکلنے سے پہلے دوسری طرف سے آتی آواز نے اس کے کان وہیں سن کر دیے۔

خوشی سے جھومتے اور پاگل ہوتے شہباز محمود یہ بھول گئے تھے کہ وہ اس وقت گاڑی میں بیٹھے ہیں اور گاڑی بھی خود ڈرائیو کر رہے ہیں۔ اپنے حال میں مست وہ آگے سے آتی بڑی گاڑی کو دیکھ نہ پائے اور اک چیخ نے ان کو بھی اپنے بیٹے کے پاس بھیج دیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن عدالتی فیصلہ تو نہ ہو سکا' البتہ آسمانی فیصلہ ہو گیا۔ بازل خان افغاں' خیراں حویلی پہنچا تھا اور گھر میں رکھے تین جنازے دیکھ کر جیسے پتھر سا ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا باپ کو دیکھے بھائی کو یا پھر بہنوئی کو اور روئے تو پھر کس کو۔

وہ مرد تھا اور مرد کی آنکھ میں آنسو آجائے' یہ اس کی مردانگی کے خلاف ہے' لیکن جہاں بات خون کے رشتوں کے بچھڑنے کی ہو وہاں مردانگی کو سنبھال کر رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تین لاشیں دیکھ کر اس کے اندر خون کے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ دھاڑیں مار کر رو دیتا جو اگر مضبوط حواس کا نہ ہوتا۔ اس کی ماں نے اسے دیکھا تو تڑپ کر اس کے چوڑے سینے سے آ لگیں اور ماں کے ساتھ لگتے ہی اس کا بھی بہانا چل گیا۔ اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ بیوہ ہوئی بہن نے سامنے کھڑے بھائی کو دیکھا تو وہ بھی بھائی سے لپٹ گئی اور بھابھی کو تو ہوش ہی نہیں تھا' وہ عادل کی لاش کے پاس ہی بے ہوش پڑی تھیں۔ عورتیں ان پہ پانی چھڑک چھڑک کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

جنازے کے وقت بہت سے لوگوں سے اس نے مسجد والا واقعہ سنا تھا اور کسی عینی شاہد نے بتایا تھا کہ گاڑی سے فائرنگ کرنے والا — ادھیڑ عمر کا مرد تھا اور اس مرد کا ناک نقشہ سن کر اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کون تھا۔

"یہ کام شہباز احمد کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔" رات بی جان نے کہا تو اس کا یقین کامل ہو گیا۔

"تم اب کیا کرو گے بازل؟" ماں نے اسے امید سے دیکھا تھا۔ وہ جھک گیا۔

"حکم بی جی۔"

"خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تمہیں یہ بدلہ چکانا ہے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" اس نے اک عزم سے مضبوط لہجے میں کہا اور کھڑکی کے پار کھڑی قسمت نے سکون سے سوچا تھا کہ خون کا بدلہ تو آج مکمل ہوا تھا اور یہ ظالم لوگ کیا عزم کر رہے تھے اور اب قسمت میں کیا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے باپ کی لاش دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ روئے تو کیسے۔ چیخیں مارے' سسکے یا بین کرے؟ بھائی کے بعد اب باپ کو بھی خود سے بچھڑتا دیکھ کر وہ اندر سے ڈھے سی گئی تھی۔ بس یونہی مردہ نگاہوں سے باپ کا چہرہ دیکھتی اور اپنے ہاتھوں سے چھوتی رہی۔ اس کے آنسو بہتے رہے۔ پیدا ہوتے ہی اس نے ماں کو

کھو دیا تھا اور بڑی ہوئی تو بھائی چلا گیا اور اب باپ نے بھی اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ جتنا روتی کم تھا اور اب اسے ساری زندگی ہی رونا تھا کہ وہ مسکین، یتیم اور بے آسرا ہو گئی تھی۔ باپ کے جنازے کے وقت وہ رو، رو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور جب ہوش آیا تو غش پہ غش کھانے لگی تھی۔ گھر پہ صرف ملازم تھے۔ رشتہ دار کوئی تھا نہیں۔ جو اسے سنبھالتا۔ سب ملازم اس کی حالت دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ اسے نہ کچھ ہو جائے۔ کسی نے ڈاکٹر بلایا تھا اور سکون آور انجکشن لگتے ہی وہ بے سدھ ہو گئی تھی۔

اور جب ہوش آیا تھا تو خالی گھر دیکھ کر وہ اندر سے خالی ہو گئی تھی۔ جس ملازم کے جو چیز ہاتھ لگی تھی، وہ لے کر بھاگ گیا تھا۔ گھر میں، نہ گاڑیاں تھیں اور نہ زیور اور قیمتی اشیا، گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ لاؤنج میں شہباز محمود کی تصویر دیکھ کر وہ پھر سے ڈھے گئی تھی۔ روتے روتے وہ پھر۔ بے ہوش ہو جاتی جو اگر اس کے کان کے پاس کوئی عجیب سی چیز نہ آن ٹھہرتی۔ اس نے روتے روتے یونہی سر اٹھا کر دیکھا تھا اور اپنے سر پہ موت کا فرشتہ دیکھ کر اس کی سانسیں رک گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے اس کی کنپٹی پہ رکھ دیا تھا۔

"شہزاد محمود کہاں ہے؟" کڑک۔ لہجہ گرجتا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ سامنے وہی "خود کش بمبار" کھڑا تھا۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

"وہیں کھڑی رہو۔ اب ایک قدم بھی پیچھے ہوئیں تو تمام کی تمام گولیاں تم پہ انڈیل دوں گا۔" بھاری لہجے میں جو دھمکی تھی، وہ اس کی روح نکالنے کے لیے کافی تھی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ بازل نے بھنویں اچکا کر اس سے پھر پوچھا تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں، شہباز محمود کہاں ہیں۔" وہ تھر تھر کانپتی ہراساں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بولتی ہے یا...؟" بازل نے بے حد مشتعل ہو کر ٹریگر پر زور سے انگلی ماری تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"وہ... وہ نہیں...." وہ ساتھ نفی میں بھی گردن ہلانے لگی۔

"اگر وہ اس وقت گھر پہ نہیں تو پھر کہاں ہے وہ؟" اب بھی اس کا لہجہ وہی سختی لیے ہوئے تھا۔ اس کے آنسو نکل آئے اور ساتھ وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتی گئی۔

"میں کہہ رہا ہوں، بتاؤ وہ کہاں ہے؟" اس نے بے حد غصے سے اسے بالوں سے پکڑنا چاہا تھا۔ ایسے میں جھٹکے سے وہ اس کے قریب ہوا تھا کہ وہ روتے ہوئے اس کے سینے سے آن لگی۔ اس کی سانسیں وہیں تھم گئیں۔ وہ حق دق سا اس کے بال تک پکڑنا بھول گیا۔ دل تھا کہ دھڑکنا بھول گیا۔

"وہ مر گئے ہیں۔ میرے بابا مر گئے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے، میں بے آسرا ہو گئی۔ ان کی مانو بے آسرا ہو گئی۔ یتیم ہو گئی ان کی مانو۔" وہ روتے روتے چلّانے لگی تھی اور چلّاتے چلّاتے ہوش کھونے لگی تھی۔ وہ دم سادھے اسے سن رہا تھا۔ اپنے دل کے ساتھ لگے کسی اور کے دل کی آواز سن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بازل کی گاڑی ایک جھٹکے سے پورچ میں آن رکی تھی۔ بڑے ہال سے اندر داخل ہوتی نوال بھابھی کے قدموں میں بھی بجلی سی بھر گئی۔ وہ دونوں بجلی کی سی رفتار سے باہر نکلی تھیں۔

"مجھے یقین ہے، میرا بیٹا خالی ہاتھ نہیں لوٹا ہو گا۔ اپنے پیاروں کا حساب برابر کر دیا ہو گا۔" بی جان کے لہجے میں تفاخر تھا۔ غرور تھا۔ بازل نے ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے ہی ماہ نور کو بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچا تھا۔ ماہ نور کی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ اسے بالوں سے کھینچتا ہوا بی جان اور نوال بھابھی کی طرف لایا تھا۔

"بازل! یہ۔ یہ کیا؟ تم تو شہباز محمود کو ختم کرنے گئے تھے۔" بی جان نے حیرت سے اسے دیکھا تھا اس نے بالوں سے پکڑی ہوئی ماہ نور کو بی جان کے قدموں میں

ڈال دیا تھا۔

"یہ شہباز محمود کی بیٹی ہے۔"

"اور شہباز محمود...؟"

"وہ کتا مجھ سے پہلے ہی مر گیا۔" ماہ نور نے گرتے گرتے خود کو سنبھالا اور جھٹکے سے اٹھ کر اس پہ جھپٹی اور اسے کالر سے پکڑ لیا۔

"یہ تم نے کتا کس کو کہا۔ تم ہو گے کتے۔ تمہارا خاندان..." بازل کے بھاری ہاتھ نے اسے گالی پوری کرنے نہیں دی تھی۔ اس کے نرم گال پہ پانچ انگلیوں نے اپنے مضبوط نشانات ثبت کر دیے۔ تب ہی ماہ نور کو پیچھے بالوں سے کسی نے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا تھا۔

"تو یہ ہے میرے شایان کے قاتل کی بیٹی۔" زمر آپا نے چلا کر اس کے چہرے پہ تھپڑ مارا تھا۔

"اور میرے بھائی عادل کے قاتل کی بیٹی، یہی ہے نا" اسے ایک اور تھپڑ لگا تھا۔ "میرے باپ کی موت کی وجہ بننے والے خونی کی یہ بیٹی ہے نا۔" اور یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ اس کے چہرے پہ پڑے تھے۔ اس کا چہرہ سُن ہو گیا اور جب اس کی پشت پہ نوال بھابھی کے گھونسے پڑے تو وہ بازل کے پیروں میں جا گری تھی۔ اس کے منہ سے خون کی دھار نکلی ـــــ تھی۔ زمر آپا اور نوال بھابھی نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ بازل نے نخوت سے اپنے قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی۔

اس کی ـــــ آنکھ کھلی تو اپنے چہار سو گھپ اندھیرا دیکھ کر دل اچھل کر حلق میں آ گیا' بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا' لیکن دکھتے جسم نے ایسا کرنے نہ دیا' وہ اپنی جگہ کراہ کر رہ گئی۔ اسے اس پاس عجیب طرح کی آوازیں سنائی دیں شاید پاس ہی جانور بندھے تھے۔

"یا رب۔" اندھیرے میں وہ بلبلائی تھی۔

اس نے وہ کالی رات یوں ہی روتے گزاری تھی۔ صبح ہونے کا احساس تب ہوا جب کمرے کے واحد روشن دان سے روشنی نے اندر جھانکا تھا۔ تب اس نے سوجی ہوئی آنکھوں سے اپنے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ اس سے ذرا پرے گائے بھینسیں بندھی تھیں۔

اسے ابکائی سی آ گئی۔ وہ وہیں دوہری ہو گئی۔

✺ ✺ ✺

"اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟" بی جان نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"پڑا رہنے دیں اسے یہیں کہیں۔"

"تم اسے مار کر وہیں پھینک آتے۔"

"ایک بار موت آ جائے تو فائدہ کوئی نہیں' بندہ بار بار مرے تو اسے زندگی سمجھ میں آتی ہے۔" پیچھے سے آتی زمر آپا نے کہا تو اس کے دل کو ہلکا سا کسی نے دبایا۔

"یہ لڑکی ہمارے مردوں کے قاتل کی بیٹی ہے۔ اسے تو ہم آسانی سے مرنے بھی نہ دیں گے۔" زمر آپا کے لہجے میں ایک جنون سا تھا۔ وہ محسوس کر کے سرہلانے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' اسے نوکرانی بنا لیں' گھر کے سارے کام کرے گی۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ کر پائے گی' بمشکل پندرہ سولہ سال کی ہے۔" بی جان نے اس کا حدود اربعہ بیان کیا تھا۔

"میرے ہتھے چڑھی تو سب کام کرے گی۔ چار ٹھڈے مار کر میں اسے اس کی اوقات یاد کرا دوں گی۔" زمر آپا کا لہجہ حتمی تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم ناشتہ کرتا رہا۔

✺ ✺ ✺

فاتحہ خوانی کے لیے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ تیار ہو کر آیا تو نوال بھابھی اس لڑکی کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹتی ہوئی باہر لا رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر ادھر دیکھ کر نظریں دوسری جانب کر لیں لیکن جب مردان خانے میں بیٹھا تھا۔ فاتحہ کے لیے آئے لوگوں کے لیے کھانا لگایا جا رہا تھا' تب ایک ملازم نے اس کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ وہ اسی پل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"خیریت بازل خان؟" ایک شخص نے اس کے بے ساختہ انداز پہ پوچھا تو وہ زبردستی ہلکا سا مسکرایا اور سر ہلا دیا۔

"آپ لوگ کھانا کھائیں میں ذرا بی جان کی بات سن لوں۔" وہ باہر نکلا تو ایک طرف ملازموں کا جمگھٹا لگا دیکھا' وہ تیزی سے اس جانب آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ملازم ہٹنے لگے۔

"دیکھو' یہ بے غیرت شاید مرگئی ہے۔" تو ال بھابھی نے پیر کی نوک سے بے ہوش پڑی ماہ نور کے چہرے کو پرے کیا تھا۔ وہ ماتھے پر ڈھیروں لکیریں لیے اس بے جان وجود کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک طرف پڑے اس کے ہاتھ کی نبض چیک کی' کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جھک کر اس کے دل کے پاس کان لگا دیا۔

"فخر الدین! میری گاڑی کی چابی لاؤ۔" اس نے تیزی سے کہا اور بھابھی کی طرف دیکھا۔

"اسے اٹھوا کر گاڑی میں ڈالیں۔ یہ ابھی زندہ ہے۔"

"رہنے دو اسے یوں ہی مرنے دو۔"

"کیوں خوامخواہ کا قتل سر۔ لے رہی ہیں میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں' آپ اسے گاڑی میں ڈلوائیں۔" بھابھی سے بات کرتے ہوئے اس نے تیزی سے چابی فخر الدین سے۔ لی اور اسی تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

"وقت پہ میڈیسنز نہیں لی گئیں' دم گھٹنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔" ڈاکٹر کے بتانے پہ اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"یہ دمہ کی مریضہ ہیں۔ ڈسٹ الرجک بھی ہیں۔ پلیز صاف ستھرا ماحول انہیں مہیا کریں اور سب سے بڑھ کر دوا وقت پہ دی جائے ورنہ ان کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے پروفیشنل انداز سے کہا تو وہ صرف سر ہی ہلا پایا۔

"اب تو وہ مکمل ہوش میں ہیں' آپ ان کے پاس جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔" نسخہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تو وہ گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔ وہ جب اس کے کمرے میں آیا تو وہ یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ ایک نظر اس پہ ڈال کر وہ کمرے کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ باہر دنیا اپنے اپنے کاموں میں مصروف اور اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ پھر اکتا کر واپس مڑا ہی تھا جب اس کی نظر ایک بار اس پر پڑی' اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔

اس نے کسی ڈاکٹر کو بلانے کے بجائے بے ساختہ جھک کر اس کی بات سننا چاہی' ماہ نور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ نرم' ملائم ہاتھ میں آہنی ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔

"مجھے میرے بابا کے پاس لے چلو۔" نیم وا آنکھوں سے اس نے التجا کی تھی۔ "پلیز مجھے میرے بابا کے پاس چھوڑ آؤ۔"

وہ اس کی التجا پہ گہری سانس لے کر ہاتھ چھڑا گیا۔

"فکر نہ کرو تم بہت جلد اپنے بابا کے پاس ہوگی۔"

"تم آج ہی مجھے مار دو۔" اس نے زار و قطار روتے ہوئے التجا کی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر نظریں پھیر گیا۔

"ابھی تو تم حویلی چلنے کی تیاری کرو۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"تم سے تمہاری مرضی کس نے پوچھی ہے؟ چلو اٹھو۔" اس نے سختی سے کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی۔

بازل خان حیران ہوا کہ اس نے اتنی آسانی سے اس کی بات مان کیسے لی لیکن اس کی یہ حیرت اس وقت دور ہو گئی جب ماہ نور نے گاڑی کو فل اسپیڈ میں دیکھا تو تیزی سے اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر کودنے کی کوشش کی لیکن بازل نے سرعت سے اسے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔

"یہ کیا فضول حرکت ہے؟" اس نے دھاڑ کر پوچھا اور گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گاڑی چرچراتی ہوئی تھوڑی دور جا کر رک گئی۔

"پلیز مجھے مرنے دو میں مرنا چاہتی ہوں۔" اس نے خود کو چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بازل کی کلائی پہ گرفت مضبوط تھی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"یہ تمہاری بھول ہے کہ تم آرام سے مرجاؤگی۔" اس نے گھر کا۔

"جانتی ہو تمہارے باپ نے میرے بھائی اور بہنوئی کو قتل کیا ہے۔اور اپنے بھائی بہنوئی کے قاتل کی بیٹی کو میں آسانی سے کیسے چھوڑ دوں۔"

"تمہارے بھائی اور بہنوئی کا قاتل مرچکا ہے۔مجھ سے تمہیں کیا لینا ہے۔" جواباً وہ بھی چلائی۔

"کاش تمہارا باپ زندہ ہوتا تو میں بتاتا کہ مجھے تم سے کیا مل سکتا ہے۔"

"تم لوگ بہت ظالم ہو۔"

"ابھی تم نے ظلم دیکھا ہی کب ہے' ابھی تو شروعات ہے۔ چلو آرام سے سیدھی ہو کے بیٹھو ورنہ بالوں سے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔" اس نے جھٹکے سے اسے دروازے کی طرف پٹخا اور خود گاڑی اسٹارٹ کرلی۔اس کا سر کھڑکی سے ٹکرایا تو چکرا کر رہ گیا۔ آنکھوں میں آئے آنسو رواں ہوگئے۔بازل لب بھینچے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ بچ گئی؟" نوال بھابھی نے اسے دیکھتے ہی نفرت سے کہا تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔

"ہاں ابھی اس کے مرنے کا دن نہیں آیا۔"

"یہ مرے گی تو ہمارے ہی ہاتھ سے۔" نوال نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنا چاہا تو بازل نے ہاتھ اٹھا دیا۔

"ابھی رہنے دیں۔" وہ جو خوف سے سمٹ گئی تھی۔بازل کے روکنے پہ بھی سیدھی نہ ہو سکی۔

"اے نوال! اسے میرے پاس لے آ۔ذرا میری ٹانگیں تو دبائے۔" زمر نے تخت پہ بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تو وہ ڈر کے مارے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"مجھے نہیں ان کے پاس جانا۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"جائے گی تو تیری ماں بھی۔چل دفع ہو' آگے لگ۔" نوال نے پیچھے سے اسے دھکا دیا تو وہ سیدھی زمر کے تخت کے پاس آگری۔

"ہوں' تو تیرا مکر بھی تیرے کسی کام نہ آیا۔تو پھر اسی دہلیز پہ آن پڑی نا۔" لمبا سا ہنکارا بھر کر زمر آپا نے کہا تو وہ سہم کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"یہ بھول جا لڑکی کہ اب تو یہاں سے نکل پائے گی۔ موت کا فرشتہ بھی آئے نا تو ہماری اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر پائے گا۔چل نیچے بیٹھ اور میری ٹانگیں دبا۔" زمر آپا نے ٹانگیں نیچے لٹکائیں تو وہ چپ چاپ کھڑی رہی کہ کیا کرے۔اسے ایسے کام کرنا کہاں آتے تھے بھلا۔

"دفع ہو' بیٹھ نیچے۔" زمر آپا نے اپنا بھاری پیر اس کے پیٹ میں دے مارا۔وہ بلبلا کر رہ گئی۔مردانے کی طرف بڑھتے بازل نے ذرا سا مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ایک تو یہ لڑکی چیخیں بہت مارتی ہے۔" اس نے ناگواری سے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بازل کو بی جان کے کمرے سے نکلتی دکھائی دی تھی۔اس کے ہاتھ میں کوئلوں والی انگیٹھی تھی۔ساتھ وہ کھانس بھی رہی تھی۔بازل اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"یہ انگیٹھی نیچے رکھ دو۔"

"اگر اس میں نئے کوئلے نہ ڈالے تو بی جان ان کوئلوں کو مجھ پہ انڈیل دیں گی۔" وہ سہمے ہوئے انداز سے بولی تھی ساتھ' کھانسی بھی تھی۔

"تم رکھ دو نیچے اور اپنا سانس درست کرو۔" اس کے کہنے پہ اس نے انگیٹھی نیچے رکھ دی تھی اور سانس کو درست کیسے کرتی' سانس بگڑ رہا تھا۔ کھانسی بڑھتی ہی جارہی تھی۔بازل غور سے اسے دیکھا۔

"میری گاڑی میں تمہاری میڈیسنز ہیں۔تم یہیں رکو' میں لاتا ہوں۔" اسے وہیں کھانستا چھوڑ کر وہ تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھا۔تب تک وہ کھانستے کھانستے برآمدے کے ستون کے پاس بیٹھ گئی تھی۔بازل تیزی سے دوائیں لے کر مڑا تھا لیکن اتنے میں اس کی

حالت غیر ہو چکی تھی۔ کھانستے ہوئے وہ ہوش حواس سے بھی بے گانہ لگ رہی تھی۔ بازل نے ان ہیلر نکال کے اس کے منہ سے لگانا چاہا تھا۔ اسی لمحے کھانسی سے تڑپتی ہوئی ماہ نور کا ہاتھ کوئلوں والی انگیٹھی میں جا پڑا تھا۔ بازل نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا تھا۔ جلے ہوئے ہاتھ کی تپش اس کے اندر تک اتر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم لوگ مجھے ایک ہی بار کیوں نہیں مار دیتے؟" وہ صبح صحن میں جھاڑو دے رہی تھی، جب جلے ہوئے ہاتھ سے جھاڑو پکڑنا مشکل ہو گیا تو اس نے غصے سے جھاڑو دور پھینک دی۔ برآمدے سے گزرتی زمر آپا نے اسے دیکھا تو آ کر اسے الجھے بکھرے بالوں سے پکڑ لیا۔ تب وہ بے بسی سے چلائی تھی۔ اور جواباً" زمر آپا نے اس کے منہ پہ کس کر تھپڑ دے مارا تھا۔

"تم پل پل مرو گی تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ تمہارے باپ نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے ہمارے ساتھ۔"

"میرے بابا مر چکے ہیں۔" وہ رو پڑی۔

"تم تو زندہ ہو نا اپنے بابا کی لاڈلی بیٹی۔ تمہیں پل پل مار کر ہمیں اتنی تو تسکین ملے گی نا کہ ہم نے اپنے پیاروں کا بدلہ لینے کی کوشش تو کی۔" زمر آپا نے جھٹکا دے کر اس کے بال چھوڑے تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے بازل نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

"چلو اٹھاؤ یہ جھاڑو اور پانچ منٹ میں سارا کام ختم کرو۔" زمر آپا نے جھاڑو کی طرف اشارہ کیا تو اس نے روتے ہوئے وہ جھاڑو اٹھا لی۔ جھاڑو پکڑتے ہوئے اس کی ایک اور چیخ نکلی تھی کہ ہاتھ میں چھالا بن چکا تھا اور شدید درد اٹھا زمر آپا نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"زیادہ نازک اندام بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم ملازمہ بن چکی ہو اس گھر کی۔ ساری عمر نوکرانی بن کے گزارنی ہے۔ بہتر ہے اپنے اطوار بدل لو۔" مجبوراً" وہ جھاڑو پکڑ کر نیچے پھیرنے لگی تھی شدید درد کی لہریں پورے جسم میں دوڑی تھیں۔ زمر آپا وہاں سے ہٹ گئیں تو ایک ملازم نے لا کر مرہم اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ چھوٹے سائیں نے بھیجا ہے۔ اسے جلے ہوئے ہاتھ پہ لگا لو۔" اس نے وہ کریم پکڑی اور پھر بے حد غصے سے پیچھے کھلی کھڑکی کی طرف پھینک دی کھڑکی سے ذرا پرے کھڑے بازل نے گہری سانس لے کر اندر گرنے والی وہ ٹیوب اٹھالی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آج تم نے پچھواڑے والے کمرے میں سونا ہے۔" گھر کا ایک ملازم اس کے سر پہ کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے کہیں نہیں سونا۔ میں یہیں برآمدے میں لائٹ کے نیچے بیٹھی رہوں گی۔" وہ انرجی سیور کی روشنی میں اپنا جلا ہوا ہاتھ پھیلا کر دیکھ رہی تھی۔

"ارے شکر کرو بی بی، تجھے سونے کے لیے کمرہ مل رہا ہے' ورنہ ہم ہیں' ساری رات چوکیداری کرتے دروازے کے پاس اونگھتے رہتے ہیں۔"

"بات سنو' اپنے کام سے کام رکھو' مجھے اس حویلی کے کسی کمرے سے دلچسپی ہے نہ کسی کمرے والے سے۔"

"لیکن بی بی! یہ چھوٹے سائیں کا حکم ہے۔"

"وہ تمہارا سائیں ہے میرا نہیں۔ وہ یہاں مجھے زبردستی لایا ہے۔ میں نہیں مانتی اس کے کسی حکم کو بھی۔"

"ماننا تو پڑے گا تمہیں' چلو اٹھو' اندر چلو۔" وہ پیچھے سے آن نکلا تھا۔ ملازم اسے دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

"مجھے اندر ڈر لگتا ہے۔"

"روشنی ہے وہاں۔"

"مجھے یہیں بیٹھنا ہے۔" وہ ضدی ہوئی۔

"میں کہہ رہا ہوں اندر چلو" اور کہتے کے ساتھ ہی اس نے اسے کلائی سے پکڑ لیا اور کھینچ کر اسے آگے لے گیا۔

"تمہارے ساتھ ایک ملازمہ سوئے گی، تم اکیلی نہیں ہوگی۔" بتی جلا کے وہ اسے اندر چھوڑ آیا تھا۔
— وہ اپنی بے بسی پہ روتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

خانساماں کے بیمار ہونے کی وجہ سے بی جان نے اسے کچن میں لا کھڑا کیا "آج کھانا پینا سب تم کروگی۔"
"مجھے تو کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔" وہ رونے کے قریب تھی۔
"نوال تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں اسے بھیجتی ہوں اتنے میں تم کام شروع کرو۔" بی جان اسے وہیں چھوڑ کر خود باہر نکل گئیں۔ — وہ اتنے بڑے کچن میں کھڑی آنکھیں پھاڑے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ گندے برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا دھونے کے لیے۔ جو یقیناً اسے ہی دھونا تھا۔ اس نے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنا جلا ہوا ہاتھ دیکھا اور بے ساختہ سسک پڑی تھی۔
"تم نے ابھی تک برتن نہیں دھوئے۔ بی جان کب سے تمہیں کہہ کر گئی ہیں —" نوال نے اپنی مخصوص بات دار آواز میں کہا تو وہ اسے دیکھے بغیر برتنوں کی طرف بڑھ گئی۔
صابن لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں شدت سے درد ہوا تھا۔ وہ کراہی بھی تھی لیکن وہاں اس کی سننے والا کون تھا۔ پھر جب نوال نے اسے پیاز کاٹنے کو دی۔ چھری پکڑنا اس سے محال ہو گیا تھا۔ نوال اسے سبزی کاٹنے پہ لگا کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اس سے — ابھی تک — ایک پیاز بھی کاٹی نہیں گئی تھی۔ اس کے آنسوؤں میں تیزی آتی چلی گئی۔ تب ہی پیچھے کھٹکا سا ہوا۔ اس کا خیال تھا نوال ہوگی اور اب آتے ہی جب اسے سستی سے کام کرتے دیکھے گی تو اسے پیٹ ڈالے گی۔
"نوال بھابھی! وکیل صاحب آئے ہیں، باہر آئیں پلیز۔" بازل نے اسے دیکھے بغیر کہا تھا۔ وہ فوراً سیدھی ہوئی اور کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ہاتھ میں پکڑی تیز دھار چھری بازل کے پیٹ میں گھسا دی۔
بازل نے سرعت سے چھری آگے سے پکڑ لی تھی۔
بازل کا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا تھا۔ سارے کچن میں خون پھیل گیا۔
"بازل خان، یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟"
بی جان نے اپنے بیٹے کے ہاتھ پہ پٹی بندھی دیکھی تو تڑپ کر رہ گئیں۔
"کچھ نہیں۔ بس یوں ہی کچھ لگ گیا؟" اس نے انہیں ٹالنا چاہا۔
"خیر ہو مولا۔ کہیں کسی دشمن نے—"
"بی جان! ایسی کوئی بات نہیں معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ زمر آپا نظر نہیں آرہیں۔" اس نے بات ہی بدل دی۔
"زمر اور نوال قبرستان گئی ہیں۔" تب ہی زمر ماہ نور کو بالوں سے پکڑ کر اندر داخل ہوئی تھی دو جھٹکے دیے تو ماہ نور کی گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلی تھیں۔
"ان لوگوں کی وجہ سے میں بیوہ ہوئی۔ میرے سر سے میرا سائیں اٹھ گیا میں لٹ گئی، برباد ہوگئی۔" اسے دو تھپڑ مار کر دور گرایا تو وہ صوفے پہ ٹکے بازل کے زخمی ہاتھ پہ جا گری۔ بازل کے اندر تک درد کی شدید ٹیسیں پھیل گئیں۔
زمر آپا اسے مار مار کر پھر سے پچھواڑے والے کمرے میں ڈال گئی تھیں۔ وہ مفلوج جسم کے ساتھ روتی ہوئی بے بس پڑی رہی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب کوئی بھاری قدموں سے اس کے پاس آن رکا تھا۔
"تم نے دوا نہیں لی۔ یہ لو ابھی کھالو۔" اس نے شاپر پاس رکھا۔
"تھوکتی ہوں میں تمہاری دوا پہ۔" آواز پہچان کر وہ بپھر کر بولی۔
"ضد نہ کرو۔ دوا کھالو۔" اس کے لفظ لفظ سے غصہ پھوٹ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"تم بھی بچی ہو، تمہیں یہ زبان زیب نہیں دیتی۔ تم یہاں جس کام کے لیے رکھی گئی ہو بہتر ہے زندہ رہ کروہ

سب چپ چاپ کرتی جاؤ۔"
"تم لوگوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا' مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔" رندھی آواز میں تازہ زخموں کا درد تھا۔
"ابھی سے یہ حال ہے تو آگے جا کر کیا کرو گی؟" اس نے دانستہ اسے لٹ سے پکڑ کر کھینچا۔
"تمہیں قتل کر دوں گی۔" وہ دھاڑی اور اس پہ جھپٹ پڑی۔ بازل نے خود کو چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی نجانے کیوں چپ چاپ اس سے مار کھاتا رہا وہ اپنے تمام دکھوں اور زخموں کا بدلہ اس سے لینا چاہ رہی تھی اور بپھری ہوئی بھی ایسی ہی تھی۔ لیکن اسے مار مار کر وہ جلد ہی تھک کر ڈھے گئی اور ــــ رونے لگی۔
وہ ایک طرف بیٹھا چپ چاپ اسے روتا دیکھتا رہا۔
"اوہ' یہ کیا ہوا میرے بھائی کو۔ کس ظالم نے یہ وحشیانہ سلوک کیا۔" زمر آپا نے صبح اس کے چہرے پہ اتنی چوٹیں اور خراشیں دیکھیں تو چلا کر رہ گئیں۔
بی جان کا ہاتھ بھی سینے پہ پڑا تھا۔
"چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا لیکن بچت ہو گئی۔" اس نے دودھ کا گلاس پیتے ہوئے جھوٹ بولا تو اندر داخل ہوتی ماہ نور نے سر جھٹکا۔ بی جان نے فوراً سو' سو کے کئی نوٹ اس کے سر سے وار کر اس کی طرف بڑھا دیے۔
"یہ لے میرے بیٹے کا صدقہ ہے یہ۔" اس نے وہ سرخ نوٹ گھور کر دیکھے۔ اسے اپنی ہتک کا شدت سے احساس ہوا۔
"سوری' مجھ سے زیادہ ان کی ضرورت زمر آپا کو ہے کیونکہ میں صرف یتیم ہوں اور یہ بیوہ اور بے اولاد بھی ہیں' پلیز یہ انہیں دے دیں۔" اس کے الفاظ تھے یا آگ میں بجھے شعلے۔ ان تینوں نے جھٹکے سے اسے دیکھا تھا۔ پھر زمر آپا کو نہ جانے کیا ہوا تھا' روتے ہوئے ایک طرف بھاگ گئی تھیں۔ بی جان نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا اور ایک ساتھ کئی مکے اسے جڑ دیے۔
"تو نے میری بیٹی کو گالی دی کمینی عورت! میری بیٹی کی بے عزتی کی میں تجھے زندہ قبر میں نہ ڈال دوں۔" بی جان نے طیش میں آ کر اسے نیچے گرا دیا تھا۔ بازل گہری سانس لے کر رہ گیا۔
"بی جان' چھوڑ دیں اسے۔"
"نہیں' نہیں' چھوڑوں گی اسے' اس نے میری بیٹی کو رلایا ہے۔ اسے اس کے بے آسرا ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اس نے اسے احساس دلایا ہے۔" بی جان اسے مار مار کر ہانپنے لگیں تو بازل نے اٹھ کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔
"بس کریں' یہ مر جائے گی۔"
"میں اسے مار دوں گی۔ جان سے مار دوں گی۔"
"ہاں تو مار دیں۔ میں کون سا جینا چاہتی ہوں' مجھے کل مارنا ہے تو آج ہی مار دیں۔" نیچے گری ــ وہ چلا کر رہ گئی تھی۔
"آگے سے زبان چلاتی ہے بے غیرت۔" بی جان پھر سے اسے مارنے کو لپکیں مگر بازل نے قابو کر لیا۔
"ہاں تو رکی کیوں' مار دو مجھے' ابھی مارو' ابھی مارو۔" وہ پھر چلائی۔
"دیکھ' دیکھ' کیسی زبان چلا رہی ہے یہ۔ خونی کی اولاد ظالم قاتل کی بیٹی۔"
"اگر میں خونی کی بیٹی ہوں تو تم بھی مجھ سے کم نہیں۔ تم ایک خونی کی ماں ہو اور دوسرے خونی کی ساس۔ اگر میرے باپ نے تمہارے بیٹے اور داماد کو قتل کیا ہے تو تمہارے بیٹے اور داماد نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔ میرے باپ نے اپنے بیٹے کا بدلہ لیا۔ حساب برابر کیا۔ اب زور تمہارا ہے نہ میرا' پھر کیوں مجھے باندی بنا رہی ہو' کیوں نیچا دکھا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی ایک بے بس' مجبور پہ ظلم کرتے۔ حیا نہیں آتی اپنے رویے پہ۔" وہ بولنے پہ آئی تو چلا چلا کر بولتی گئی۔
بی جان بھپریں۔ "دیکھ کیسی بے غیرت لڑکی ہے یہ۔ کسی ذلیل خاندان کی پیداوار ہے یہ۔"
"ذلیل خاندان میرا نہیں تم لوگوں کا ہے۔ جو لڑکی میرے بھائی کے ساتھ گھر سے بھاگی جا رہی تھی' وہ اسی خاندان کی تھی نا۔ پھر اپنے خاندان کو کیا کہتی ہو؟" اس

نے بھنویں اچکا کر پوچھا تو بازل کا بھاری ہاتھ اس کے ہوش اڑا گیا۔ اس کی وہ ساری رات بے چینی میں گزری تھی۔ ایک پل کے لیے بھی وہ سو نہیں سکا تھا۔ ساری رات سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ بار بار ایک ہی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔

''اگر میں خونی کی بیٹی ہوں۔ تو تم بھی مجھ سے کم نہیں۔ تم ایک خونی کی ماں ہو اور دوسرے خونی کی سیاس۔۔۔'' اس کمزور لڑکی کی پھنکار بار بار اندر گونج رہی تھی اور اس کی بے چینی ——— بڑھتی جارہی تھیں۔

''اگر میرے باپ نے تمہارے بیٹے اور داماد کو قتل کیا ہے تو تمہارے بیٹے اور داماد نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔ میرے باپ نے اپنے بیٹے کا بدلہ لیا۔ حساب برابر کیا۔'' اس نوعمر لاابالی چھوٹی سی لڑکی کی زبان کیسے کھل گئی تھی۔ کیسے وہ چلا اٹھی تھی۔

جب کسی بے بس مجبور پہ تسلسل سے ظلم ہوتا رہے تو یقیناً ''ایک دن ان کی زبانیں یوں ہی کھل جایا کرتی ہیں جیسے کہ آج ماہ نور کی کھلی تھی۔

''ذلیل خاندان میرا نہیں تم لوگوں کا ہے' جو لڑکی میرے بھائی کے ساتھ گھر سے بھاگی جارہی تھی' وہ اسی خاندان کی تھی نا' پھر اپنے خاندان کو کیا کہتے ہو؟''

وہ جھٹکے سے کرسی سے اٹھا۔ اس کا تن بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کر دیکھا (جو اس نے ماہ نور کے چہرے پر مارا تھا) اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔ وہ باقی ساری رات اپنے ہاتھ ہی کو دیکھتا رہا۔ بہت عرصے بعد یہ ہوا تھا کہ اس کی یہ رات صنوبر کی یادوں میں نہیں گزری تھی۔ آج اس نے کسی اور کو سوچا تھا اور ساری رات سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ اسے صحن میں کپڑے دھوتی دکھائی دی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس کے پاس آن رکا تھا۔

''آئندہ لی جان سے زبان درازی مت کرنا۔'' اس

کی بات پہ کپڑے رگڑتے اس کے ہاتھ رکے۔
"کیوں؟ ورنہ مجھے مار پڑے گی؟" اس نے غور سے اسے دیکھا۔
"اتنا تو معلوم ہے تمہیں۔"
"جانتی ہوں' کمزور لوگ ہاتھ چلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔"
"شٹ اپ۔" اس کا چہرہ سرخ ہوا' وہ ہنس پڑی۔
"سچ بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے۔" سر جھٹک کر اس نے ہاتھ میں آیا کپڑا جھٹکے سے زور لگا کر چیر دیا۔
"شاید یہ تمہاری قمیص ہے۔" گلے کے درمیان سے چری ہوئی قمیص اس نے اس کے سامنے کی۔
"اکثر میری طرح کے کمزور لوگ ایسا بھی کر دیتے ہیں۔" اس نے آنکھ سے دو ٹکڑے ہوئی قمیص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"جتنی تم چھوٹی ہونا' تمہاری سوچ اتنی چھوٹی نہیں۔"
"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "لیکن اس سے بالکل الٹ۔ تم جتنے بڑے ہونا' تمہاری سوچ اتنی بڑی نہیں بلکہ "بہت چھوٹی" سی سوچ کے مالک ہو۔" اس نے دو انگلیوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھ کر چھوٹی سوچ کا اشارہ کیا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
"جانتے ہو بازل خان! تم نے مجھے بنا قصور کے یہاں لا کر کیا ثابت کیا ہے۔" وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔
"اپنے گھٹیا ہونے کا ثبوت دیا ہے تم نے۔" وہ لب بھینچے اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔
"تم نے ایک عورت پہ مردانگی چلانی چاہی۔ اپنے پیاروں کا مجھ عورت سے بدلہ لینا چاہا' افسوس صد افسوس۔ تم بہت کمزور مرد ہو بازل خان۔ بہت کمزور چچ چچ۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔
"جانتے ہو بازل خان' جو مرد عورت سے بدلہ لینے کا سوچتا ہے وہ مرد ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ صد افسوس تم اس کیٹگری میں فٹ نہیں بیٹھتے۔" اس

نے آرام سے کہہ کر اسے بہت کچھ جتا دیا۔ وہ اب بھی دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ وہ کپڑے لے کر اٹھتے ہوئے باقی بچا گندا سرف اس پہ ڈال گئی تھی۔ وہ بنا کچھ بولے اسے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔
زمینوں کے کاغذات یوں ہی پڑے تھے۔ عدالتوں میں کئی فیصلوں کی تاریخ آگے پیچھے ہو گئی تھے۔ منشی' پٹواری سب ہیرا پھیری پہ لگے اس کی راہ میں نظریں ٹکائے ہوئے تھے۔ لیکن اس کا دل تھا کہ ہر طرف سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ اسے کسی کل چین نہیں مل پا رہا تھا۔ کھیتوں' کھلیانوں اور اپنی زمینوں میں جاتا تو دل اوب جاتا' ڈیرے پہ جا کے بیٹھتا تو اکتا جاتا۔ جرگوں میں اب اس نے جانا ہی چھوڑ دیا۔ باہر کی دنیا کے لیے دل خالی خالی سا رہنے لگا۔ رات کو نہ ڈائریاں کھولتا نہ صنوبر کے فوٹو دیکھتا۔ ساری ساری رات پچھواڑے کے بند دروازے کو دیکھتا رہتا۔ اندر لائٹ جلتی رہتی اس کا دل جلاتی رہتی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تصویریں تمہارے بابا نے مجھے آخری دنوں میں دی تھیں۔" وہ بی جان کے پاس آ کر بیٹھا تو انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور ہاتھ میں پکڑی بہت سی تصویروں کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ بی جان کے پیر دباتی ماہ نور نے سر جھکا تھا۔ بازل جو بی جان سے لفافہ لے رہا تھا کرنٹ کھا کر رہ گیا۔
"یہ کیا ہے؟"
"تیرے باپ نے کہا تھا۔ تم ان میں سے جس لڑکی پہ بھی ہاتھ رکھو گے وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے تمہاری دلہن بنا دیں گے۔" بی جان کو اس کا انداز خاصا برا لگا تھا۔
"اور آپ جانتی ہیں میں نے بابا سائیں کو صاف منع کر دیا تھا۔" اس نے صاف لفظوں میں جتایا۔
"یہی تو قلق مجھے ساری زندگی مارتا رہے گا' تمہارے بابا سائیں تمہاری شادی کا خواب لے کر ہی

اس دنیا سے چلے گئے اور میں بھی۔"

"بس کردیں بی جان پلیز اور ان تصویروں کو آگ میں جھونک دیں، جو بات ناممکن ہے۔ بس ناممکن ہے۔"

"تم بہت ضدی ہو بازل خان۔" انہوں نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے اچانک پیر ماہ نور کو دے مارا تھا۔

"زور لگا بے غیرت۔ ہاتھوں میں دم نہیں ہے۔" انہوں نے ماہ نور کو مار کر اور گھرک کر کہا تھا۔

اب کی بار ماہ نور کے بجائے بازل کو واضح طور پر درد ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن جو ہوا عجیب ہی حادثہ تھا۔ وہ بڑے ہال کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ جب اچانک اس کا سانس بند ہونے لگا تھا۔ وہ کھانسنے لگی۔ سامنے صوفے پہ بیٹھی نوال بھابھی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کھانس کھانس کر دہری ہو رہی تھی۔ گرتے پڑتے وہ نوال کے سامنے پڑے پانی کے گلاس کو اٹھانے لگی تھی۔ جب نوال نے اس کے ہاتھ سے گلاس چھین لیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں باہر ابلنے لگیں تب ہی اسے گل دان کے پاس پڑا اپنا ان ہیلر نظر آگیا۔ وہ گرتی پڑتی اس تک پہنچی مگر اس سے پہلے ہی باہر سے آتی زمر آپا نے وہ اٹھا کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"یہ۔ یہ مجھے۔ مجھے دے دو۔ مجھے۔ مجھے۔"

"نہ۔ نہ۔ تمہیں ذرا تڑپتا تو دیکھیں۔ تمہاری تڑپ کا مزہ تو لیں۔" زمر کے ساتھ نوال کا قہقہہ بھی شامل ہوا تو وہ زمر کے پیروں میں گر گئی۔

"خدا۔ خدا کا۔ واسطہ۔"

"ابھی نہیں۔ تھوڑا سا اور۔ تھوڑا۔ سا اور۔ تھوڑا اور۔ اور۔ شاباش۔" نوال اور زمر ہنستے ہوئے جیسے چٹخارے لے رہی تھیں اور انہیں پتا ہی نہ چلا کہ وہ تڑپ تڑپ کر بے بس ہو گئی تھی۔ اس کی باقی ماندہ ہمت جواب دے گئی تھی۔ اور باہر سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے بازل خان نے ایک نظر یہ منظر دیکھا تھا اور اس کی سانسیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گاڑی جانے پہچانے راستوں پہ رواں تھی لیکن وہ بیک سیٹ سے سر ٹکائے آنکھیں موندے کچھ بھی دیکھنے سے گریزاں تھی۔ وہ بھی چپ چاپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی اپنی مطلوبہ جگہ پہ جا کر جھٹکے سے رکی تو اس نے آہستہ سے بھینچی پلکیں اٹھا لیں۔ آنکھیں لال سرخ تھیں، اور آنکھوں سے ذرا سا پانی چھلک کر گالوں کو چھو گیا تھا۔ بازل نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔

"تمہارا گھر آگیا۔"

"میرے بابا۔" وہ اپنے باپ کا گھر دیکھ کر بے اختیار سسک پڑی۔

"آجاؤ۔" اس کی طرف کا دروازہ کھول کر وہ نرمی سے بولا تو وہ سسکتی ہوئی باہر نکل آئی۔

وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ بھائی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ بابا کی گود میں پلتی آئی تھی۔ وہی دروازہ۔ وہی راہ داری، وہی ہال، سامنے بابا کا کمرہ ایک طرف بھائی کا۔ اور دوسری طرف اس کا اپنا۔ مگر وہ اپنے کمرے میں سوئی کب تھی۔ اکیلے میں تو اسے ڈر لگتا تھا۔ شروع سے باپ بھائی کے کمرے میں رہتی آئی تھی اور اگر وہ نہ ہوتے تو کل وقتی ملازمہ اس کے ساتھ پائی جاتی۔ اس نے اکیلے رہنا سیکھا تھا نہ اکیلے سونا۔ وہ بابا کے کمرے میں بیٹھ کر دیر تک روتی رہی تھی اور وہ چپ چاپ اسے روتا دیکھتا رہا تھا لیکن جب رہا نہ گیا تو اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"بس کرو، تمہاری پہلے ہی صحت ٹھیک نہیں۔" اور وہ چاہتے ہوئے بھی آنسو روک نہیں پا رہی تھی تب ہی مجبوراً وہ سامنے کھڑا ہو کر اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا اور ایسے میں وہ خود پہ قابو نہ رکھ سکی تو اس کے شانے سے

جا لگی۔

"مجھے واپس جانا ہے۔" وہ دل کڑا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔" سہالہجہ اس کے اندر کی حالت کا غماز تھا۔

"مجھے جانا تو ہے۔" وہ کچھ نہ بولی تو وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

"تم آج رک نہیں سکتے۔" اس کی آواز نے اس کے قدم دروازے میں ہی جکڑے۔ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"رات ہے نا' مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔" وہ مسکینی سے بولی۔ ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"میرے ہوتے ہوئے کیا تم نہیں ڈرو گی؟" وہ دو قدم اس کے قریب آگیا۔

"پلیز رک جاؤ نا۔"

"پتا ہے نا میں مارتا بھی ہوں۔"

"پلیز۔" وہ لجاجت سے بولی۔ "اندھیرے سے مجھے ڈر لگتا ہے اور اکیلے میں میری جان نکل جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"تم رکو گے نا؟" اس نے آس سے پوچھا۔ وہ کچھ دیر بغور اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلا دیا۔

اور وہ اس رات بہت سکون سے سوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم سوئے نہیں۔" صبح وہ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر بے اختیار بولی تھی۔

"کہاں سونا؟"

"ارے' یہ پورا گھر ہے۔ اتنا بڑا ہے۔ جس طرف چاہتے سو جاتے۔" بازل بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"بہت معصوم ہو تم یا شاید پاگل۔"

"کیا مطلب؟" وہ الجھی۔ "اب ایسا بھی نہیں ہے۔"

"چھوڑو سب مطلب وطلب۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ ایک اسٹرونگ سا کپ مل جائے گا؟"

"ارے تم بھی اسٹرونگ چائے پیتے ہو؟" وہ بے اختیار چیخی۔

"مجھے بھی زیادہ پتی والی چائے اچھی لگتی ہے۔"

"تم پھر دو کپ بنالو۔" وہ ذرا سا مسکرا کر نرمی سے بولا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجا۔ اسکرین پہ گھر کا نمبر تھا۔

"جی السلام علیکم! بی جان میں یہیں ہوں۔۔۔ جی وہ بچ گئی ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور اسے بات کرتا دیکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی لیکن بازل کے اگلے الفاظ نے اس کے قدم روکے تھے۔

"بی جان! یہ معصوم ہے' بچی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو اسے اٹھا کر آپ لوگوں کے پاس لے گیا۔ زمر آپا اور نوال بھابھی نے اس پہ طرح طرح کا ظلم کیا۔ اسے مارنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ بہت افسوس کی بات ہے۔ یقین مانیں' مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا ہے۔" وہ اپنی ماں سے اس کے حق میں بات کر رہا تھا۔ اس بات نے بے اختیار اس کا نرم و نازک دل گدگدایا۔ چائے بنا کر وہ واپس آئی' تو وہ بات ختم کر چکا تھا۔

"سنو!"

"جی؟"

"تم اپنے بھائی کا خون ہمیں معاف کر سکتی ہو؟" بنا تمہید کے اس نے پوچھا۔

"تو کیا تم اپنے پیاروں کا خون معاف کر سکتے ہو؟" اس نے بھی جواباً پوچھا۔

"سمجھ داری کا یہی تقاضا ہے کہ اب ہمیں کوئی نہ کوئی گنجائش نکال لینی چاہیے۔ یہ خاندان' برادری کے مسئلے ختم کرنے چاہئیں۔ پہلے جو ہوا اور جن

رسموں' رواجوں کی وجہ سے ہوا' اب ہمیں ان رسموں' رواجوں کو توڑنا چاہیے اور دوبارہ سے وہی اصول اپنانے چاہئیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں دیے تھے۔ انہوں نے حسب نسب کو مٹا کر ہر انسان کو برابری' مساوات اور عدل کا درس دیا۔"

"قربان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"اسلام میں قتل کا بدلہ صرف قتل نہیں۔۔۔ بلکہ اس میں صلہ رحمی اور درگزر و معافی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔"

"تو اتنا علم رکھتے ہو۔ پھر بھی۔۔۔" بے اختیار شکوہ کر گئی۔

"بس سنبھلنے کا بھی کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے اور یہی سمجھ لو کہ اس علم نے اب جا کے مجھ پہ اثر کیا ہے اور میں اب سنبھلا ہوں ورنہ اس سے پہلے میں بھی ان ریتوں' رواجوں میں الجھا ہوا تھا۔" اس نے ایمان داری سے اپنا تجزیہ کیا تھا۔ وہ سرہلانے لگی۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ اس بات پہ تم مبارک باد کے مستحق ہو۔"

"شکریہ۔۔۔ اور اس کے لیے میں تمہارا زیادہ شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے یہ احساس ہوا اور مجھے سب جاننے کا موقع ملا۔" اس نے فراخ دلی سے کہا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

✡ ✡ ✡

"تم آج بھی نہیں رک سکتے۔" وہ اگلے دن پھر اس کے پیچھے کھڑی اسے روک رہی تھی۔

"مجھے جانا تو ہے' آج نہیں تو کل۔۔۔ لازمی جانا پڑے گا۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا سا تھا۔

"آج رک جاؤ۔ کل چلے جانا۔"

"اور اگر کل پھر تمہیں ڈر لگا تو۔۔۔؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو پھر رک جانا۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ مدھم سا مسکرا دیا۔

"روز روز رکنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" وہ دل پہ پتھر رکھ کے بولا۔

"تو پھر میں اکیلی کیسے رہوں گی؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچنا پڑے گا۔"

"ہاں۔۔۔ کوئی حل نکالو نا پلیز۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔ بازل نے گہری نظروں سے اپنے ہاتھ پہ اس کا ہاتھ دیکھا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے' ان ہاتھوں کو ہمیشہ کے لیے ایک نہ کرلیں؟"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"بازل خان ولد زیان خان' ماہ نور شہباز ولد شہباز محمود کو زوجیت میں لینے کا فیصلہ کر چکا ہے تو کیا یہ فیصلہ آپ کو قبول ہے؟" اور ماہ نور نے جو بے ساختہ حیران نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا' اس کی چمکتی آنکھوں نے اسے وہیں پلکیں گرا لینے پہ مجبور کر دیا۔

"بولو کیا قبول ہے؟" وہ پھر بولا۔ ماہ نور کے ہاتھوں سے پسینہ چھوٹ پڑا۔

"میں نے پوچھا قبول ہے؟" بھاری آواز میں گرج تھی' دھمک تھی' جو اگلے کا دل دہلا دینے کو کافی تھی لیکن اگلے کا دل دہلا نہیں تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے گلے میں لٹکتے تعویذ کو پکڑ لیا تھا۔

"جب خودکشی ہی کرنی ہے تو ٹھیک ہے' دونوں ایک ساتھ کرتے ہیں۔" اور بازل خان کا زوردار قہقہہ بلند ہو گیا تھا۔

"بس بیٹا! اب اور کچھ مت کہنا۔ میں تم سے پھر کہہ رہی ہوں کہ صبر کرو صبر۔ کیونکہ صرف صبر ہی ایک ایسی سواری ہے جو اپنے سوار کو گرنے نہیں دیتی۔ نہ کسی کی نگاہ سے اور نہ ہی کسی مقام سے!"

وہ اپنا رونا دھونا بھول بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھے جارہی تھی۔

"صبر کروں؟ اور کتنا صبر کروں میں؟ مجھے تو لگنے لگا ہے کہ میری ساری زندگی ہی انتظار اور صبر بن کر رہ گئی ہے اور آپ ابھی بھی کہہ رہی ہیں کہ میں ہی صبر کروں؟"

اور اس کے لہجے سے ٹپکتی بے بسی اور دکھ نے ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں کردیے تھے۔

سلطانہ ایک خوش نصیب عورت مانی جاتی تھیں۔ خوش نصیبی کا ہما ہمیشہ ان کے سر پر بیٹھا رہتا تھا اسی لیے گاؤں کی ان پڑھ دوشیزہ ہونے کے باوجود انہیں عبداللہ جیسا شہری اور باوقار ہم سفر ملا تھا۔ جس وقت ان دونوں کی شادی ہوئی۔ عبداللہ کی مالی حیثیت بہت معمولی تھی۔ وہ جتنا کماتے، کھاپی کر برابر کردیتے۔ مگر جب سے سلطانہ ان کی زندگی میں آئی تھی، ان کی تو جون ہی بدل گئی تھی۔ اب وہ خوب محنت سے دل لگا کر کام کرتے۔ آدمی دیانت دار اور محنتی تھے، لیکن وہ اپنی ہر کامیابی کا سہرا اپنی بیوی کے سر باندھ دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہو رہا تھا، سلطانہ کے نصیب سے ہی تھا اور سلطانہ کو عبداللہ کی انہیں باتوں نے ساتویں آسمان پر پہنچادیا تھا۔

ولید ان کا پہلوٹھی کا بیٹا تھا۔ اس سے چھوٹی پانچ بہنیں تھیں۔ سلطانہ نے ولید کی "جوڑی" ملانے کے چکر میں ہی پانچ بیٹیاں پیدا کرلی تھیں۔ وہ ہر بیٹی کی پیدائش پر خوف زدہ نگاہوں سے عبداللہ کی طرف دیکھتیں کہ کہیں ان سے "خوش نصیب عورت" کا خطاب چھین تو نہیں لیا جائے گا، مگر سامنے عبداللہ تھے۔ سلطانہ کی محبت میں وہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ انہیں جیسے ہی بیٹی کی آمد کی خبر ملتی وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کی رحمت کے --- آنے کا شکر ادا کرتے اور ساتھ ہی ولید کو گلے لگا کر اس کا سر، منہ چوم لیتے۔

"بھائی جی! آپ کو پانچ پانچ بیٹیوں کا ذرا بھی ملال نہیں؟ آج کے دور میں تو ایک بیٹی کا بوجھ اٹھانا محال ہوجاتا ہے اور آپ ہیں کہ پانچ پانچ بیٹیاں بھی آپ کو پھولوں کی طرح لگ رہی ہیں؟"

بیٹھانی کہتیں "ایسا مت کہو، بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور اللہ جب بہت خوش ہوتا ہے تو بیٹی عطا کرتا ہے۔ میں اپنے رب کی تقسیم سے خوش ہوں، بہت خوش اور پھر ہمارے پاس ولید ہے نا، ہمارا بیٹا، ہمارے بڑھاپے کا سہارا۔ اللہ اسے نیک توفیق دے۔ ہمیں اور کسی کی خواہش نہیں۔"

عبداللہ کی بھابھی جو شروع دن سے ہی سلطانہ سے خار کھاتی تھیں، بیٹیوں کی آڑ لیتے ہوئے شاید ان کا دل سلطانہ کی طرف سے پھیرنا چاہتی تھیں۔ لیکن نہیں جانتی تھیں کہ عبداللہ ذرا مختلف مزاج کے انسان تھے۔ اس لیے انہوں نے بھابھی کے ساتھ ساتھ کسی کی باتوں پر بھی کان نہ دھرے اور اپنی بیوی، بچوں میں مگن رہے اور اللہ کو شاید ان کا یہی توکل بھا گیا تھا جو سب سے چھوٹی بیٹی گل ناز کے بعد اوپر تلے انہیں پانچ

بیٹوں سے نواز ڈالا۔

اب تو سلطانہ کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ان کا سر فخر اور غرور سے تن سا گیا تھا۔ عبداللہ کا اس دنیا میں خونی اور سگے رشتے کے نام پر صرف ایک بڑے بھیا ہی تو تھے اور وہ بھی عجیب مست مگن طبیعت کے مالک تھے۔ ہاں۔ البتہ بیگم ان کی خوب ہوشیار اور زمانہ ساز خاتون تھیں، مگر سلطانہ ان سے بھی چار ہاتھ آگے تھیں۔ وہ تو جب سے گاؤں چھوڑ، شہر کی باسی بنی تھیں، گاؤں کے ساتھ ساتھ اپنے سب سگے رشتہ داروں کو بھی پیچھے چھوڑ آئی تھیں، تو پھر بھلا مسکین سے بھیا، بھابھی ان کے سامنے کیا حیثیت رکھتے تھے، سو انہوں نے اپنی ایک الگ ہی راج دھانی بنالی جس میں وہ اکیلی ہی سب پر بھاری تھیں۔

ولید ان کا بہت فرماں بردار اور تابعدار بیٹا تھا۔ سب سے "بڑا بیٹا" اور سب سے "بڑا بھائی" ولید کو یہ رتبہ ایک "اعزاز" کی طرح لگتا تھا۔ وہ شروع سے ہی سنجیدہ مزاج اور حساس طبیعت کا مالک تھا، اس پر سلطانہ نے اسے زیادہ ہی ذمہ دار بنا ڈالا تھا۔ جیسے ہی ولید نے دسویں کا امتحان پاس کیا، آگے پڑھائی جاری رکھنے کے بجائے باپ کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کا اعلان کردیا۔

عبداللہ کی بڑی خواہش تھی کہ ولید خوب پڑھے، مگر سلطانہ نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی پیٹھ ٹھونک، اسے کم عمری میں ہی کاروبار میں جوت دیا۔

عبداللہ نے بھی بیٹے کی خواہش اور بیوی کی مرضی پر سر جھکا دیا۔ ولید نے جیسے ہی باپ کے ساتھ کام شروع کیا ان کی کایا ــــ بدلتی چلی گئی۔

ولید کا ذہن کاروباری تھا اور باپ کی طرف سے وراثت میں اسے ایمان داری اور محنت ملی تھی، سو اس نے خوب جم کر محنت کی اور جلد ہی عبداللہ کی چھوٹی سی فیکٹری کو بہت بڑے بزنس میں بدل دیا۔ سلطانہ نے اس بہتی گنگا سے خوب فائدہ اٹھایا اور پانچوں بیٹیوں کو خوب دھوم دھام سے بہت اچھی جگہوں پر بیاہ کر فارغ

ہو گئیں۔

اس سارے عرصے میں انہوں نے ایک بار بھی ولید کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اگر کوئی ملنے جلنے والا ان کی توجہ اس طرف دلوانے کی کوشش بھی کرتا تو وہ سنی ان سنی کر دیتیں۔ ولید کی عمر سینتیس کے لگ بھگ ہو رہی تھی' اس سے چھوٹے بھائی بھی اس کے کندھوں کے برابر آ چکے تھے' مگر وہ تھا کہ ابھی تک ماں کو "خوش" کرنے کے لیے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں خوش دلی سے اٹھا رہا تھا۔ شادی شدہ بہنیں اور جوان ہوتے بھائی' حتیٰ کہ بہنوں کے بچے بھی' سب کے سب ولید کو اپنے اردگرد اس طرح الجھائے رکھتے کہ اس کے دل میں کبھی اور کوئی خیال آ ہی نہیں پایا تھا۔

"امی۔۔۔! اب آپ بھائی جان کے بارے میں بھی کچھ سوچ لیں۔ بہت ہو گئی' اب تو ان کی بھی شادی ہو ہی جانی چاہیے۔"

"ہاں امی! اب تو میرے سسرال والوں نے مجھے طعنے دینے شروع کر دیے ہیں کہ ہم جان بوجھ کر بھائی جان کی شادی نہیں کروا رہے۔ آپ کو پتا ہے' میری دیورانی کے بھائی کی منگنی ہوئی ہے پچھلے دنوں' وہ اپنے وحید (گل ناز سے چھوٹا) کا کلاس فیلو ہے اور اس کی منگنی کے بعد سے تو سب کا دھیان جیسے بھائی جان کی طرف ہی ہو گیا ہے۔ میری ساس کل کہہ رہی تھیں' ولید جیسی سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو سلطانہ بھلا کیسے ہاتھ سے جانے دے سکتی ہیں۔ وہ ولید کی شادی تب تک نہیں ہونے دیں گی جب تک اپنے سارے بچے بیاہ نہیں لیں گی۔ امی' کیا آپ واقعی ایسا ہی سوچ رہی ہیں؟"

چھٹی کا دن وہ ساری بہنیں میکے میں گزارتی تھیں۔ سو سب موجود تھیں کہ باتوں ہی باتوں میں ولید کی شادی کی بات بھی چھڑ گئی۔ سلطانہ نے حسب عادت اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کی' مگر ان کی بیٹیوں نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ وہ بھی کیا کرتیں' انہیں بھی تو اپنے سسرال والوں کو "منہ" دکھانا تھا' اسی لیے ماں کو جذباتی انداز سے گھیر کر بلیک میل کرنے لگیں۔

سلطانہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ ولید کو کسی اور کے ساتھ برداشت کرنے سے گھبراتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ اس کی شادی کریں گی' ولید ان کا بیٹا نہیں رہے گا' بلکہ کسی اور کا جیون ساتھی بن جائے گا۔ ان سے اور ان کے باقی بچوں کی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لے گا۔ اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ یہ دن آنے سے پہلے اسے جتنا نچوڑ سکتی ہیں' نچوڑ لیں اور اسی لیے وہ جان بوجھ کر اس کی طرف سے غافل ہوئی پھرتی تھیں۔ مگر اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ اب ان کی بیٹیوں کو طعنے ملنے لگے تھے اور وہ یہ بات کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کی یا ان کی بیٹیوں کی کوئی بھی کمزوری کسی کے ہاتھ لگے۔

☼ ☼ ☼

"معید! میں نے اپنی زندگی میں عورت کے صرف دو ہی روپ دیکھے ہیں۔ ایک ماں کا اور دوسرا بہن کا' مجھے نہیں پتا کہ اس کے علاوہ بھی عورت کا کوئی روپ ہوتا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے کبھی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ میں اس کے علاوہ بھی عورت کا کوئی اور روپ دیکھوں۔ لیکن اب امی کی "خوشی" اور ان کی "رضا" کے لیے میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے پر "مجبور" ہو گیا ہوں اور وہ بھی "بیوی" کے روپ میں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم میری امی کو ہمیشہ خوش رکھو گی۔ اگر امی' ابو تم سے راضی ہو گئے تو سمجھ لینا کہ میں بھی تم سے خوش ہو جاؤں گا۔"

سلطانہ نے بہت سوچ بچار کے بعد آخر کار ولید کی شادی کا فیصلہ کر ہی لیا تھا' کیونکہ اب تو وحید بھی ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ بی کام کر چکا تھا اور اسے اپنی کلاس فیلو فاریہ سے دھواں دھار قسم کا عشق ہو گیا تھا اور اب اس کی خواہش تھی کہ سلطانہ اور عبداللہ اس کا رشتہ لے کر فاریہ کے گھر جائیں۔ سلطانہ اس

صورت حال سے گھبرا گئیں۔ انہوں نے وحید کو تو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا، مگر اب وہ بڑی شدومد کے ساتھ ولید کی دلہن ڈھونڈنے نکلی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ انہیں کوئی لڑکی بھی اپنے معیار پر پوری اترتی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اس دلہن تلاش مہم میں ان کی بیٹیاں ان کے ساتھ برابر کی شریک تھیں اور پھر بہت خجل خوار ہونے کے بعد آخر کار مہر نگار کی صورت گوہر مقصود ان کے ہاتھ لگ ہی گیا۔

ابتسام اور نائلہ کے دو ہی بچے تھے۔ مہر نگار اور فواد۔ مہر نگار بی اے فائنل میں تھی اور فواد ایف ایس سی کر رہا تھا۔ ابتسام کا اپنا چھوٹا سا بزنس تھا اور وہ بہت خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔

ابتسام کی والدہ بھی ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ بی اماں (دادی) کا رجحان مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے رہن سہن میں سادگی اور مذہبی رجحان کی جھلک نمایاں تھی۔ نائلہ ہر کام میں ساس کو آگے رکھنے کی عادی تھیں، تو وہ بھی ان کا مان بڑھانا جانتی تھیں۔ ان کے گھر میں روایتی ساس، بہو کی "کچ کچ" کا دور، دور تک کوئی نشان نہیں۔ تھا اور سلطانہ کو ان کے گھر کی یہی ادا پسند آگئی تھی۔ پھر جب مہو ان کے سامنے آئی تو اس کی موہنی صورت اور اعلا سیرت نے انہیں اس طرح جکڑا کہ انہوں نے ابتسام کے گھر کی دہلیز ہی پکڑلی اور تب تک ہار نہیں مانی جب تک ہاں نہیں کروالی۔

عبداللہ کو بھی یہ رشتہ بہت پسند آیا تھا۔ ابتسام کے بڑے بھائی کے ساتھ عبداللہ کا پرانا ملنا جلنا تھا، سو ابتسام نے زیادہ چھان پھٹک کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ادھر سلطانہ نے واقعی ہتھیلی پر سرسوں جمائی اور دو مہینے کے اندر اندر مہو کو بہو بنا کر اپنے "محل" میں لے آئیں۔ ولید کے لیے یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔ کہاں تو اس کی شادی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہو رہا تھا اور کہاں جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی صورت حال ہو گئی۔ وہ ذہنی طور پر الجھ کر رہ گیا۔ اس پر ماں اور بہنوں کی روز پڑھائی جانے والی نئی نئی پٹیاں۔ وہ دل ہی دل میں بڑا خوف زدہ ہو رہا تھا کہ جانے اب کیا ہوگا اور یہ اسی کنفیوژن کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم دن اور اہم ترین خوشی سے بھی ٹھیک طریقے سے محظوظ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

"مہو! میرے امی، ابو میرے لیے قبلہ کعبہ ہیں، میں ان کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا اور میرے بھائی، بہنیں میرے لیے اولاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ تم بھی انہیں اپنی اولاد ہی سمجھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی دوری، کوئی دراڑ آئے، اس لیے تم بھی بھول کر بھی مجھے ان کے خلاف کرنے کی کوشش مت کرنا، کیونکہ میں دنیا میں سب سے زیادہ بھروسا اور محبت اپنے گھر والوں سے ہی کرتا ہوں۔"

خوب صورت عروسی لباس میں پور پور سجی سنوری مہو کے کانوں میں وہ ایک کے بعد ایک "اپنی چاہتیں، اپنی خواہشیں" انڈیلتا جا رہا تھا۔ مہو جھکے سر اور ڈوبتے دل کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی سب سہیلیاں تو اسے کچھ اور ہی کہانیاں سناتی رہی تھیں، اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہوئے ولید کا "کام تمام" ہو جانے کی پیش گوئیاں کرتی رہی تھیں، مگر یہاں تو سب کچھ الٹا۔ ہی ہو رہا تھا۔ ولید نے تو شاید نگاہ اٹھا کر بھی اس کے "دمکتے روپ" کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی کوئی تعریف کی، نہ ہی کسی قسم کا خوش کن جملہ اس کی سماعتوں کی نذر کیا تھا۔ ہاں... جب سے وہ اس کے سامنے آکر بیٹھا تھا، ایک ہی راگ الاپے جا رہا تھا۔

"میں۔۔ اور میرے گھر والے، میں اور میری امی۔" اور مہو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی باتوں کا کیا جواب دے۔

پھر یوں ہوا کہ مہو نے اپنا آپ ولید کی پسند اور خوشی کے لیے وار دیا۔ ولید اسے بیاہ کر گھر تو لے آیا، مگر گھر میں پڑے قیمتی سامان کی طرح اسے بھی گھر میں ڈال کر

شاید بھول گیا۔ مہو پڑھے لکھے معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی' اس لیے سب کچھ خاموشی سے سہتی چلی گئی۔ ولید کی اب بھی پوری توجہ بزنس پر ہی تھی۔ ابھی اس کے شانوں سے "ذمہ داریوں کا بوجھ" ہلکا نہیں ہوا تھا' بلکہ اب تو بہنوں کے جوان ہوتے بچے بھی نامعلوم انداز سے اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہوتے جارہے تھے۔

سلطانہ اب بھی اس سے بڑی بڑی رقمیں نکلواتی رہتی تھیں۔ کبھی بہنوں کے کسی مسئلے کے حل کے لیے تو کبھی اس کے بھائیوں کی اہم ضرورتوں کے نام پر..... عبداللہ اب کلی طور پر گھربار کے ہر معاملے سے الگ ہوچکے تھے۔ ان کا زیادہ وقت اب عبادت میں گزرتا تھا اور یہ عبادتیں ہی ان کے لیے سب کچھ تھیں۔

مہو یہ سب کھلی آنکھوں سے دیکھتی تھی' مگر زبان پر حرف شکایت نہیں لاتی تھی' کیونکہ شکوے گلے کرنا نہ تو اس کی عادت تھی اور نہ ہی اسے اس قسم کی تربیت ملی تھی۔ وہ تو اپنی نندوں کے رویے دیکھ کر حیران ہوتی رہتی تھی کہ وہ کس ڈھٹائی سے اپنی اور اپنے بچوں کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے بھی ماں اور بھائی کو زچ کردیا کرتی تھیں۔ اپنے شوہروں اور سسرال والوں کی دل کھول کر برائیاں کرتیں اور پھر ان کے لیے بھی بھائی کی جیبیں خالی کرواتی رہتیں۔ اس کے دیور بھی کمال کے انسان تھے۔ ولید نے انہیں پڑھایا لکھایا' انہیں ان کے پیروں پر کھڑا کیا اور پھر بھی وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے ابھی تک اس کا ہی منہ دیکھتے تھے۔

ولید نے اپنا کہا سچ کردکھایا تھا' اس کے لیے اس کے بھائی' بہنیں ہی "اولاد" کا درجہ رکھتے تھے' اس لیے اس نے مہو کو ماں بننے کا حق بھی نہیں دیا تھا' مگر آنے والی روح کو کوئی روک تو نہیں سکتا نا' اس لیے شادی کے چھ سال بعد جب وہ ہر طرف "بانجھ" مشہور ہوگئی تو اس کی گود میں طلحہ اس کے ماتھے کا "داغ" دھونے چلا آیا۔ اس وقت تک اس کے سارے دیور برسر روزگار ہوچکے تھے اور دو کی تو شادیاں بھی ہوچکی تھیں۔ لیکن تب تک مہو اپنا رنگ روپ کھو چکی تھی۔ ولید کی لاپروائی اور سلطانہ کی حاکمیت نے اسے اندر سے کھوکھلا کرکے رکھ دیا تھا۔ گورا رنگ کملا کر پھیکا پڑچکا تھا اور سیاہ گھنے شانوں تک آتے بال گرچکے تھے۔ وہ اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کر "یالچر" جیسی موذی بیماری کا شکار ہوچکی تھی' جس کی وجہ سے اس کا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا تھا۔

"دادی! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں تھک گئی ہوں دادی اور کتنا سہوں؟ اور کیا کیا سہوں؟؟"

مہو' دادی کی گود میں سر رکھے آنسو بہارہی تھی۔ دادی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی ملول ہورہی تھیں۔ مگر ان کے پاس مہو کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس بار جو ٹھیس اس کے نازک دل کو لگی تھی' وہ شاید اس کی برداشت سے بڑی تھی' اس لیے اس کے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اگر سلطانہ اور ان کی اولاد کی نظر سے دیکھا جاتا تو بات بہت معمولی ___ تھی' مگر مہو کے سیدھی دل پر لگی تھی۔

"بھابھی! آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے تو ہمارے ساتھ کھلا کھلا دھوکا کیا تھا' اگر ہمیں پہلے پتا چل جاتا کہ آپ خیر سے اتنی جلدی "گنجی" ہوجائیں گی تو بخدا ہم آپ کی بری میں ڈھیر ساری "وگیں" ہی لے آتے' ایسے ہی امی اور باجیوں نے آپ کی بری پر اتنا پیسہ برباد کیا۔"

وحید کی اس تضحیک آمیز بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا' وہ حیرت اور صدمے سے منجمد ہوکر رہ گئی تھی' جبکہ سلطانہ بیٹے کے اس گھٹیا "مذاق" پر خوب کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ ان کی ہنسی کا ساتھ وہاں موجود ان کی ساری اولادوں بمعہ بہوؤں نے بھی دیا تھا' صرف ولید اور عبداللہ تھے جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

مہو کو امید تھی کہ ولید اب تو اس کا ساتھ دے گا' کوئی ایک لفظ تو اس کی حمایت میں بولے گا' بھائی کو ڈانٹ کر نہیں تو نرمی سے ہی منع کرے گا' مگر ولید کی خاموشی نے اس کی ساری امیدیں توڑ دیں۔ وہ ڈوبتے دل اور چکراتے سر کے ساتھ وہاں سے اٹھی اور روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلطانہ اس کے اس طرح "متخفل" چھوڑ کر جانے پر سخت مشتعل ہوگئیں اور اس کے خلاف ایک محاذ سا کھل گیا۔ اب انہوں نے ولید پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ مہو سب کے سامنے ان سے اور وحید سے معافی مانگے' ورنہ ولید اسے طلاق دے اور یہاں مہو کے ضبط کی انتہا ہوگئی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ میکے آگئی تھی۔

"مہو! صبر کرو بیٹا' دعا کرو کہ اللہ ولید کے دل میں تمہارے لیے محبت اور عزت پیدا کردے اور اس کی آنکھوں پر پڑی لاپروائی کی پٹی کھل جائے۔ بیٹا سچ کہتے ہیں' عورت ہی عورت کی دشمن ہے' اگر سلطانہ چاہتیں تو ولید کو بھی اسی طرح آزاد کرسکتی تھیں جس طرح انہوں نے اپنے باقی بیٹوں کو کر رکھا ہے' مگر جانے کیوں وہ ولید پر ابھی تک صرف اپنا ہی قبضہ رکھنا چاہتی ہیں۔"

"مجھے خود نہیں پتا دادی! کہ امی ایسا کیوں کررہی ہیں' مگر میں سچ کہہ رہی ہوں' میری برداشت کی حد نہیں تک تھی۔ میں ان سے کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہی' صرف تھوڑی سی "عزت" اور اپنا "مقام" اس کے علاوہ تو اور کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے' اور وہ لوگ ہیں کہ مجھے اتنا سا مقام بھی نہیں دے سکتے' جتنا کہ ان کی ملازمہ کو حاصل ہے' تو کیا میں ان کی ملازمہ سے بھی کم تر ہوں؟ اور اگر میرے بال اُتر گئے ہیں یا میں بیمار ہوچکی ہوں تو وہ بھی تو ان کے دیے ہوئے دکھوں کی وجہ سے ہی ہے ناں' میں شروع سے تو ایسی نہیں تھی دادی! پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہے؟" اور یہ سوال ایسے تھے کہ جن کے جواب نہ دادی کے پاس تھے اور نہ ہی کسی اور کے پاس' کیونکہ عورت کو شاید ہر دور میں "داسی" ہی سمجھا جاتا رہا ہے اور شاید آنے والا دور بھی اس کا یہ "اسٹیٹس" بدل نہیں پائے گا۔ کیونکہ یہاں عورت کی دشمن عورت ہے اور مہو جیسی سیدھی اور بے وقوف عورتیں تو شاید پیدا ہی اس لیے ہوتی ہیں کہ سب سے دھوکا کھاتی چلی جائیں' چاہے وہ شوہر ہو یا ساس' نندیں' بس سب کی غلامی کرتے ہوئے انہیں سر پر سوار کرتی چلی جائیں اور ساری زندگی ان کی غلامی کرتے ہوئے ان کی "داسی" بن کر گزار دیں۔

"مہو! گھر چلو... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" مہو کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی کہ دروازہ ہلکی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ یہی سمجھی کہ امی یا دادی آئی ہوں گی' اس لیے اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر خود سویا ہوا ظاہر کرنا چاہا' مگر آنے والا کوئی اور نہیں' ولید تھا' جو اب اس کے قریب کھڑا اسے نیا حکم سنا رہا تھا۔ وہ امید کے سب دیے جب بجھا چکی تو ولید اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ اس ستمگر کی آمد پر خوش ہو' اپنی قسمت پر افسوس کرے کہ اس کا مجازی خدا' اس کی عزت آبرو کا محافظ اس کا شوہر اسے لینے بھی آیا تو اس طرح سر جھکائے ہوئے جیسے کسی گناہ کا مرتکب ہورہا ہو۔ وہ ایک ٹک بس اسے دیکھے جارہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو' اب اٹھو بھی۔ تیاری کرو۔ مجھے تمہیں گھر چھوڑ کر واپس فیکٹری بھی جانا ہے۔" اس نے مہو کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ پوری جان سے ہل کر رہ گئی۔

"مجھے وہاں اکیلا چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے؟ اور... اور کسی سے کچھ بھی نہیں کہیں گے؟ وحید سے کوئی سوال نہیں کریں گے کہ اس نے میرے ساتھ بدتمیزی...."

"بس کردو مہو! بھول جاؤ سب کچھ۔ وحید چھوٹا ہے۔ تم بڑی ہو اور انسان بڑا اپنی عمر سے نہیں عمل سے ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے آج تک

اپنے ہر عمل سے ثابت کیا ہے کہ تم سب سے بڑی ہو۔ عمر میں نہ سہی' برداشت اور حوصلے میں تمہارا کوئی مقابل نہیں۔ سچ کہو تو میں بھی نہیں۔ اسی لیے تو ہمیشہ مشکل وقت میں سب نے تمہاری ہی برداشت کا امتحان لیا۔ حتیٰ کہ میں نے بھی۔۔۔ وحید کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ تمہاری حق تلفی نہ ہو۔ لیکن تم جانتی ہو نا کہ امی۔۔۔"

ولید نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی اور شرمندہ انداز سے کہا تو مہو کا سانس رکنے لگا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے آنکھیں پھاڑے بس اسے دیکھے چلی گئی۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ولید کے لیے اتنی معتبر کب سے ہو گئی کہ اسے اپنے گھر والوں کے رویے نظر آنے لگے اور ان کے لیے اس سے معذرت بھی کرنے لگا۔

"آپ۔۔۔ آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ دوسروں کی غلطیوں کی معافی آپ کیوں مانگ رہے ہیں اور پھر کیا آپ کو معاف کر کے میرا دل سب کی طرف سے صاف ہو جائے گا؟ شاید کبھی بھی نہیں' تو پھر آپ۔۔۔"

"اب اور کچھ مت کہو مہو۔ میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ دادی' امی اور بابا سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی میری۔ میں ان سے بھی معافی مانگ چکا ہوں۔ امی تو شاید مجھے کبھی معاف نہ کرتیں' مگر تمہاری دادی نے انہیں سمجھا لیا۔ اور ان کی رضامندی سے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ کیونکہ دادی کا خیال ہے کہ تکلیف تمہیں پہنچی ہے تو معاف کرنے کا حق بھی براہ راست تمہارا ہی ہے۔ اور اگر تم مجھے معاف کر کے میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو جاتی ہو تو وہ سب بھی مجھے معاف کر دیں گے اور ویسے بھی مہو! تم میری امی کو تو اچھی طرح جانتی ہی ہو۔ وہ کبھی ہار نہیں مانیں گی۔ انہوں نے ہمیشہ حکومت کی ہے اور اب ان کی یہ حاکمیت کی عادت ایسی پختہ ہو چکی ہے کہ وہ کبھی اپنی انا کو نہیں توڑیں گی۔ اگر ہم ان سے زبردستی کریں گے تو وہ خود ٹوٹ جائیں گی' مگر اپنی بات سے نہیں پھریں گی تو کیا تم انہیں ٹوٹا ہوا دیکھ سکوں گی۔"

ولید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑی نرمی اور لجاجت سے کہا تو مہو واقعی کانپ کر رہ گئی۔ سلطانہ کی عادت اور فطرت سے وہ اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ اس لیے جانتی تھی کہ ولید جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔

"نہیں۔۔۔ میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ میری وجہ سے کسی کو اپنی انا کی قربانی دینی پڑے' اپنے تخت سے نیچے آنا پڑے' میں کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں امی کو اچھی طرح سے جان چکی ہوں اور اپنی قسمت کے بارے میں بھی مجھے کچھ خاص خوش فہمی نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس گھر کی داسی ہوں۔ آپ کے گھر والے مجھے اس سے زیادہ اہمیت دے ہی نہیں سکتے' کیونکہ یہ مقام میں نے خود چنا ہے۔ فاریہ اور ہادیہ بھی تو اسی گھر کی بہو ہیں نا' لیکن ان کا مقام مجھ سے بلند ہے' کیونکہ انہوں نے خود پر کسی کو حکومت کرنے کی اجازت نہیں دی' اپنے شوہروں کو بھی نہیں اور میں۔۔۔ میں تو ہمیشہ سے سب کے لیے آسان ٹارگٹ رہی ہوں' سو مجھے اپنے نصیب سے کوئی گلہ نہیں۔"

اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور اٹھ کر واش روم کی طرف چلی گئی۔

ولید نے اپنے دل پر ایک بھاری بوجھ گرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ مہو کی باتیں اس کا دل دکھا گئی تھیں' مگر وہ کیا کر سکتا تھا کہ اتنی عمر ہونے کے باوجود بھی' ابھی تک اس میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہو سکا تھا کہ اپنے بھائیوں کی طرح اپنی بیوی کی ڈھال بن سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی اس کا اور مہو کا سفر ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس کے شانوں پر ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ موجود تھا۔ ابھی چھوٹے دو بھائی رہتے تھے بیاہنے والے اور پھر بہنوں کے بچے بھی جوان ہو چکے تھے اور وہ ان کے لیے بھی رشتے دیکھتی پھر رہی تھیں' ایسے میں جانے کب تک اسے "بے دام کے غلام" اور مہو کو "داسی" کا کردار نبھانا تھا' یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

☆

حنا ابرار

میں ہوں ہیرو تیرا

اس سے اگلی صبح کا قصہ تھا۔ وہ گھر سے بغیر ناشتا کیے نکلا تھا۔ کیونکہ صبح ہی صبح چوزے کے دم توڑنے کی خبر اس تک بطور خاص پہنچ چکی تھی۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ ابھی بھی بے زار سا دوستوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہیرو؟“ سوال فوری پوچھا گیا۔

”قتل۔“ جواب بھی فوراً ہی دیا گیا۔

وہ تینوں اچھلے۔ ”پتا نہیں کیا بول رہا ہے۔ شاید نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ دیکھو کہیں بخار تو نہیں ہے۔“ حمزہ نے فوراً پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ شرجیل نے جھنجلا کر اسے پرے کیا۔

”بند کرو یہ اداکاری کمینوں۔ تم سب پر گزرے تب پتا چلے۔“

”جناب آپ کوئی بکواس کریں تو ہی سمجھ میں آئے گی نا۔“ سعد نے پوچھا۔

”کل میرے ہاتھوں اس کا لاڈلا چوزہ اپنی آخری

آرام گاہ کو پہنچا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ قتل مجھ سے نادانستگی میں ہوا۔ وہ میری بائیک کے نیچے آگیا تھا۔ خدا گواہ ہے' میں نے اسے دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور شہید ہو جاؤ۔"

"اس چوزے پر فاتحہ پڑھ لو میرے دوست۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔" حمزہ نے تسلی دی۔

"یار! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں لڑکی ہونے کے کتنے فائدے ہوتے ہیں۔ اپنے ہیرو کے دل تک رسائی کے لیے وہ کبھی معدے کے راستے کا انتخاب کرتی ہے' کبھی اپنی سلیقہ مندی اور ہنر مندی کے ذریعے ہیرو پر اپنی قابلیت کی دھاک بٹھاتی ہے اور کچھ نہیں تو سج دھج کے یا پھر حسن بے پناہ سے ہیرو بے چارے کے دل کو گھائل کرتی ہے۔ اس پر اداؤں اور شوخی کا تڑکا.... واہ...." سعد نے اتنے مزے سے نقشہ کھینچا کہ سب کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"بھائی میرے! وہ اور زمانوں کی ہیروئن ہوا کرتی تھیں۔ آج کے دور کی لڑکیوں کی اسکن کھانے پکانے سے خراب ہوتی ہے۔ وہ اچھا کھانا کھا تو سکتی ہیں' پکا نہیں سکتیں۔ وہ سلیقے مندی' وہ ہنر مندی تو خواب ہوئی۔" حمزہ نے حقیقت پر روشنی ڈالی۔

"اب ایسی بھی اندھیر نہیں مچی ہوئی۔" سعد کو اعتراض ہوا۔

"یہ بتا شرجیل! کہ تو کس ادا پر فدا ہوا۔"

"بس وہ مجھے اچھی لگتی ہے' تب سے جب ہم ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ میری ہیروئن تو ہے' لیکن شاید میں اس کا ہیرو نہیں ہوں۔ نہ ہی سر توڑ کوشش کے بعد بن سکا۔ وہ اپنے غرور میں بگڑی اور میں اس کے پیار میں اندھا۔ نہ جانے یہ روگ کب سے میری جان کو لگا ہے۔ تب سے جب ہم ساتھ کھیلتے تھے یا تب سے جب سے اس نے میرے بالوں کو کھینچ کھینچ کر ہنستے رہنے کا مشغلہ اپنا لیا تھا۔ وہ اکثر معصوم بنی مجھ کمزور پر اپنا وزنی بیگ لاد کر لایا کرتی تھی۔ جانتا نہیں' وہ کون سی حسین ساعت تھی' جب یہ واردات ہوئی اور میں گوڈے گوڈے اس کے پیار میں ڈوب گیا اور کب یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے اس کا ہیرو بننا ہے۔" شرجیل کے چہرے پر ایک خوش کن مسکراہٹ تھی۔

"پر مسئلہ تو یہ ہے نا کہ وہ ہیروئن بننا چاہتی ہے کہ نہیں۔"

"کیوں نہیں بنے گی۔ ماشاء اللہ! اللہ نظر بد سے بچائے' ہمارا شرجیل لاکھوں میں ایک ہے۔" حمزہ نے آنکھیں چندھیا کر' تنقیدی نظروں سے شرجیل کو دیکھا۔

"اونچا لمبا' ہینڈسم' قابل' سگھڑ' وفا شعار' سلیقہ مند۔ ہزار میں سے سونہ سہی تو دو ہی سہی اس پر مرنا نہ سہی' اسے مارنا تو شاید پسند کریں ہی۔" تینوں کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اتوار کے دن کی روشن صبح ہر سو چھائی تھی۔ ہر چیز نکھری اور صاف محسوس ہوتی تھی۔ وہ بھی فریش سا لان میں ہی آگیا۔ لان میں کرکٹ کا زبردست میچ چل رہا تھا اور اسے بھی شمولیت کی دعوت دے دی گئی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں بھی کھیلتا ہوں' مگر پہلے اس میچ کو تو ختم کرلو۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ ناشتے کا دور بھی ابھی چل رہا تھا۔ اس لیے خواتین کچن میں مصروف تھیں۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ اندر سے ناشتا آیا تو وہ ناشتا کرتے کرتے میچ دیکھنے لگا۔ اس کا ناشتا ختم ہوتے ہی میچ بھی ختم ہو گیا اور نئے میچ کے لیے ٹیم بننے لگی۔ شرجیل کی ٹیم فیلڈنگ کر رہی تھی۔

وہ بھی شاید ابھی اٹھی تھی اور شور سن کے لان میں ہی آگئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے زاری تھی۔ وہ بھی وہیں کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گئی۔ اتوار کے دن سب اپنی مرضی سے جس وقت چاہتے اٹھتے تھے۔ اس کا شاید ابھی مزید سونے کا ارادہ تھا' لیکن ان کے شور نے اسے ڈسٹرب کر دیا ہوگا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر غیر دلچسپی سے میچ

دیکھنے لگی۔ عمر نے اسے بھی کھیلنے کی دعوت دی، مگر اس نے انکار کردیا۔ آس پڑوس کے بچوں سمیت اپنے گھر کے بچے بھی سارے ہی کھیل میں مصروف تھے۔

شرجیل نے ایک خوش شکل سی مسکراہٹ اس کی سمت روانہ کی، لیکن اس کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔ ابھی چوزے کے بچھڑنے کا غم تازہ تھا۔ مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ ملے تو اگلی مسکراہٹ ٹرائی کرنی چاہیے۔ وہ اگلی سے اگلی مسکراہٹ ٹرائی پر ٹرائی کر رہا تھا، لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ عدی کی ساری ٹیم آؤٹ ہوچکی تھی۔ شرجیل کی ٹیم بیٹنگ کرنے لگی تھی۔ حورشمائل نے وہیں پڑا سنڈے میگزین اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ شرجیل کریز پر کھڑا تھا۔ اس کا جوش دیدنی تھا۔ مگر اس کی قسمت..... وہ شاید خراب تھی..... کوئی زبردست سا چوکا چھکا نہیں لگ رہا تھا۔ شاید اس پر عجلت سوار تھی۔ حورشمائل بھی کبھی کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتی تھی۔

اور یہ لگا چھکا..... ایک دم بڑھ جانے والے شور پر اس نے اوپر دیکھا۔ سب بچے بہت اچھل رہے تھے۔ شرجیل نے چھکا مار کے گیند پڑوسیوں کے ہاں پھینکی تھی۔ اس لیے اس کی ٹیم والے بہت خوش تھے۔ جیسے ہی اس نے اوپر دیکھا۔ شرجیل نے بھی اسی لمحے اسے دیکھا اور شمائل کو لگا وہ مسکرایا ہے۔ اس نے چہرے پہ مزید کرختگی پیدا کی اور میگزین سائیڈ ٹیبل پر پھینک کر اٹھ گئی۔ شرجیل نے اسے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اگلی گیند کی سمت متوجہ تھا۔ اس نے بیٹ گھمایا اور سب کی نظریں فضا میں بلند ہوتی گیند پر تھیں۔ پرجوش نعرے لگے اور تالیاں بجائی گئیں اور اگلے ہی لمحے حورشمائل کو لگا پہاڑ اس کے سر پر گرا ہے۔

شور یکایک تھما اور سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ گیند سیدھی آکر حورشمائل کے سر پر لگی تھی۔ شرجیل بے چارے کو ہیرو سے زیرو بننے میں وقت نہ لگا۔ اب بس حورشمائل کے چہرے کو دیکھنا باقی تھا۔ کیونکہ ابھی اس نے مڑ کے نہیں دیکھا تھا..... اور جیسے ہی اس نے اسے مڑ کر دیکھا، وہ جان گیا کہ اس کا "ہیرو" بن جانا اب بہت مشکل ہوگیا ہے۔

شرجیل اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے کرکٹ کھیلنے کی ہامی بھری تھی۔ پہلے ہی ستارے گردش میں تھے۔ اب تو گول گول گھوم رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود کو لعنت ملامت کرتا تھا کہ کیا ضرورت تھی اس نک چڑھی پر دل ہارنے کی جو اس کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ پہلے پہل تو سوچا سیدھا جا کے اظہار محبت کردے، پھر نتائج پہ نگاہ گئی تو جھٹ توبہ کرلی۔ اور وہ حورشمائل، ڈراموں، فلموں اور ناولوں کے ہیرو تو اسے بند آنکھوں سے بھی نظر آتے ہیں مگر حقیقی زندگی کا ہیرو اسے چشمہ لگا کے بھی نہیں نظر آتا تھا۔ وہ اور لڑکیاں ہوتی ہوں گی جن کو ہیرو کی ایک مسکراہٹ بھی نظر آتی تھی۔ وہ تو پتھر تھی پتھر۔

☆ ☆ ☆

اسے بچپن کا وہ واقعہ بخوبی یاد تھا، جب ہوم ورک کرتے ہوئے حورشمائل نے اس سے مدد مانگی۔ وہ اس سے ایک کلاس پیچھے تھی مگر دونوں ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔

"شرجیل! تم میرے لیے یہ مضمون لکھ دو۔ ٹیچر نے کہا تھا سب کا ایک دوسرے سے بالکل ڈیفرنٹ ہونا چاہیے۔ پلیز لکھ دو اچھا سا۔" اس نے ایسی معصوم صورت اور آس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اس کا دل پسیج گیا اور اس نے ہامی بھرلی۔

"میرے لیے ایسا مضمون لکھنا کہ اس جیسا کلاس میں کسی اور کا نہ ہو۔" وہ ایک دفعہ پھر کہہ کے چلی گئی۔ شرجیل نے اس کی کاپی اٹھائی، چند لمحے سوچا اور پھر لکھنے لگا۔

"اوہو! ایسے تو ٹیچر کو پتا چل جائے گا کہ یہ شمائل نے نہیں لکھا۔" اس نے حورشمائل کا بیگ ڈھونڈا۔ اس میں سے اس کی اردو کی کاپی نکالی۔ چند لمحے اس کی لکھائی کو غور سے دیکھا اور پھر لکھنے لگا۔ اس نے بہت دلجمعی سے مضمون مکمل کیا۔

اگلے دن نتائج بھی سامنے آگئے اور نتیجہ بھی ایسا کہ شرجیل بے چارے کی آنکھیں ابل پڑیں۔ چھٹی کے وقت۔ شمائل کی آنکھیں سرخ سی تھیں۔ اس نے پوچھا مگر شمائل نے مزید منہ پھلالیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر پہنچنے کے بعد ابھی وہ یونیفارم بدل رہا تھا' جب امی حضور کے پاس اس کی طلبی ہوئی۔ ایسی طلبی اس وقت ہوتی تھی جب اس نے ٹیسٹ خراب کیا ہوتا یا اسکول سے شکایت ملتی تھی۔ جب وہ وہاں گیا تو ایک عدالت لگی ہوئی تھی اور مجرم وہی تھا۔

"بڑی امی پوچھیں اس سے کیوں کیا اس نے ایسا۔ مجھے ٹیچر نے ساری کلاس کے سامنے ڈانٹا اور کہا کہ تمہیں شرم نہیں آئی کہ تم نے ایک چھوٹے بچے سے مضمون لکھوالیا۔۔۔ کتنی گندی لکھائی میں لکھا ہے اس نے۔۔۔" حور شمائل نے کاپی نکال کے امی کے ہاتھ میں دی۔

"میں نے تو تمہاری رائٹنگ کو کاپی کیا تھا' تاکہ تمہیں ٹیچر۔۔۔" وہ منمنایا۔

"میری رائٹنگ ایسی ہے؟" حور شمائل کو گہرا صدمہ پہنچا۔ "یعنی میری رائٹنگ۔ اف۔۔۔ بقول ٹیچر کے یہ رائٹنگ تو ایسی ہے جیسے چیونٹی نے سیاہی میں غوطے لگانے کے بعد صفحے پر چہل قدمی کی ہو۔۔۔"

"شرجیل! یہ تم نے لکھا ہے؟" اب امی نے مضمون پڑھ لیا تھا اور اس کی کلاس کا آغاز ہوچکا تھا۔ امی نے دانت کچکچائے اور حور شمائل نے پھر رونا شروع کردیا۔ بڑی امی کی تو حیرت ختم نہیں ہو رہی تھی کہ یہ ان کے قابل اور ہونہار سپوت نے لکھا ہے۔ مضمون کے کچھ چیدہ چیدہ جملے یہ تھے۔

"ہمارا گھر بہت پیارا اور بڑا ہے۔ سب کے الگ الگ کمرے ہیں۔ ہم اسٹور روم بھی سونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (ہیں؟) مگر تب جب امی اور بابا کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے۔" (ایک تلخ حقیقت۔۔۔)

"ہمارا کچن بہت بڑا ہے اور اس میں بہت سارے برتن ہیں۔ ہم برتنوں میں کھانا بھی کھاتے ہیں اور امی' دادی کا غصہ بھی انہیں توڑ کر نکالتی ہیں۔" (آہ!) امی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ہمارے گھر میں۔۔۔ (آہ پھر سے۔۔۔) غسل خانے بھی ہیں۔ (اوروں کے گھروں میں نہیں ہوتے کیا؟) جو سارے کے سارے خوب صورت ہیں۔ (استغفر اللہ) مگر اس کونے والے میں ہم بچے' چھپائی ہوئی کھانے کی چیزیں بھی کھاتے ہیں۔ (وہاں کسی کے آنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔)"

"بس! یہ "ٹوبچ" ہوگیا تھا۔ اب برداشت ختم ہوگئی تھی۔ سچ کڑوا ہوتا ہے' سنا تو تھا' مگر اتنا کڑوا۔۔۔ اف۔۔۔ پھر جو ہوا' وہ در و دیوار نے دیکھا اور سنا مگر برداشت ہمارے ہیرو نے کیا۔۔۔ چہ چہ۔۔۔ اس نے تو نیکی کی تھی مگر نیکی کا ایسا انجام۔۔۔"

"امی! شمائل نے کہا تھا کہ میرا مضمون سب سے منفرد ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے ایسا لکھا۔ آپ ہی تو کہتی ہیں سچ بولنا چاہیے۔" بڑی امی تو ہاں کرنے لائق رہی بھی نہ۔ "نہ" کرکے اب کیا کہتیں کہ بیٹا سچ بولنا چاہیے' مگر لکھنا۔۔۔ اونہوں۔۔۔ اور یوں ہمارے ہیرو کے ہیروپن کا ہر کام بچپن سے ہی الٹا ہوتا گیا۔

اس واقعے کو یاد رکھتے ہوئے حور شمائل نے پھر کبھی اس سے مدد نہیں مانگی تھی۔ ویسے بھی بڑے ہوکر دونوں کے مضمون ہی ایک نہیں رہے تھے۔ اب بھی جب کبھی وہ اپنے لکھے ہوئے مضمون کے بارے میں سوچتا تو حیران ہوتا۔ اس کی وجہ سے شمائل کی کلاس میں درگت بنی تھی۔ اور شمائل کی وجہ سے اس کی گھر میں۔۔۔

☆ ☆ ☆

آج کل وہ یونی ورسٹی سے فارغ تھا۔ فائنل امتحان ہونے والے تھے۔ اس لیے آج کل آرام سے بارہ بجے جاگتا اور دن بھر پڑھائی تو خاک کرنی ہوتی تھی۔۔۔ بس مٹرگشت کرتا رہتا۔ آج خوش قسمتی سے چاچو کی گاڑی ہاتھ لگی تھی۔ گاڑی تو نئے ماڈل کی نہیں تھی' مگر خیر۔۔۔ چار پہیوں سے چلنے والی تو تھی۔ دوپہر کے بعد

اس کا اپنے ایک دوست کے ہاں جانے کا ارادہ تھا۔ تیار ہو کے جب وہ باہر نکل رہا تھا تو اس نے حور شمائل کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھا۔ وہ گلا کھنکھارتا وہیں آگیا۔

"امی! ایک دوست کے ہاں جانا ہے۔ رات کو واپس آؤں گا۔" وہیں سے پکار کر امی سے کہا۔ ایک اچٹتی سی نظر اس پر بھی ڈالی۔ وہ بھی تیار سی لگ رہی تھی۔ میگزین کے ورق پلٹتے ہوئے اس نے اس کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

"کہیں جا رہی ہو؟" اس نے بالآخر سوال کو باہر آنے کی اجازت دی۔

حور شمائل نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ "ہاں..." یک لفظی جواب ملا تھا۔ اس کا دل چاہا اب منہ بند کرلے مگر یہ دل... اف...

"کہاں؟" اس نے سرسری سا پوچھا۔ اس پر اپنی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اب کی بار میگزین بند کر کے اسے خاصی فرصت سے دیکھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے بظاہر مصروف تھا۔

"میری ایک دوست کی منگنی ہے۔"

"کہو تو میں چھوڑ دوں؟" ایک لمحے کو نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"کس چیز پر؟" پوچھا گیا۔

"جہاز لے جانے سے تو رہا۔ ظاہر ہے گاڑی پر..."

"اپنی گاڑی تو تمہارے پاس ہے نہیں۔ اگر چاچو کی گاڑی لے جانے کا ارادہ ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گاڑی خراب کھڑی ہے اور تمہاری اس کھٹارا سی موٹر بائیک پر میں نہیں جاؤں گی۔ جس پر بیٹھنے کے لیے اگر کوئی مجھے پیسے دے تو بھی نہ بیٹھوں۔" اس نے چبا چبا کے کہا۔ پتا نہیں کس بات کا غصہ نکالا تھا اس پر... اور تن فن کرتی وہاں سے چلی گئی۔

توبہ یہ لڑکی... اس کی زبان نہیں تلوار ہے۔ کیسے کٹے گی اس کے سنگ زندگی شرجیل جاناں...

امتحان شروع ہوئے اور انجام کو بھی پہنچ گئے۔ شرجیل کا شمار ان طالب علموں میں ہوتا تھا جو پرچے کی رات بیٹھ کے دل لگا کے پڑھتے ہیں اور پھر پیپر دیتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

تھکاوٹ بہت ہو گئی تھی۔ اس لیے ان دنوں وہ اپنی تھکاوٹ اتار رہا تھا۔ اس کا وہ مسئلہ جو اس کے ساتھ ساتھ بڑا ہوا تھا' ہنوز باقی تھا۔ اب تو اس نے کوشش بھی ترک کر دی تھی۔ اس دن بطور خاص امی نے اسے بلایا۔ دروازہ بند کر کے کمرے میں اپنے روبرو بٹھایا۔ اس کے خیال میں معاملہ کچھ مشکوک سا تھا کیونکہ امی اور یہ انداز' اسے کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"شرجیل! تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔" امی نے مدعا بیان کرنے سے پہلے گویا اسے آگاہ کیا۔

"جی امی!" وہ سر جھکا کر ہمہ تن گوش ہوا۔ اندر ہی اندر حیران بھی ہو رہا تھا۔ مگر امی پہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

"اگر میں تمہارا رشتہ اپنی مرضی سے اپنی پسند کی جگہ پر طے کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

بلی نے تھیلے سے سر نکال لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ اچھلا۔ حیرت سے منہ کھلا۔ مگر کہا کچھ نہیں۔ امی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اسے قطعاً" اندازہ نہیں تھا کہ امی اس طرح کچھ پوچھیں گی۔ اس کی نظروں میں اپنی بچپن کی محبت کا خیال آیا۔ وہ ساری کوششیں جو اس نے کی تھیں۔ اور ان ساری کوششوں کا نتیجہ؟؟ اس کی محبت کا سفر بہت خطرناک تھا اور پھر اسے یاد آیا کہ اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ ہر دفعہ اس کا معصوم دل ٹوٹا تھا۔

چند لمحے سوچا اور پھر اس نے مشرقی لڑکی کی طرح اماں' ابا کی پسند پر سر جھکانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کسی نہ کسی کو تو اس روایت کو قائم کرنا تھا تاکہ زمانے میں مثال تو باقی رہے۔ دل کڑا کر کے محبت پر فاتحہ پڑھی۔ اب اگر دنیا نہیں مل رہی تو امی کی بات مان کر تھوڑا ثواب ہی کما لے۔ آخرت تو سنور جائے گی۔

"جی امی! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

✲ ✲ ✲

اوہ! کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ اقرار کرتے ہوئے۔ کتنا فرماں بردار تھا وہ۔ اسے خود پہ پیار آیا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کے دل کا خون ہوا تھا۔

"شاباش! مجھے تم پہ پورا یقین تھا۔" امی بے پناہ خوش ہوئیں۔ اس کے سر پہ بوسہ دیا۔ وہ زبردستی مسکرایا۔ حالانکہ اندر کی حالت خراب تھی۔ اب کچھ دن اسے اپنی محبت کی موت پر ماتم تو کرنا تھا۔

"ویسے امی آپ کی مرضی ہے کہاں؟" اس نے امی کے خوش گوار موڈ کا فائدہ اٹھاتے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"یہیں اسی گھر میں..... میں کیوں کسی اور در کی خاک چھانوں۔" امی کا جوش دیدنی تھا۔ وہ ٹھٹکا۔

"مطلب؟" دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔

"ہماری حور....." شرجیل کو لگا ارد گرد چراغاں ہوا ہے۔ اف! اتنی روشنی..... مطلب کہ..... حور..... حور شمائل..... دل چاہا اٹھ کر ناچے۔ مگر بہر حال اپنی بے پناہ خوشی کو ظاہر کیے بغیر اس نے خود پر قابو پایا۔ امی باہر چلی گئیں۔ اسے لگا کہ وہ بغیر ایکشن کے ہیرو بنا ہے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کبھی یہ خیال آیا ہی نہیں تھا۔ مگر کچھ کام یوں بھی ہو جاتے ہیں۔ بغیر کسی امکان کے اور ان کی خوشی بھی بے پایاں ہوتی ہے۔ وہ یہ سب سوچتے ہوئے اٹھا۔ آج کی رات تو خوشی کے مارے نیند ہی نہیں آئے گی۔

☆ ☆ ☆

ابھی تو خوشی کو ملے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کو نئے اندیشوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کیا خبر وہ ہی انکار کر دے۔ پھر کیا ہو گا۔ اور اس کے بعد سوچا ہی نہ جاتا۔ وہ خوشی ان بے نام اندیشوں میں جا گھسی۔ اپنی فکروں' اندیشوں سے بہت تنگ آکر اس نے امی سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

"شرجیل! وہ راضی ہے۔ چند دنوں میں چھوٹا سا منگنی کا فنکشن رکھ لیں گے۔ تم کیوں فکر کر رہے ہو۔ ارے' مسئلہ تو تمہارا تھا۔"

امی نے اس کی شکل کو دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ آج کل ان کا مزاج بہت اچھا ہو رہا تھا۔ اسے یک گونہ اطمینان ہوا۔ وہ سر جھٹک کے اپنے کمرے میں چل دیا مگر اس کا یہ اطمینان بھی گویا عارضی تھا۔ کیا پتا وہ راضی نہ ہو اور اسے زبردستی راضی کیا گیا ہو۔ نہیں' نہیں..... اسے نہیں منظور' زبردستی کے یہ سودے۔ وہ تو اسے اتنا ناپسند کرتی تھی پھر اب رشتے پر کیسے راضی ہو گئی۔ بچپن سے اب تک کی کوئی خوش گوار یاد تو اس کے حافظے میں محفوظ نہیں تھی۔ پھر یک دم یہ کایا پلٹ کیسی۔ وہ سوچتا رہا اور سوچ سوچ کے پریشان ہوتا رہا۔ انہی سوچوں میں گھر کر اس کا رہا سہا اطمینان و سکون بھی جاتا رہا۔

"میں اس کی سیکنڈ چوائس کبھی نہیں بنوں گا۔ مجھے زبردستی کی یہ خوشیاں نہیں چاہئیں۔ اگر وہ راضی نہیں تو ٹھیک ہے۔ دنیا میں ہزاروں لوگ ٹوٹے دل کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں بھی رہ لوں گا۔ مر نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی آدھا غم تو میں منا ہی چکا ہوں۔"

کوئی کام جسے آپ اپنا پورا زور لگا کر بھی نہ کر سکے ہوں اور ناممکن مان کر چھوڑ چکے ہوں' جب وہی کام بغیر کسی محنت کے یوں اچانک ہو جائے تو انسان اسی طرح حیران ہوتا ہے۔ اس کی بے یقینی اسے خوش نہیں ہونے دے رہی تھی۔ تنگ آکر اس نے حور کے روبرو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن کتنے ہی دنوں سے حور شمائل اسے نظر نہیں آرہی تھی۔

"یقیناً" اس نے ہنگامہ کیا ہو گا اور چچی نے غصے سے کمرے میں بند کر دیا ہو گا۔ کیا پتا وہ رو رہی ہو۔"

اس کا اختیار سوچ کے گھوڑے دوڑانے پر تھا اور وہ یہی کام پوری جانفشانی سے کر رہا تھا۔ کچھ الجھا الجھا سا وہ حور شمائل کے کمرے کی طرف آیا۔ اس نے سر جھٹک کر چہرے پر ہاتھ پھیرا اور دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد دروازہ کھلا اور حور شمائل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بہت حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"خیریت! میرا مطلب کوئی کام تھا؟" وہ رو تو نہیں رہی تھی البتہ کافی بوکھلا گئی تھی۔

"ساری باتیں یہیں دروازے پر کھڑے کھڑے کرلوں کیا۔ اندر تو آنے دو۔" وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ اندر آگیا اور صوفے پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا؟" اس نے بات کا آغاز کیا۔ حور نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیا تم اس رشتے سے خوش ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں کی گئی؟"

"کیا مطلب! یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔" وہ خاصا الجھ کے بولی۔

"کیوں مجھ سے کیوں؟" شرجیل کی حیرت بجا تھی۔

"بھئی! تم نے زندگی میں کوئی ایسا کام تو کیا نہیں جس سے مجھے پتا چلتا کہ میں تمہیں تھوڑی ہی سہی لیکن اچھی لگتی ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک کتنا وقت گزر گیا۔"

"بچپن کہاں سے آگیا۔ رشتہ تو ابھی طے ہوا ہے۔" اس نے پورے جملے میں یہی لفظ پکڑا تھا۔

"نہیں..... یہ بچپن سے طے تھا۔ تم لاعلم ہو؟"

"بے خبر..... لاعلم..... پاگل..... بے وقوف..... سب ہوں میں....." وہ چلا اٹھا۔

"ہو تو ویسے سب..... لیکن پاگل تو خاص طور پر ہو۔" اس نے زیر لب کہا۔

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"ہم لڑکیاں گھروں میں رہتی ہیں شرجیل صاحب..... اور کھڑکیوں دیواروں کی طرح ہمارے بھی کان ہوتے ہیں۔ ہم اپنی اس حس کا بخوبی استعمال کرتی ہیں اور جب اس قسم کی بات ہو تو پھر ہمارا ہر عضو سننے لگتا ہے۔"

"تو تم میری بچپن کی منگیتر تھیں؟"

"ہاں! اور اس بات پر مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔ کسی نے اپنی منگیتر سے ایسا ظالمانہ سلوک نہیں کیا ہو گا جو تم کرتے رہے ہو..... ہائے..... مجھے مارتے رہے میرا دل جلاتے رہے۔ کیا کچھ نہیں کیا تم نے....."

"تم نے تو جیسے مجھے دلی سکون اور اطمینان پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ یہ سوچو، کب کب تمہارا ہاتھ میرے دل کے خون سے نہیں رنگا۔ ویسے تم نے کبھی بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ تم سب جانتی ہو۔"

"میں کیوں ظاہر کرتی۔ یہ کام تو تمہارا تھا۔ تم نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں دلایا کہ میں تمہیں پسند ہوں۔ تم نے تو ہر دفعہ ہر جگہ مجھے یہی شو کیا کہ میں تمہیں زہر لگتی ہوں۔ اب بھی چچا کے زور پر ہاں کی ہو گی تم نے منگنی کے لیے....."

دل کی کتابیں کھلیں تو ایسی ایسی باتیں سامنے آئیں کہ یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر تو گویا کسی نے چابی دے دی تھی۔ الزام لگے شکایتوں کا دفتر کھلا عذر تراشے گئے صفائیاں پیش کی گئیں۔ اپنی بے قصوری کی یقین دہانی کی گئی دکھڑے روئے گئے خود پر گزری وارداتوں کا احوال سنایا گیا اور بالآخر مطلع صاف ہو گیا۔ بدگمانیاں ختم ہوئیں تو ہیروئن کو ہمارا ہیرو نظر آگیا۔

اب غور سے دیکھو تو حور شمائل کی آنکھیں روئی روئی سی تھیں۔ شاید اس طربیہ ڈرامے میں وہ روئی بھی تھی۔ مگر یہ بھی اچھا ہوا کہ ساری غلط فہمیاں دھل گئیں۔

"جس نے میری راتوں کی نیند تو خیر نہیں چرائی تھیں مگر دن کا سکھ چین اور سکون ضرور حرام کیا تھا۔

وہ بالآخر میری ہوئی۔" ہیرو کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

"جس نے میرے چوزے کا خون کر دیا اس قاتل سے میرا نصیب پھوڑ دیا گیا۔" وہ ہنسی اور اس کی ہنسی کی جلترنگ نے اس کے دل کو "محبت کے جذبے" کا ممنون بنا دیا۔

ایمل رضا

"منال بنت ثریا کوثر"

اس نے بلند آواز سے کہا۔ بنا ڈرے 'بنا جھجکے۔ مدت ہوئی یہ دونوں وصف اس کی ذات میں سے ختم ہو چکے تھے۔ ڈرنا' جھجکنا۔ ساری کلاس اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ لڑکیاں آہستہ آواز میں ہنسی بھی تھیں۔

"اپنے والد کا نام بتائیں منال!"

"منال بنت کوثر!" وہ ایسے ہی سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا یہ انداز بھی اب پرانا ہو چکا تھا۔ بات ایسے کرتی کہ کوئی دوسری بات پوچھنے یا کہنے کی ہمت ہی نہ رہتی۔

"کیا ثریا کوثر آپ کے والد کا نام ہے؟"

"نہیں' میری والدہ کا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ وہ ٹیچر کی طرف دیکھ رہی تھی اور بلیک بورڈ کی سی گہری سیاہی اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔ جو اس بات کا اشارہ دیتی تھی کہ اسے خوب پتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"آپ کے والد کا نام کیا ہے؟"

"میرے والد نہیں ہیں۔"

"اوہ! کیا وہ حیات نہیں ہیں؟"

مکمل ناول

"معلوم نہیں۔۔۔ بس وہ نہیں ہیں۔"

"بچوں کے ساتھ والد کا نام ہی لکھتا ہے۔۔۔ ساری کلاس نے اپنا تعارف جیسے کروالیا ہے' آپ بھی ویسے ہی کرائیں۔۔۔ منال بنت۔۔۔ اپنے والد کا نام بتائیں اور پھر اپنا تعارف دہرائیں۔"

وہ فرسٹ ایئر کی پہلی کلاس تھی اور مس ناز اسلامیات کی ٹیچر' اپنا تعارف کروانے کے بعد سب سے متعارف ہو رہی تھیں۔

"میں ان کا نام نہیں جانتی۔" اس نے بے جان لہجے میں کہا۔

مس ناز نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ فرسٹ ایئر کی طالبہ کو اپنے والد کا نام نہیں معلوم۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"آپ کو معلوم نہیں یا آپ بتانا نہیں چاہتیں۔۔۔؟" وہ جلد ہی اصل بات تک پہنچ گئیں۔

"میں اپنی زبان پر ان کا نام نہیں لانا چاہتی۔" اس نے کہا۔

"وہ اچھے ہیں یا برے' آپ کے والد ہیں۔۔۔ آپ ان کا نام بتائیں۔" مس ناز نے قدرے سختی سے کہا۔

"میرا کوئی باپ نہیں ہے۔ میں صرف ثریا کوثر کی بیٹی ہوں۔۔۔ آپ کو میرے پرسنل معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"

مس ناز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فرسٹ ایئر کی پہلی کلاس کی پہلی میٹنگ' اتنی بدتمیز۔

"مجھے اپنا پورا نام' اپنے والد کے نام کے ساتھ بتائیں اور اپنی سیٹ پر بیٹھ جائیں ورنہ میں آپ کو کلاس سے باہر نکال دوں گی۔"

"آپ مجھے کالج سے بھی نکال دیں گی تو بھی میرا نام منال بنت کوثر ہی رہے گا۔" بات کڑوی تھی' آواز دھیمی اور نظریں جھکی ہوئیں۔

مس ناز چند لمحے اسے دیکھتی رہیں' پھر انہوں نے کہا۔ "آپ کلاس ختم ہونے کے بعد مجھ سے ملیں۔"

وہ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سب لڑکیاں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اگر ساری دنیا بھی اسے گھورتی تو بھی اسے پروا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

پرانے سامان سے بھرے' قدیم سے کمرے میں۔۔۔ ٹی وی ڈرامے کی آواز گونج رہی تھی۔ پھر بھی جیسے بہت خاموشی تھی۔ اسد ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ دیکھ تو وہ بھی رہی تھی لیکن متوجہ نہیں تھی۔ ٹیڑھی آنکھوں سے وہ انہیں ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جن کی خاموشی آج وحشت انگیز تھی اور اس بات کا پتا دیتی تھی کہ آج کالج میں کلاس کی بات ان تک پہنچ چکی ہے۔ کیسے؟ اسے نہیں معلوم تھا۔ نہ ہی اسے اس بات سے کوئی سروکار تھا۔ لیکن ان تک پہنچ چکی تھی اس بات کا اسے یقین تھا۔ محلے کی لڑکیوں یا نادیہ کے ذریعے وہ جان گئی تھیں اور اب خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ ویسے بھی کم بولتی تھیں۔ بولتی بھی تھیں تو لگتا تھا جیسے کوئی التجا ہی کر رہی ہوں۔ لیکن آج وہ ضرورت سے زیادہ ہی خاموش تھیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا' نماز پڑھی' شام کی چائے پی اور یہ سب انہوں نے بنا کوئی بات کیے' کیا۔ اب رات کا کھانا بھی کھایا جا چکا تھا۔ پھر سونے کے لیے بھی وہ جلد ہی لیٹ گئیں۔

آنے والے دو دن بھی ایسے ہی گزر گئے۔ منال نے ان سے معذرت کی اور ان سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ صرف سنتی رہیں۔ ایسے جیسے کہہ رہی ہوں کہ جو مرضی کرو۔۔۔ بیماریوں سے ان کا چہرہ ویسے ہی مرجھایا رہتا تھا۔ لیکن ان دو دنوں میں یہ چہرہ اور مرجھا گیا تھا۔ منال کو خود پر غصہ آیا اور اپنی قسمت پر طیش۔ ان دونوں جذبوں نے مل کر اسے بے چین سا کر دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ انہیں تنگ کرتی تھی لیکن وہ خود سے مجبور تھی۔۔۔ اپنی عادت سے۔۔۔ اپنی تقدیر سے۔۔۔ ہر چیز سے۔۔۔

وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر بات کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اپنے باپ سے اتنی

نفرت کرنے لگی ہو کہ تم نے کہا کہ تم ان کا نام اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتیں۔ میں نے تمہیں یہ سبق تو نہیں دیا۔۔۔؟"

"ایسے سبق دیے نہیں جاتے' یہ تو وقت کے ساتھ خود ہی مل جاتے ہیں۔"

"تم نے کشف کی شادی میں لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔ پھر میری ناراضی پر تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم دوبارہ کبھی ایسی بات نہیں کرو گی۔"

"میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ میں نے دوبارہ کبھی ایسا نہیں کہا۔ مس ناز سے بھی نہیں۔"

"تم جانتی ہو' زندہ باپ کو مار دینا کیسا ہوتا ہے۔ یتیمی کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔ تم جانتی ہی نہیں ہو۔۔۔ لوگ تو باپ کے وجود کے لیے ترستے ہیں۔"

"باپ کے لیے کیسے ترسا جاتا ہے ہمیں جانتی ہوں۔ یتیمی کتنی بڑی بدنصیبی ہے' زندہ باپ کے یتیم بچوں سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔" وہ شرمندہ تھی اور اماں کو منانے آئی تھی۔ لیکن اب ان سے تکرار کرنے لگی تھی۔

"لیکن تمہارے پاپا زندہ ہیں۔"

"وہ زندہ ہوتے تو ہمارے ساتھ موجود ہوتے۔"

"اگر کوئی کبھی ہمارے ساتھ رہا ہی نہیں تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ ہمارے لیے مر چکا ہے یا ہم اس کے لیے۔ اپنی ماں کے دل کو ایسے تکلیف نہ دو منال!"

"جس نے ہمیشہ آپ کو تکلیف میں رکھا' ان سے تو کبھی آپ نے شکوہ نہیں کیا۔ کہاں ہیں وہ؟ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں ماموں کو بڑے پاپا کہتی رہی ہوں۔ چند سال پہلے نادیہ نے بتایا کہ وہ اس کے پاپا ہیں۔ جب میں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے کیا کہا؟ یہی کہا نا کہ نادیہ صحیح کہہ رہی ہے۔ جس نے مجھے کبھی بیٹی نہیں کہا میں انہیں باپ کیسے کہہ دوں۔ وہ میرے لیے زندہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ کے لیے بھی نہیں ہیں۔ لیکن آپ اس معاملے میں ضدی ہیں۔"

"میں ضدی تھی منال! اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ لیکن تم یہ غلطی نہ کرو۔"

"میں کوئی ضد نہیں کر رہی۔ بس وہ کر رہی ہوں جو صحیح ہے۔ جب اسکول میں' یہاں وہاں' ہر جگہ لوگ ان کے بارے میں پوچھتے تھے اور میرے یہ کہنے پر کہ پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تو سب کتنا ہنستے تھے۔ اسی لیے کشف کی شادی میں میں نے انہیں مار دیا۔ پھر کسی نے سوال نہیں کیا۔ جب میں نے کہا کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی وہ فوت ہو گئے تو پھر سب ہمدردی کرنے لگے' سوال نہیں۔ مجھے تسلیاں' دلاسے دینے لگے۔ میرا مذاق اڑانا بند کر دیا۔"

اماں بے بسی سے اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"منال! اپنی ماں کی حالت پر رحم کرو۔"

"اماں! یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ ہم سب پر رحم کریں۔ اس چار دیواری کے باہر کی دنیا بہت بدل چکی ہے۔ جھوٹے دلاسے' جو آپ مجھے اور اسد کو دیتی آئی ہیں' باہر والوں کے لیے قابل قبول نہیں رہے۔ جن سوالوں سے تنگ آ کر آپ نے خود کو اس گھر میں قید کر لیا ہے' ان ہی سوالوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ خدا کے لیے' آپ اتنا ہی کہہ دیں کہ انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا ہے۔"

"انہوں نے مجھے نہیں چھوڑا۔۔۔ میں تمہیں ہزار بار بتا چکی ہوں یہ بات۔" اماں کی آواز بے اختیار ہی بلند ہوئی۔

"آپ بتا چکی ہیں۔۔۔ باور نہیں کرا سکیں۔" اس نے چوٹ کی۔ اماں اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

"اگر وہ تم سے ملتے نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ان سے اتنی نفرت کرنے لگو۔۔۔ کیا باہر کے ملکوں میں لوگ کام کے لیے نہیں جاتے۔۔۔؟" اور ہمیشہ کی طرح انہوں نے بات بدلی۔

"جاتے ہیں باہر۔۔۔ پیسہ کمانے کے لیے اور وہاں جا کر فون کرتے ہیں۔ اپنے پیاروں کو یاد رکھتے ہیں۔ ملاقات کرتے ہیں۔ اپنے ہونے کا احساس دلاتے

ہیں۔“

”تم یہ سمجھ لو کہ وہ یہ سب نہیں کر سکتے۔“ اماں نے ابھی تک اسے کچھ زیادہ ہی بچی سمجھ رکھا تھا۔

”میں نے سمجھ لیا ہے۔۔۔ سب سمجھ لیا ہے۔۔۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس سمجھ میں، میں نے اپنے لیے آسانی پیدا کرلی ہے۔“

”تمہارا یتیم بن جانا تمہارے لیے آسان ہے؟“ انہیں اس کی تکلیف کا احساس تھا لیکن وہ خود بے اختیار تھیں۔

”ہاں یہ میرے لیے آسان ہے۔ اس مذاق سے جو میرے ماموں زاد اور خالہ زاد میرا بناتے رہے ہیں۔“

”تم ان کے بچپنے کی باتوں کو۔۔۔“

”ان کے بچپنے کی باتیں تھیں پر میرے لیے وہ حقیقت تھی، جو آپ نے ہم سے چھپائی۔۔۔ چھوٹی سوئی میں لمبا دھاگا ڈال کر آپ خود بھی الجھتی رہیں اور ہمیں بھی الجھایا۔ آپ ہی کہتی ہیں نا کہ ہمیں صرف آپ کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ آپ ہی ہمارا سب کچھ ہیں۔ یہ باتیں تو وہی مائیں کہتی ہیں نا جن کے شوہر مر چکے ہوں۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری ماں اور باپ دونوں ہوں۔ صرف اس لیے کہ تم ان کی کمی کو ہر وقت محسوس نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم انہیں اتنا ناپسند کرنے لگو۔“

”اور انہیں پسند کروں بھی کیوں؟ جو اپنے بیوی بچوں سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ہم سے اچھا تو ان کے گھر کا کاٹھ کباڑ ہوگا' کم سے کم ان کے گھر کے کسی کونے میں تو پڑا ہوگا۔“

”ہماری شادی جن حالات میں ہوئی تھی' وہ سب میں تمہیں بتا چکی ہوں منال! جب سارا قصور ہی میرا ہے تو سزا انہیں نہ دو۔ ان سے ایسے نفرت نہ کرو۔“

”آپ کی باتوں میں ایسا کچھ نہیں تھا اماں! لیکن وقت کے ہر موسم نے مجھے ہر پہلو دکھا دیا۔ میرے بچپن نے' میرے بچپن کے ہر دن نے۔ آپ کے ہر رشتے دار نے مجھ سے ملنے والے ہر شخص نے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ ہمارا وقت ان کے بغیر کیسے گزرا؟ میں نے کس شدت سے ان کا انتظار کیا؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ بولنے سے زیادہ رونا چاہتی تھی۔ وہ تھوڑی سی بدتمیز تھی اور بہت زیادہ حساس۔ جن بچوں کے سروں پر باپ نہ ہو' ان کے دلوں پر بڑا بوجھ رہتا ہے۔ جنہیں خونی رشتوں کی شفقت نہ ملے' انہیں دل کی ویرانی ملتی ہے۔

وہ بہت پیار سے ایک عرصے تک اپنے ماموں کو پاپا کہتی رہی تھی۔ وہ اب بھی انہیں کبھی کبھی پاپا کہہ لیتی تھی۔ کسی نے کبھی اسے منع نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی بیٹی جیسی ہی تھی لیکن وہ اس کے پاپا نہیں تھے۔ وہ اس کی اماں کے سگے بڑے بھائی تھے اور اس کے اکلوتے ماموں۔

ماموں کی دو بیٹیاں تھیں۔۔۔ حفصہ اور نادیہ۔۔۔ حفصہ اس کی بہت اچھی دوست تھی لیکن نادیہ سے اس کی کبھی بھی نہیں بن سکی۔ بچپن کی چپقلش بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی تھی۔ نادیہ اکثر اپنے پاپا کی گود میں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتی تھی۔ کھا وہ بھی لیتی تھی۔۔۔ لیکن کبھی کبھی۔۔۔ بچوں کی اکثر لڑائیوں میں جب نادیہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کہہ دیتی۔۔۔

”جاؤ تم اپنے پاپا کے پاس۔۔۔ یہ میرے پاپا ہیں۔“ نادیہ کا مطلب تصویر والے پاپا ہوتا تھا۔ اب وہ تصویر والے پاپا کی گود میں بیٹھ کر کیسے کھانا کھاتی۔

وہ گھر کے ہر فرد کے پاس جاتی اور پوچھتی۔ ”یہ میرے پاپا ہیں نا۔ نادیہ کے نہیں ہیں نا۔؟“ گھر والے اتنے اچھے تھے کہ وہ ہر بار اسی کی تائید کرتے تھے۔ خاندان کے بڑے اس کے جذبات کو سمجھتے تھے۔

پھر بھی بہت سی باتوں نے اس کے دل و دماغ کو شکوک سے بھر دیا تھا۔ وہ ہر وقت اماں کا دماغ کھاتی رہتی۔

”مجھے اس جگہ کا نام بتائیں جہاں وہ کام کرنے گئے ہیں۔“

"یونان... میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے۔" اماں کو عادت ہو چکی تھی اس کے سوالوں کی۔
"وہ ہمیں فون کیوں نہیں کرتے...؟"
"جہاں وہ رہتے ہیں وہاں فون نہیں ہے۔"
اچھا۔" وہ سوچ میں پڑ جاتی... "وہ کب آئیں گے؟"
"جلد ہی.... میں ہر روز دعا کرتی ہوں کہ وہ جلد آجائیں۔ تم بھی کیا کرو۔"
اور وہ بہت زور و شور سے دعا کرنے لگتی۔ ایک لمبے عرصے تک دعا اور انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جو اس کے کزنز اور اس کے آس پاس کے لوگ کہتے تھے یا وہ جو وہ آس پاس والوں سے سنتی تھی کہ پاپا کبھی نہیں آئیں گے۔ انہوں نے اماں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور وہاں دوسری شادی کر رکھی ہے۔
ایسے بچے جو نارمل زندگی سے ہٹ کر زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرے بچوں کی نسبت جلد ہی باتیں سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ زیادہ حساس اور سمجھ دار ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ عمر کے ساتھ ساتھ شعور آرہا تھا لیکن شعور سے بھی پہلے اسے پاپا نامہ سمجھ میں آرہا تھا۔
اب وہ اپنی ماں کا دماغ نہیں کھاتی تھی۔ الٹے سیدھے سوال نہیں پوچھتی تھی۔ کارنس پر رکھی وہ تصویر جو اماں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر بڑی کروا کر سامنے لگا دی تھی کہ ان کی زندگی میں "پاپا" موجود ہیں' سے باتیں کرنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔
اس تصویر کے آگے کھڑے ہو کر پہلے وہ... اماں کی، اسد کی اور ہر اس شخص کی شکایت کیا کرتی تھی جو اسے تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ ایک ہی کمرہ تھا جسے زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔ صبح و شام اس کی نظر سامنے موجود پاپا کی طرف اٹھتی تو اسے لگتا 'پاپا یہیں کہیں موجود ہیں۔ وہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں۔ یہ بات بھی وہ صرف تصویر کی حد تک ہی جانتی تھی۔ اس نے کبھی پاپا کو نہیں دیکھا تھا۔ کبھی ان سے ملی نہیں تھی۔ لیکن ان سے محبت کے لیے ان سے ملنا ضروری نہیں تھا۔ کیونکہ اماں کہتی تھیں کہ وہ بہت اچھے ہیں اور اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتے ہیں۔
"حفصہ کہتی ہے کہ دنیا کے سارے پاپا اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن اماں! میرے پاپا اچھے نہیں ہیں۔" وہ پہلی بار عید پر اپنے باپ سے ناراض ہوئی تھی۔
"ایسے نہیں کہتے منال! تمہارے پاپا تو سب سے زیادہ اچھے ہیں۔"
"پھر وہ چاند رات پر ماموں کی طرح مجھے گھمانے کیوں نہیں لے کر جاتے؟"
"لے جائیں گے.... انہیں آنے تو دو' وہ تمہیں ہر جگہ لے کر جائیں گے۔"
"وہ کب آئیں گے؟"
"بہت جلد... تم دعا کر رہی ہو نا؟"
"جی اماں! سونے سے پہلے تو ضرور ہی کرتی ہوں۔"
وہ سوتے جاگتے' کھاتے پیتے' کھیلتے کودتے' گم صم اداس بیٹھے.... ہر وقت دعا کرتی تھی.... انتظار میں رہتی تھی۔ ان کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو کر تو وہ ان کے کان میں کہتی تھی "پاپا! میں صبح سو کر اٹھوں گی تو آپ آ

چکے ہوں گے نا؟"

"اٹھاؤ یہ تصویر یہاں سے۔ تم خود تو پاگل ہو چکی ہو' بچوں پر تو رحم کرو۔ جس شخص نے خود کبھی پلٹ کر اپنی آل اولاد کو نہیں پوچھا' اس کی تصویر سے اس کی اولاد کو کیا بہلانا۔" ماموں اکثر غصے میں کہتے تھے۔ جب وہ پاپا اسد کمرے میں نہیں ہوتے تھے اور وہ ماموں کی یہ بات بہت زیادہ بار سن چکی تھی۔

اپنے بھائی کے سامنے وہ تصویر کارنس سے اٹھا دیتیں' ایک دو دن بعد وہ پھر وہیں ہوتی۔ ایسے ہر واقعہ کے بعد منال کو تیز بخار ہو جاتا تھا۔ پاپا کے حوالے سے اس کے بچپن کے ایسے ہزاروں واقعات تھے جو ہر بڑے بچے کو یاد تھے۔ جو اسے بات بات پر یاد کروائے جاتے تھے۔ ان واقعات کی وجہ سے اس کے بہت سے الٹے نام رکھ دیے گئے تھے۔ جہاں سب اکٹھے ہو جاتے' اسے زچ کرنے بیٹھ جاتے۔ ان کے زچ کرنے پر وہ پہلے پہل روتی تھی اور ماموں سے شکایت کرتی تھی۔ پھر وہ ان سے لڑنے لگی۔ اور اپنے پاپا کی حمایت کرنے لگی۔ ان کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی۔

پھر اس نے خاموشی اختیار کرنا شروع کر دی۔ جو سوال وہ سب مذاق میں اسے تنگ کرنے کے لیے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاپا کہاں ہیں؟ وہ آتے کیوں نہیں؟ تم سے ملتے کیوں نہیں؟ کیا وہ تمہیں پیسے بھجواتے ہیں؟ وہ اس نے خود سنجیدگی سے سوچنے شروع کر دیے۔ اسے ان سوالوں پر سوچنا مہنگا پڑا.... بے خبری میں پاپا کا انتظار کرنا ٹھیک تھا۔ باخبر ہو کر انہیں ناپسند کرنا زیادہ تکلیف دینے لگا۔

"میرا باپ کہاں ہے؟" یہ سوال اسے ذہنی مریض بنانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"ڈورس! دروازہ کھولو۔"

وہ چند ہفتوں سے اس کی حرکات نوٹ کر رہے تھے۔ شک ہونے پر انہوں نے باقاعدہ اس کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ وہ آفس میں کتنے ہی مصروف ہوتے یا ان کی کتنی ہی ضروری میٹنگز ہوتیں' انہیں پرواہ نہیں تھی۔ وہ اسکول سے کیفے تک' گھر سے کہیں جانے تک اس کے پیچھے پیچھے رہتے۔ آدھی رات کو وہ اپنے بیڈ روم سے اس کے بیڈ روم تک آئے۔ کچھ دیر خاموشی سے باہر کھڑے رہے۔ بو انہیں باہر تک آ رہی تھی۔ دروازہ مقفل تھا۔ رات ہو یا دن' ڈورس کا کمرا کبھی مقفل نہیں ہوتا تھا۔

"ڈورس!" انہوں نے پھر دروازے پر دستک دی۔

"دروازہ کھولو۔"

"پاپا! آپ اس وقت....؟" اس کی آواز سنائی دی۔ دروازہ ابھی بھی نہیں کھولا تھا اس نے۔

"دروازہ کھولو۔"

"اوکے پاپا! ایک منٹ۔"

دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بیڈ کے نیچے انہیں ایش ٹرے نظر آ گئی تھی جو جھک کر انہوں نے اٹھا لی۔

"پاپا.... یہ' یہ' وہ۔" وہ بری طرح سے گھبرا گئی۔ آج انہوں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔

"ڈونٹ وری (پریشان نہ ہوں)"

وہ نیچے وہیں بیٹھ گئے جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ہلکی آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں' دیوار سے ٹیک لگائی اور ایش ٹرے سے اس کی ادھ جلی سگریٹ اٹھا کر پینے لگے۔ ہاتھ کا اشارہ کر کے انہوں نے اسے اپنے ساتھ کشن پر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

پہلا کش ان کے لیے کافی مشکل ثابت ہوا۔ انہیں نشے کی عادت نہیں تھی لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔

"تم نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی' پھر یہ کیوں....؟" انہوں نے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں تمباکو نہیں افیون تھی۔ وہ ایسے بات کر رہے تھے جیسے دو دوست ایک دوسرے سے کرتے ہیں کہ تم نے اکیلے اکیلے ہی پی لی' مجھے آفر ہی نہیں کی۔

"میں نے سوچا' آپ ناراض ہوں گے اور منع کریں گے۔" ان کے انداز سے اسے حوصلہ ملا۔
"کیا میں ناراض ہوا؟" انہوں نے ہنس کر پوچھا۔
"نہیں.... لگ تو نہیں رہے۔" وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔
"تم جانتی ہو میں تم سے ناراض نہیں ہوتا۔ تم اسموکنگ کرنا چاہتی تھیں تو تم مجھے بتاتیں۔ اس کے لیے تمہیں عجیب و غریب جگہوں پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم جانتی ہو وہاں خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے تھے۔"
"پاپا! آر یو شیور آپ کو برا نہیں لگا؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے پاپا ———— افیون بھری سگریٹ پی رہے ہیں۔
"مجھے کیوں اعتراض ہوگا جب تمہیں نہیں ہے۔ یقیناً" تمہیں بہت اچھا لگتا ہوگا یہ سب کرنا۔" انہوں نے ہاتھ میں دبی سگریٹ کی طرف اشارہ کیا۔
"یس! بہت.... بہت ہائی فیلنگ آتی ہیں پاپا.... اینڈ یو نو اٹس ٹرینڈی۔"
"یہ تو ہے۔" انہوں نے ایک اور کش لیا۔ "بہت ہائی فیلنگ آرہی ہیں۔" ساتھ ساتھ وہ اپنا سر ہلا رہے تھے جیسے اس کی ہر بات درست ہو اور وہ اس کی تائید کرتے ہیں۔
"لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کے سائیڈ افیکٹس بھی ہوتے ہیں؟"
"اوہ نو! اونیل کہہ رہا تھا' سب ایسے ہی فضول باتیں ہیں۔ یہ بھی اسموکنگ کی طرح ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں مرتا ان سب سے۔ کیا کوک' کافی' چائے پینے سے کوئی مرتا ہے پاپا؟ نہیں نا؟ تو ایسے ہی یہ بھی ہے۔"
"لیکن میں نے سنا ہے کہ اس سے انسان آہستہ آہستہ مرتا ہے۔ کینسر جیسی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ جسم اور دماغ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ انسان کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے انسان کی قوت مدافعت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ سردی کے معمولی سے حملے سے بھی مر جاتا ہے۔ یہ دیکھو' یہ میں پی رہا ہوں ناں.... مجھے لگ رہا ہے کہ میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔" انہوں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ پھر دو تین بار ایسے ہی کیا۔
"کیا آپ کا دماغ ماؤف ہو رہا ہے....؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔
"ہاں.... جیسے سب ہوا میں تیر رہا ہے.... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا.... میرا خیال ہے اگر میں نے اسے مستقل استعمال کیا تو میرا دماغ ناکارہ ہو سکتا ہے۔ برین ٹیومر بھی ہو سکتا ہے۔ پھر میں بہت جلد مر جاؤں گا.... لیکن یہ صرف میرا خیال ہے.... جبکہ اونیل کا کہنا ہے کہ اس کے استعمال سے کچھ نہیں ہوتا۔"
وہ بے قراری سے ان کے گلے میں جھول گئی۔
"ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں آپ؟ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"
"فرض کرو اگر ایسا ہو گیا تو.... اگر میں مر گیا تو؟؟"
سگریٹ ان کے ہاتھ سے لے کر اس نے دور پھینک دی۔ "تو مت پئیں یہ۔"
"تم چاہتی ہو کہ میں یہ نہ پیوں....؟"
"جی۔" اس نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھا۔
"تم مجھے تکلیف سے اور موت سے بچانا چاہتی ہو لیکن تم خود اس تکلیف میں کودنا چاہتی ہو؟"
"پاپا! اونیل کہہ رہا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے بے چینی سے کہا۔
"وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا پر وہ ٹھیک کہتا ہے یا غلط۔ پہلے مجھے آزما لینا چاہیے۔ اگر مجھے برین ٹیومر ہو جائے تو سمجھ لینا کہ اونیل غلط تھا۔"
"آپ ایسی باتیں نہ کریں.... کیوں ہوگا آپ کو کچھ؟"
"اور کیوں ہو تمہیں کچھ.... اگر تم نے ڈرگ استعمال کی تو میں بھی کروں گا۔"
"آپ نہیں کریں گے.... کیونکہ میں بھی نہیں کروں گی۔"
"اور اونیل.... وہ تو تمہارا مذاق اڑائے گا نا....؟"

"میں اونیل سے نہیں ملوں گی۔ وہ مجھے آپ سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔"

"اپنے اردگرد دیکھو ڈورس! تمہارے کمرے میں ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت ادا کرنے سے پہلے میں نے سوچا ہو۔۔۔ یہاں ایسا کیا ہے جو تمہارے کہنے پر میں نے تمہیں لاکر نہ دیا ہو۔ جب میں ان چیزوں کی قیمت ادا کر سکتا ہوں تو میں ڈرگ کی قیمت بھی ادا کر سکتا ہوں۔ مگر اس کی قیمت تمہاری جان ہے' جو میں ادا نہیں کر سکتا۔۔۔ کیا تم نے یہ سب نہیں سوچا تھا؟"

"نہیں پاپا۔۔۔ بس مجھے اتنا معلوم تھا کہ آپ اسے پسند نہیں کریں گے۔"

"بری چیزوں کو ہی ناپسند کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اتنی ہی پسندیدہ چیز ہو تو گورنمنٹ اسے لیگل کر دے۔ مہمانوں کی اس سے تواضع کی جائے۔ جیسے مشروبات سے کی جاتی ہے۔۔۔ بات صرف ناپسندیدگی کی نہیں ہے۔ یہ موت ہے۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

"میں اونیل سے کبھی نہیں ملوں گی۔۔۔ اس نے مجھے غلط گائیڈ کیا۔"

"جب تمہارے پاس میں ہوں۔ تمہاری ماما اور بھائی ہیں تب بھی تمہیں کسی کی گائیڈنس کی ضرورت ہے۔"

"میں نے بہت بڑی غلطی کی پاپا! لیکن آپ دوبارہ مرنے کی بات نہیں کریں گے۔" اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"رات بہت ہو گئی ہے' سو جاؤ ڈورس!" تھپک تھپک کر اسے سلانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔

وہ ان کی لاڈلی پیاری بیٹی ہے۔۔۔ "ڈورس" اور وہ اس کے ہر بار سے زیادہ پیارے "پاپا"۔

☆ ☆ ☆

"تم نے تصویر کہاں چھپا کر رکھی ہے۔۔۔؟" معلوم نہیں ہمیں حیرت زیادہ تھی یا دکھ۔۔۔

"اب اس تسلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے میرے اور اسد کے لیے ہی اسے یہاں لگایا تھا نا۔ اس تصویر سے ان کی اس گھر میں موجودگی کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔"

"وہ اس گھر کا فرد ہیں' تم نے انہیں یہاں سے کیوں ہٹایا؟" ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تم تو ان کی تصویر سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ آج تم نے تصویر ہی چھپا دی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ ابھی تک نہیں تھکیں انہیں زبردستی اس گھر کا حصہ بناتے بناتے۔۔۔ خود کو دھوکا دیتے دیتے' آپ ہمیں بھی دھوکا دیتی رہی ہیں۔ وہ اس گھر کا فرد' اس تصویر سے کیسے بن گئے؟ اب آپ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ وہ ہماری زندگیوں میں تصویر کی صورت میں رہیں گے نہ انتظار کی شکل میں۔"

وہ خاموشی سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ جان چکی تھیں کہ دس بارہ سال کی بچی کو وہ مطمئن کر سکتی ہیں۔ کالج جانے والی لڑکی کو نہیں۔ وہ دنیا کو اب اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے لوگوں سے ملنا' تقریبات میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ زیادہ وقت وہ حفصہ کے ساتھ ہی گزارتی تھی لیکن حفصہ نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ کالج میں وہ بہت کم کسی لڑکی سے بات چیت کرتی تھی۔

تصویر چھپانے والا کام اس نے ایک معمولی سے واقعے کے بعد کیا تھا۔

وہ حفصہ کے ساتھ انار کلی خریداری کے لیے آئی تھی۔ انہیں رعایتی سیل کا پتا چلا تھا اور انہیں ایک ایک سوٹ بھی لینا تھا۔ سوٹ لینے سے پہلے وہ سیل کے اسٹال سے جوتے پہن کر دیکھتی رہیں۔ ان دونوں کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔۔۔ کمی پیسوں کی تھی۔

"مجھے وہ شوز پسند آئے ہیں۔۔۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے حفصہ کو جوتے دکھائے۔

"وہ فکس پرائز والے۔۔۔؟" حفصہ نے پوچھا۔

"ہاں" اس کی شکل پر مایوسی چھا گئی۔

"اب پھر۔۔۔ اچھا ایسا کرو تم وہ لے لو۔۔۔ ہم کل آکر

سوٹ لے جائیں گے۔" **حفصہ** نے قیمت دیکھ کر مشورہ دیا۔

"نہیں، تم سوٹ لے لو۔۔۔ شوز ہم کل آ کر لے جائیں گے۔۔۔ سوٹ کی سیل ختم ہو جائے گی۔"

ایک سوٹ لے کر وہ واپس آ گئیں۔

"تم نے کچھ نہیں لیا؟" وہ اماں سے سر میں تیل لگوا رہی تھی۔ جب انہوں نے پوچھا۔

"ہم نے ایک سوٹ لیا ہے۔ بہت اچھا مل گیا' قیمت بھی مناسب تھی۔ مامی کو بہت پسند آیا ہے۔ ایک آپ بھی اپنے لیے منگوا لیں۔"

"میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم نے کیا لیا ہے۔۔۔ کہہ کر تو سوٹ کا گئی تھیں۔"

"آپ نے جو پیسے دیے تھے وہ میرے پاس ہی ہیں۔ مجھے شوز پسند آ گئے ہیں' تھوڑے مہنگے ہیں۔ میں وہ لے لوں گی۔"

"کل جا کر لے آنا۔۔۔"

"جب آپ کے پاس پیسے ہوں گے' میں لے آؤں گی۔۔۔ ماموں سے مت لیجیے گا۔"

"تمہیں پتا ہے' میں ان سے بہت ضرورت پڑنے پر ہی لیتی ہوں۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ میں دودھ والے کو اگلے ماہ دے دوں گی۔ اگلے مہینے سے گھر کا کرایہ بھی بڑھ جائے گا۔"

"میں اگلے مہینے ہی لے آؤں گی۔ مجھے ابھی ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ بک جائیں گے۔۔۔ تم لے آؤ۔" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"تو بک جانے دیں انہیں۔۔۔ ضروری نہیں خواہش کردہ ہر چیز حاصل ہو جائے۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

"تم ناراض ہو مجھ سے؟"

"میں کیوں ناراض ہوں گی آپ سے؟" اس نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"پہلے تو تم ضد کیا کرتی تھیں اور اب۔۔۔"

"اب میں سمجھ دار ہو گئی ہوں۔ اچھی بات ہے نا؟

آپ چاہتی تھیں نا کہ میں سمجھ دار ہو جاؤں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

ہاں' وہ ایسا ہی چاہتی تھیں۔ لیکن بعض چاہتیں جب تکمیل کی سرحد تک پہنچتی ہیں تو عجیب طرح کا دکھ بن جاتی ہیں۔

"اچھی بات نہیں ہے۔ تمہاری سمجھ میں کرب پوشیدہ ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ تم دونوں کو کسی محرومی کا احساس نہ ہو۔" وہ اداس ہو گئیں۔

"آپ ہیں ہمارے پاس تو سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ مجھے چیزیں نہیں چاہئیں اماں۔"

چیزوں کی کمی تو ویسے بھی کبھی نہیں پوری ہوتی۔ اس کے پاس تو رشتوں کی کمی تھی۔ وہ ماں تھیں' کوشش کر کے بھی باپ کی جگہ نہیں لے سکتی تھیں۔

"منال۔۔۔" ماموں نیچے سے اسے پکار رہے تھے۔

"جی ماموں؟" اس نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔

"بہت بور ہو رہا ہوں۔ آ جاؤ جلدی سے نیچے۔۔۔ انارکلی چاٹ کھانے چلتے ہیں۔"

وہ' **حفصہ** اور ماموں اکثر چاٹ کھانے جایا کرتے تھے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ آج ماموں اسے کیوں لے کر جانا چاہتے ہیں۔ ان کے کان میں بھنک بھی پڑ جاتی اس کی کسی ضرورت یا خواہش کی تو وہ اس کی ضرورت پوری کیے بغیر چین نہیں لیتے تھے۔ **حفصہ نے یقیناً** انہیں جوتے والی بات بتائی ہو گی اور اسے آج ہی جوتے دلوائے بغیر وہ چین سے نہیں سوئیں گے۔ وہ لاکھ بہانے کرتی' وہ ماننے والے نہیں تھے۔

"آپ ابھی بھی چاہتی ہیں کہ میں ان سے نفرت نہ کروں۔ ان کا فرض کسی اور کو ادا کرنا پڑ رہا ہے۔" پلٹ کر ہم نہیں کہہ کر وہ چلی گئی۔

واپسی پر اس کے پاس جوتے بھی تھے اور سوٹ بھی۔ پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ ماموں اس سے اور وہ ماموں سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ بلاشبہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ خیال اور محبت آپ کو مزید غم زدہ کر دیتا ہے کیونکہ اس کی ——— وجوہات سے آپ کو نفرت ہوتی ہے۔

اسے بھی وقت نے ایسے ہی غم زدہ کر دیا تھا۔ پہلے وہ بات بات پر روتی تھی۔ رواب بھی لیتی تھی لیکن پہلے ناسمجھی میں روتی تھی' اب سمجھ کر۔ اسے ماموں ' حفصہ' مامی وغیرہ سے بہت پیار تھا۔ اس کی زندگی میں کمی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ وہ ہر کمی کو تسلیم کرتی جارہی تھی۔ ماموں کا یہ چھوٹا سا گھر۔۔۔ اوپر بنے ان کے دو کمروں کا پورشن اس کی کل دنیا تھا۔ یہ دنیا آدھی ادھوری' مکمل' نامکمل تھی تو پھر اسے ہر وقت اپنے باپ کی غیر موجودگی کا سوگ منانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب وہ غیر موجود ہی تھے تو اشاروں' حوالوں' یادوں' یا تصویر کی صورت انہیں موجود رکھنے کی کوشش بھی غیر ضروری ہی تھی۔

اگلے دن اس نے دیوار پر لگی تصویر کو اسٹور روم میں سامان کے پیچھے پھینک دیا تھا۔ تصویر کا فریم ٹوٹ گیا تھا اور شیشہ بھی۔۔۔ لیکن تصویر سلامت رہی۔۔۔

یہ تصویر اسے۔۔۔ اس کی باتوں کے جواب دے سکتی تھی نہ ہی پیار۔۔۔

☆ ☆ ☆

"آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟" وہی بچکانہ سوال۔

"تمہیں کتنا چاہیے؟" بچکانہ سوال پر سوال۔

"سب سے زیادہ۔۔۔ انس' احد' ممی سے بھی زیادہ۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں ان کے حصے کا پیار بھی تمہیں دے دوں؟"

اس نے سر ہلا کر تائید کی۔ "تو اس میں کیا حرج ہے؟"

"جیسے تم ان سے زیادہ پیسے لے لیتی ہو۔" وہ ہنسے۔

"پیسوں سے بھی زیادہ۔۔۔ سب سے زیادہ۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"کوئی گراف' کوئی اسکیل؟ کوئی حد؟" وہ اسے تنگ کر رہے تھے۔

"کوئی حد نہیں بابا! بس بے حد۔۔۔ لامحدود۔"

"لامحدود کو بھی محدود کیا جا سکتا ہو گا ڈورس! لیکن تمہارے لیے میری محبت کو نہیں۔" اس کے بکھرے بالوں کو پیار سے پیچھے کرتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔

"ڈورس! اپنی گاڑی کی چابی دو۔" احد عجلت میں اس کے سر پر کھڑا کہہ رہا تھا۔

"میری گاڑی کی چابی؟ وہ میں تمہیں کیوں دوں؟"

"تم نے کہا تھا' لے جانا۔۔۔" اس نے یاد دلایا۔

"ہاں کہا تھا لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔ باپ بیٹی میں وہ کباب میں ہڈی ضرور بنتا تھا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ چابی دو مجھے فوراً"۔۔۔ جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اسے بہت جلدی تھی۔

"دیر ویر میں نہیں جانتی۔۔۔ نہ کار ہے نہ چابی۔"

"لیکن کیوں؟" وہ چلایا۔ "تم عین وقت پر انکار کر رہی ہوں۔"

"بالکل! میں ایسا ہی کر رہی ہوں۔ میں کر سکتی ہوں۔ تم پتا نہیں میری کار کہاں کہاں لے کر جاؤ گے۔ کس کس کو بٹھاؤ گے۔"

"ڈورس! مجھے چابی دو۔" اس نے حتی الامکان لہجہ دھیما رکھنے کی کوشش کی۔ ویسے تو وہ حلق پھاڑ کر چلانا چاہتا تھا لیکن اس وقت بہتر تھا بات کو مزید بگڑنے نہ دیا جائے۔ چابی لی جائے اور اپنے سب فرینڈز کو اس میں ٹھونس کر اسے دوڑایا جائے۔

"تم پاپا کی گاڑی لے جاؤ۔۔۔ انس کی لے جاؤ۔۔۔ لیکن میری طرف سے سوری۔"

"ان دونوں کے پاس وہی کار ہوتی جو تمہارے پاس ہے تو میں تمہارے منہ لگنا پسند کرتا؟" اس کے لہجے میں کوئی انجانا سا غم چھلکا۔

"پھر میری کار کے منہ بھی مت لگو۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میرے فرینڈز میرا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہارے ہاں کہنے پر ہی ان سے وعدہ کیا تھا۔"

"اب ناں کہہ رہی ہوں۔۔۔ فرینڈز سے کیا وعدہ توڑ دو۔" اس نے شانے اچکائے۔

"پاپا! پلیز اس سے کہیں مجھے صرف آج کے لیے کار دے دے۔" اس نے نہیں سنا تو وہ پاپا سے کہنے لگا۔

"احد! کیوں ضد کر رہے ہو؟ بہن نہیں دینا چاہتی تو اسے تنگ نہ کرو۔" انہوں نے بھی ایک طرح سے انکار ہی کر دیا۔

"کیوں نہیں دینا چاہتی یہ... ایک ہفتہ پہلے یہ ہاں کہہ رہی تھی 'اب ناں کہہ رہی ہے۔" اب تو وہ چلا ہی اٹھا۔

وہ پیر جھلانے لگی۔ فون نکال کر اپنی کسی آلتو فرینڈ کا فالتو میسج پڑھنے لگی۔

"جاؤ احد! میری کار لے جاؤ۔" انہوں نے بات ہی ختم کر دی۔

"مجھے نہیں چاہیے آپ کی کار۔" وہ پوری ملکہ جذبات بن گیا۔ رونا پیٹنا ڈالنے لگا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" انہوں نے بھی اپنا فون نکال لیا اور آلتو فالتو میسج چیک کرنے لگے۔

وہ دونوں باپ بیٹی کا نظم و ضبط اور اخلاق دیکھ کر کھول کر رہ گیا۔ "پلیز پاپا! ڈورس سے کہہ دیں 'چابی دے دے۔" چار و ناچار وہ ہاتھ جوڑ کر منت کرنے لگا۔

ڈورس نے سیٹی ماری۔ پاپا نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گئے۔

"کہا ہے نا' میری گاڑی لے جاؤ۔"

بہت کوششوں سے ایک اور اس کے دوستوں نے ایک اسپورٹ ایونٹ کے پاس حاصل کیے تھے۔ وہاں کچھ اسپورٹس اسٹارز آنے والے تھے۔ اسے وہاں شاندار طریقے سے شاندار گاڑی میں جانا تھا۔ پھر وہ اپنے فرینڈز سے وعدہ کر چکا تھا۔

"اگر آج مجھے گاڑی نہ دی گئی تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔" اس نے دھمکی دی۔

"چلو شروع کرو... خود کو ختم کرنا شروع کرو۔" فون کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

غصے میں وہ اس کے کمرے میں گیا۔ اور سیٹی بجاتا ہوا' چابی ہوا میں اچھالتا ہوا باہر آیا۔

"اگر تم ڈورس کی کار اس کی مرضی کے بغیر لے کر گئے تو یاد رکھنا گھر میں انٹری کی چابی نہیں ملے گی۔"

احد نے وہیں سے چابی ڈورس کے قدموں میں پٹخی اور غصے سے ایک دو چیزیں پھینک کر چلا گیا۔

"ڈورس! بیٹا تمہیں بھائی کو کار دے دینی چاہیے تھی۔" صوفیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اسے پتا ہونا چاہیے کہ وہ اس کی چیز نہیں ہے اور جو چیز جس کی ہوتی ہے وہ اسی کی مرضی سے چلتی ہے ماما!" اس نے ان کی طرف رخ کر کے پیار سے کہا۔

"ایک بار استعمال کرنے سے کیا ہو جاتا؟"

"وہ ایک بار مانگ کر بار بار مانگتا ماما! آپ جانتیں نہیں اسے۔"

"تم ہر بار اسے ہرٹ کرتی ہو۔ تم نے جان بوجھ کر پہلے ہاں کہا ناکہ وہ اس گمان میں رہے کہ تم اس سے وعدہ کر چکی ہو۔ پھر عین وقت پر تم نے انکار کر دیا۔ وہ اپنے فرینڈز کے سامنے کتنا شرمندہ ہو گا۔"

"معلوم نہیں۔" اس نے شانے اچکائے اور شرارت سے ہنسنے لگی۔

"تم اسے مشکل میں ڈال کر خوش ہوتی ہو۔ وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ جیسے انس تمہارا رکھتا ہے۔"

"انس مجھے اس کی طرح تنگ نہیں کرتا۔ جواب میں 'میں بھی نہیں کرتی۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی ڈورس! تم اس کے فرینڈز کی انسلٹ بھی کر دیتی ہو۔"

"وہ سب اسی لائق ہیں ماما!"

"اور تم کس لائق ہو؟ ویمپائر... میرے فرینڈز کبھی کسی بات پر ایک ساتھ متفق نہیں ہوئے لیکن اس بات سے سب اتفاق کرتے ہیں کہ تم ویمپائر ہو... اگر میں جادوگر ہوتا تو تمہیں چوہیا بنا دیتا اور ماچس کی ڈبی میں بند رکھتا۔" رات کو گھر واپسی پر وہ اس پر چلا رہا تھا۔

"اور میں تمہیں آتش دان کی چمنی میں چمگادڑ کی طرح لٹکا دیتی۔" وہ اسے اور چڑانے لگی۔

"اس بار میں تمہاری کار میں کتے' بلیاں' مینڈک' بطخیں ایک ساتھ بند کردوں گا۔ پچھلی بار سے زیادہ خوب صورت لگے گی تمہاری کار۔"

"اور میں تمہاری ساری ہوم ویڈیوز فیس بک پر شیئر کردوں گی۔۔۔ خاص کروہ باتھ ٹب والی۔"

احد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ جانتا تھا وہ ایسا ہی کرے گی۔ اب اسے موقع دیکھ کر ویڈیوز کا سارا ڈیٹا ڈیلیٹ کرنا تھا۔ پھر اسے اس کی کار کے ٹائر "بے کار" کرنے تھے۔ پچھلی بار اس نے اس کی کار میں تین چار بلیاں رات کو لاک کردی تھیں۔ انہوں نے اس کی نئی کار کا جو حشر کیا تھا وہ "قابل دید" تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ناقابل بیان بھی۔ پاپا کی طرف سے اس کی پاکٹ منی بند کردی گئی۔ پیسوں کے بغیر دو مہینے جیسے اس نے گزارہ کیا' وہ "قابل داد" تھا۔۔۔ ساتھ ساتھ۔۔۔ وجہ واجب القتل آف ڈورس بھی۔

☆ ☆ ☆

"منال! کافی دن ہوگئے اب تم نیچے ٹی وی دیکھنے نہیں جاتیں۔ رات کے ڈرامے تو تم حفصہ کے ساتھ دیکھتی تھیں۔"

"نادیہ آپی نے کچھ کہہ دیا ہوگا۔" اسد ٹی وی دیکھتے ہوئے بولا۔

"کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟" تخت سے اٹھ کر وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"آپ ہر بار یہ ہی کیوں پوچھتی ہیں؟ آپ دن میں کئی کئی بار مجھ سے یہ ہی سوال پوچھتی ہیں۔ کوئی مجھے کیا کہے گا اماں۔ سب اتنے اچھے ہیں۔"

"پھر بھی۔۔۔" وہ واقعی پریشان تھیں۔ "وہ مذاق بھی کرتے ہیں تو تم دل پر لے جاتی ہو۔۔۔ خاص کر احمد کے مذاق۔۔۔ تمہاری نادیہ یا احمد کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے؟" نیچے جانے میں وقفہ دونوں کی لڑائی کی وجہ سے ہی آتا تھا۔

"یہی سمجھ لیں۔"

"کسی نے کچھ کہا؟" انہیں بس اس کہنے کی فکر رہتی تھی۔ فاختہ کی طرح وہ اپنے بچوں کو سب چیل کوؤں سے بچا بچا کر پال رہی تھیں۔ پھر بھی ان کے بچوں کے دلوں پر ضربیں لگ رہی تھیں۔

"کچھ کہا ہی تو نہیں۔ نادیہ کو حفصہ کے نئے سینڈل چاہیے تھے۔ حفصہ نے اسے صاف انکار کر دیا۔ میں نے مذاق میں وہی سینڈل مانگ لیے کہ مجھے اپنی دوست کی سالگرہ پر پہن کر جانے ہیں۔ تو اس نے فوراً" مجھے وہ سینڈل دے دیے۔"

"تو یہ اس نے اچھا کیا نا بیٹا۔" انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تو اتنی سی بات تھی۔

"آپ سمجھ رہی ہیں امی۔۔۔ یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ اس نے ترس کھایا مجھ پر۔۔۔"

"وہ تم پر کیوں ترس کھائے گی۔ تم دونوں میں اتنی اچھی دوستی ہے۔"

"اس نے اپنی چھوٹی بہن کو وہ سینڈل نہیں دیے۔ لیکن مجھے فوراً" دے دیے۔ جیسے کبھی ماموں نادیہ اور حفصہ کو انکار کردیتے ہیں لیکن میں جب بھی پیسے مانگوں مجھے فوراً" دے دیتے ہیں۔ ہم ان کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ ماموں ہمیں ہر چیز لا کر دیتے ہیں۔ ہماری ضرورتیں' ہماری خواہشیں' ہمارے سارے کام کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ رات دن ہسپتال کے چکر لگاتے ہیں اور پھر اب ان کے بچے۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اتنا کچھ کرنے لگے ہیں۔ مجھے نہیں چاہیے ایسی زندگی۔۔۔ اتنا ترس۔۔۔ اتنی مدد۔" وہ پھٹ پڑی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ ضرورت سے زیادہ شاید اسی لیے خاموش تھی۔

"تم سے کس نے کہا کہ یہ سب ترس ہے یا ہمدرد؟ یہ گھر تمہارے نانا کا ہے۔ اوپر کے یہ دو کمرے میرا اور تمہاری خالہ کا حصہ ہیں۔ تمہارے پاپا کے گھر کا کرایہ آتا ہے۔ تمہارے ماموں جو کچھ دیتے ہیں۔ تمہاری محبت میں دیتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ وہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ آج سے پہلے تو تم فرمائش کر کے لیا کرتی تھیں۔ وہ تمہیں حفصہ اور نادیہ' تینوں کو ایک جیسا سمجھتے ہیں۔ بیٹی جیسی ہو تم ان کی۔"

"بیٹی تو نہیں ہوں نا ان کی۔ جیسے وہ میرے پاپا نہیں ہیں؟ وہ ہمیں بے شک بوجھ نہ سمجھیں۔ مگر ہم نے ان پر بوجھ ڈالا ہوا ہے۔" وہ شدید ذہنی دباؤ اور خود ترسی کا شکار تھی۔ دن رات سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔

"ایسے سوچ سوچ کر تم خود کو پاگل کر لوگی منال! بڑے بھائی ہیں وہ میرے۔ پیار کرتے ہیں مجھ سے۔"

"دو گھروں کی ذمہ داری ان پر ہے۔ ہم ان کی ذمہ داری تو نہیں... کسی کا فرض وہ کیوں ادا کریں؟" وہ رونے لگی۔

اسد نے ٹی وی بند کر دیا۔ وہ اسے بہلانا چاہتا تھا۔ اس کی نسبت وہ ان سب معاملات سے انجان تھا۔ نہ وہ سوچتا تھا نہ وہ الجھتا تھا۔ زندگی جیسی اسے ملی تھی۔ وہ اسے ہنسی خوشی گزار رہا تھا۔

"آپ نے آخر ایک ایسے شخص سے شادی کیوں کی۔ جو آپ کو، ہمیں... سب کو چھوڑ کر چلا گیا... جس نے کبھی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی؟"

جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی، اس کے سوالوں کی نوعیت بدل رہی تھی۔ اگر ان کی طبیعت خراب نہ رہا کرتی تو شاید وہ چوبیس گھنٹے ان سے ایسی ہی شکایتیں کرتی رہتی۔

"منال... منال!" ماموں شاید اوپر آ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"ارے بچے، کہاں ہو تم؟ دو دن ہو گئے تمہیں ٹی وی کے سامنے نہیں دیکھا۔ نادیہ سے تمہاری لڑائی بھی نہیں ہوئی۔"

"جی ماموں! ایسے ہی دل نہیں کیا۔"

"دل کو چھوڑو... آؤ شاباش... مل کر ٹی وی دیکھتے ہیں۔" انہوں نے صرف کہا ہی نہیں۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا بھی۔ دل میں روتے روتے، وہ اوپر سے ہنسنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"تمہارے پاپا کو باہر جانے کا بہت شوق تھا۔ پڑھائی چھوڑ کر وہ جیسے تیسے باہر چلے گئے۔ اکلوتے تھے تو خالہ جانے نہیں دینا چاہتی تھیں لیکن وہ پھر بھی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد خالہ اکیلی رہ گئیں۔ میں ان کے پاس جا کر رہنے لگی۔ مجھے بہت پسند تھے تمہارے پاپا اور میں ہر طرح سے خالہ کا دل جیتنا چاہتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ خالہ مجھے ہی اپنی بہو بنائیں گی۔ تین سال بعد خالو کی وفات پر وہ صرف ایک ہفتے کے لیے آئے تھے۔ خالہ نے ان سے شادی کے لیے کہا مگر وہ منگنی، شادی کسی بھی چیز کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ انہیں واپس جانا تھا۔ وہ چلے گئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سکندر صاف انکار کر کے گئے تھے۔ وہ خالہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے۔ مگر خالہ نہیں مانیں۔ سکندر کو پاکستان میں رہنا تھا نہ مجھ سے شادی کرنی تھی۔

خالہ نے ان پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انہیں فون کرتیں اور پاکستان آنے کے لیے کہتیں۔ کیونکہ میں نے خالہ سے صاف صاف کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں ان کے بغیر مر جاؤں گی۔ وہ میری خالہ تھیں۔ میری ماں سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی تھیں۔ وہ مجھے بہو بنانا چاہتی تھیں۔ روز روز کی تکرار سے تنگ آ کر انہوں نے فون کرنا ہی بند کر دیا۔ ایک دن خالہ نے سکندر سے کہہ دیا کہ انہوں نے خاندان میں میری اور ان کی منگنی کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ اس پر بھی بہت ناراض ہوئے۔

خالہ شاید سکندر کی بات سمجھ جاتیں اگر میں نے بے جا ضد نہ کی ہوتی۔ میں ہی خالہ کو رو رو کر دکھاتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر تڑپ جاتی تھیں۔ پھر وہ بیمار رہنے لگیں۔ ایک دن ان کی طبیعت زیادہ بگڑی تو سکندر کو آنا ہی پڑا۔ وہ انہیں ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے مگر خالہ نہیں مانیں۔ خالہ کی ایک ہی ضد تھی... مجھ سے شادی... انہوں نے مجھے سمجھایا... مجھے بتایا کہ وہ شادی کر چکے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ہے۔ صرف خالہ کی طبیعت اور مجھ سے شادی کی ضد کی وجہ سے انہوں نے یہ بات چھپائی ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں انکار

کردوں۔

میں کیسے انکار کرتی... میں نے سات سال ان کا انتظار کیا تھا۔ میں ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ ہماری منگنی کا اعلان ہو چکا تھا۔ سارے خاندان کو معلوم تھا کہ ہماری شادی ہونے والی ہے۔ پھر باہر کی شادیوں کی اہمیت ہی کتنی ہوتی ہے؟ سب باہر جاتے ہیں' سب شادی کر لیتے ہیں لیکن لوٹ کر تو واپس گھر ہی آتے ہیں نا... بس... میں یہی سب سوچتی تھی۔

میں سکندر کو بچپن سے پسند کرتی تھی... میرا عشق تھے وہ۔ انہیں مجھ سے شادی کرنی ہی تھی۔ ایک بار شادی ہو جاتی تو وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ نہ میں نے سکندر کی بات سنی اور نہ خالہ نے۔ تمہارے ماموں' تمہاری نانا' نانی بھی شادی کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔ خالہ کی طبیعت بھی اتنی خراب تھی کہ انہیں کوئی صدمہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ انہیں مجھ سے شادی کرنا پڑی۔ وہ یہاں سات ماہ رہے۔ شادی کے چھ ماہ بعد خالہ کی وفات ہو گئی۔

انہوں نے مجھے ایئرپورٹ سے فون کیا کہ وہ جا رہے ہیں اور مجھے جاتے ہی طلاق بھجوا دیں گے۔" ماضی میں پہنچی اماں' آنسو بہانے لگیں۔

"وہ آپ سے مل کر نہیں گئے؟"

"نہیں۔ تدفین کے فوراً" بعد وہ کسی کو بتائے بغیر چلے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ کوئی انہیں واپس جانے نہیں دے گا۔ انہیں جذباتی واسطے دیے جائیں گے۔ جیسے خالہ نے انہیں مجبور کر کے مجھ سے نکاح پڑھوا دیا تھا۔"

"اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلے گئے وہ؟" وہ کہیں اور ہی تھی۔

"ایسی بیوی کو جسے انہوں نے مجبوراً" قبول کیا تھا۔" انہوں نے دکھ سے خود پر ہی طنز کیا۔

"ایسی بیوی یا ویسی بیوی... ایسے کیسے جا سکتے تھے وہ؟"

"انہیں ایسے ہی جانا تھا منال! ان کا سامان میرے پاس ہی تھا۔ ان کی ڈائری بھی۔ جن میں ان کے سب فون نمبر لکھے تھے۔ میں نے ایک ہفتے بعد انہیں فون کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ باپ بننے والے ہیں۔ مگر وہ سمجھے کہ میں انہیں پھر سے بلیک میل کر رہی ہوں۔ انہیں خالہ کی طرح واپس بلانا چاہتی ہوں۔ انہیں میری کسی بات کا یقین نہیں آیا۔ انہوں نے مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مجھ طلاق دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ میں اپنی زندگی کسی اور کے ساتھ...."

"آپ نے طلاق کیوں نہیں لی؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"وہ میرے ساتھ رہتے یا نہ رہتے... مجھے ان سے طلاق نہیں چاہیے تھی۔ میں نے ان کی منتیں کیں کہ وہ مجھے طلاق نہ دیں۔ گھر میں' خاندان میں... میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے ہیں۔ میں نے سب سے یہ ہی کہا تھا کہ انہیں ضروری کام کی وجہ سے فوراً" جانا پڑا۔"

"انہوں نے پہلے کبھی آپ سے یہ بات کی تھی؟"

"کی تھی۔ تب خالہ زندہ تھیں... انہوں نے مجھے سمجھایا۔ نرمی سے' سختی سے' التجا سے کہ وہ مجھے رکھنا نہیں چاہتے۔ میں ان سے طلاق لے لوں۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے طلاق دے دیں گے اور مجھے طلاق ہی نہیں چاہیے تھی۔ جتنی قسمیں' واسطے میں انہیں دے سکتی تھی میں نے دیے کہ وہ مجھے طلاق نہ دیں۔ میں طلاق سے اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ میں نے دوبارہ ان سے رابطہ ہی نہیں کیا... مجھے یقین تھا کہ وہ آجائیں گے۔ ایک بار تو ضرور آئیں گے... لیکن" وہ افسردہ ہو گئیں۔

"لیکن وہ نہیں آئے... اور آپ نے اپنے یقین کی دنیا کو مسمار بھی نہیں ہونے دیا۔ اتنے سال گنوا دیے آپ نے انتظار میں۔" اسے سچ میں اماں کی محبت پر دکھ ہوا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں گنوایا منال! میں نے ان سے زبردستی شادی کی۔ بس پھر سزا کے طور پر ان کے نام کے ساتھ زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ جب مجھے ہی ان

سے کوئی شکایت نہیں ہے تو تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔"
"آپ نے اپنے حقوق معاف کردیے ہوں گے' میں نے نہیں کیے۔"
"تمہارے حقوق وہ تب ادا کرتے جب انہیں تمہارے بارے میں معلوم ہوتا۔"
"ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ میں ان کی بیٹی ہوں اور اسد ان کا بیٹا ہے۔"
"یہی سچ ہے منال! اگر تم اپنے پاپا سے نفرت کرتی ہو تو پھر تمہیں مجھ سے بھی کرنی چاہیے۔"
"ٹھیک ہے کہ وہ مجھے اور اسد کو نہیں جانتے۔ لیکن آپ تو ان کی بیوی ہیں۔ انہوں نے پلٹ کر کبھی آپ کی بھی خبر نہیں لی۔ کیسے انسان ہیں وہ۔ ایک عورت کو طلاق سے ڈرا کر انہوں نے اس کو خود پر حرام کرلیا۔ کتنی بھولی ہیں آپ اماں! ایک عورت کو اخراجات کے نام پر چند روپے اور سال' دو سال کی ملاقات نہیں دے سکتے تھے کیا وہ.... ؟ اگر شادی ہو ہی چکی تھی تو کیا اسے نباہ نہیں سکتے تھے؟" اس کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔
"میں نے یہ سب تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم ان کے لیے تم اپنا دل اور تنگ کرلو۔"
"پتا نہیں کیوں' آپ نے ایسے شخص کو میرا باپ بنا دیا۔ جس کو ہمارا اس دنیا میں آنا ہی پسند نہیں تھا۔ جس کے لیے ہم صرف ایک دھوکا تھے۔ آپ کیوں کہتی رہیں مجھ سے کہ میں ان کی لمبی عمر کی دعا کروں۔ ان کے واپس آنے کی.... کتنی بار میں ان کی تصویر سے لپٹ کر روتی رہی ہوں۔ آپ نے کیوں کہا کہ وہ ہمارے لیے اچھا مستقبل لینے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ اچھا مستقبل' جس کے خواب آپ ہمیں دکھاتی رہی ہیں؟ بھیانک ماضی اور شرمسار حال؟ وہ تو ہمیں جانتے بھی نہیں۔"
اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ اس سے تو کہیں بہتر وہ لاعلمی تھی جس میں اب تک اماں نے اسے اور اسد کو رکھا ہوا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ پاپا باہر جا کر بدل گئے ہیں۔ انہوں نے وہاں دوسری شادی کرلی اور وہ اماں کو بھول گئے۔ لیکن وہ تو انہیں اماں کی طرف سے دیا جانے والا دھوکا سمجھتے رہے تھے.... نیا صدمہ.... پرانے غم.... اس کے دل پر آفت ٹوٹ پڑی تھی۔
"کیا فائدہ ہوا تمہیں ساری حقیقت بتا کر۔ یہ باتیں تو میں نے کبھی تمہاری خالہ سے بھی نہیں کیں۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ سارا قصور سکندر کا ہے۔ جو ان کی بہن کو چھوڑ کر چلا گیا۔"
"وہ قصوروار ہیں.... وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ خوش باش زندگی گزار رہے ہیں اور ہم یہاں؟"
"میں بھی اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہوں۔"
"لیکن آپ کے بچے خوش نہیں ہیں۔" ان کی صحت خرابی کا خیال نہ ہوتا تو زور زور سے چلاتی۔
"سال کے چند ہفتے صحت یاب رہتی ہیں نا آپ؟ اور آپ خوش ہیں؟ ایسے خوش رہتے ہیں؟"
"میں خوش ہوں منال! میرے لیے تم دونوں کافی ہو۔ میں نے ہمیشہ ان کے لیے خیر کی دعا کی ہے اور کرتی رہوں گی۔ شروع میں مجھے ان سے شکوے تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئے۔ اپنے لیے ایسی زندگی کا انتخاب میں نے خود کیا تھا۔"
"آپ نے اچھی کوشش کی انہیں صحیح ثابت کرنے کی۔ ان کی غلطیوں کو اپنے سر لے لیا تاکہ میں انہیں ناپسند کرکے آپ کو دکھی نہ کروں۔"
"جو سچ تھا تمہیں بتا دیا ہے۔ میری عمر میں لوگ جھوٹ بول کر کیا کریں گے۔ خاص کر اپنی اولاد کے ساتھ۔"
"آپ نے وقت سے پہلے خود کو بوڑھا کرلیا ہے۔ اس میں کس کا قصور تھا؟" وہ پوچھنے لگی۔
وہ خاموش رہیں۔ منال کو ان کی خاموشی اور بے بسی پر ترس آیا تھا۔ جھریوں بھرا چہرہ محبت کے کٹورے کے خالی رہ جانے پر ماتم کناں تھا۔ اور وہ کہتی تھیں کہ وہ خوش ہیں۔ سسکیاں اور آہیں' آنکھوں میں مستقل ڈیرا ڈالے ہوئے تھیں اور وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں سکندر سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ چھ ماہ نکاح میں

رہنے کے عوض انہوں نے سالوں کی بیوگی جھیلی تھی۔ اور ان کا دعوا تھا کہ قصوروار صرف وہ ہیں۔

☆ ☆ ☆

"پاپا... میرا چیک۔" کھانے کے دوران بھی وہ بڑی آس سے انہیں دیکھتا رہا تھا لیکن کوئی جوابی رد عمل نہیں ملا۔ پھر پاپا ٹی وی دیکھنے لگے تو اسے خود ہی ان سے جواب مانگنا پڑا۔

"کیسا چیک؟" ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ "ڈونٹ ٹیل می' پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔" احد کو خطرے کی بو آرہی تھی۔ ڈورس ان کے ساتھ بیٹھی تھی' ابرو اچکا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو معلوم ہے کون سا چیک... آپ نے کہا تھا کہ آپ کو یاد کروا کر لے لوں... میری ٹیم کا فنڈ۔"

"سوری۔ میں تمہاری ٹیم کو فنڈ نہیں دینا چاہتا۔"

"لیکن کیوں؟ آپ تو ہر بار دیتے ہیں۔ میری ٹیم کو سپورٹ کرتے ہیں۔" کیا دال میں کچھ کالا تھا؟ اس نے ڈورس کی طرف دیکھا... نہیں... ڈورس ہی کالی تھی...

"اب نہیں کر رہا سپورٹ... سمپل۔" اطمینان سے کہہ کر وہ خبریں سننے لگے۔ دیکھا بھی نہیں کہ بیٹے کی حالت غیر ہو رہی ہے۔

"مجھے آپ کے فنڈ کی ضرورت ہے۔ ہمیں دوسرے شہر میں جا کر کھیلنا ہے۔ میرے سب فرینڈز دے چکے ہیں۔ اب صرف مجھے دینا ہے۔"

"تو تم اپنی پاکٹ منی سے دو...." ان کے لیے اس کا مسئلہ 'مسئلہ' ہی نہیں تھا۔

"میری پاکٹ منی میرے پرسنل اخراجات کے لیے ہے۔ پھر فنڈ کا پاکٹ منی سے کیا مقابلہ۔ وہ تو پاکٹ منی سے کہیں زیادہ دیتے ہیں آپ..." ڈورس نے پاپا کے شانے پر ہاتھ رکھا' اس ہاتھ پر اپنا چہرہ ٹکایا اور اسے دیکھنے لگی... وہ اسے گھورنے لگا۔

"پھر تمہیں سیونگ کرنا چاہیے تھی۔ کیونکہ وہ تمہاری ٹیم ہے۔ میری نہیں۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن میں سیونگ کیوں کروں جب آپ ہر سال' ہر بار مجھے ٹھیک ٹھاک فنڈ دیتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ آپ کو اچانک سے کیا ہوا؟" اچانک سے اسے دل کا دورہ پڑنے ہی والا تھا۔ اور ٹھیک اپنی ویمپائر بہن کے سامنے وہ دانت پیس پیس کر جان دے دینے والا تھا۔

"پاپا کی مرضی... تم انہیں تنگ کرنا بند کرو... وہ نیوز سن رہے ہیں۔" ڈورس بولی۔

"اوہ... آخر کب ایک جائز قتل لیگل ہو گا... آخر کب آنکھوں سے گھورنے پر مشین گن کی فائرنگ ہونے لگے گی۔

"تم چپ رہو... میں پاپا سے بات کر رہا ہوں۔" زبان کی لائن آف کنٹرول کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ بات ویسے ہی ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھی۔ ساری بات ہاتھ سے نکل گئی تو اس کی عزت کا جنازہ فٹ بال اسٹیڈیم میں پہنچنے سے پہلے ہی نکل جائے گا۔

"پاپا تمہاری ٹیم کو سپورٹ نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ تم اس فنڈ کو اپنی تفریح پر خرچ کرتے ہو۔ ہمیں تم پر ٹرسٹ نہیں ہے۔"

"جو خود پاگلوں کے ٹرسٹ میں ایڈمٹ ہونے کی شرائط پر پوری اترتی ہے وہ مجھے کہہ رہی ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

"ہم چاہے اسے دریا میں پھینک دیں' تمہیں اس سے کیا۔" آنکھوں سے فائرنگ نہیں ہو سکتی تھی تو کیا زبان سے بارود بھی نہیں اگلا جا سکتا تھا۔

"سمندروں' دریاؤں کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" کہہ کر وہ پھر سے نیوز سننے لگے۔

"میں مذاق کر رہا تھا... پلیز پاپا... پلیز۔" لیکن دونوں میں سے کوئی بھی متوجہ نہیں ہوا۔ ڈروس نے اپنا سر ہی پاپا کی گود میں رکھ لیا تھا۔ یعنی اوہ "ریڈ کارڈ" اب وہ ٹرین کی پٹری پر بھی لیٹ جائے گا تو بھی اسے فنڈ نہیں ملنے گا۔ فنڈ ایک ہی صورت ملے گا... اور وہ صورت تھی۔

"اوکے سوری... میں دوبارہ ڈورس کی کار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے معاف کردیں اور مجھے چیک لکھ دیں۔ مجھے آج فنڈ جمع کروانا ہے۔"

وہ دونوں بدستور ٹی وی کی طرف دیکھتے رہے۔ جیسے وہاں کوئی تیسرا موجود نہیں... جیسے انہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا۔

"ماما! آپ پاپا سے کہیں۔" وہ صوفیہ کو ان کے کمرے سے کھینچ کر لاؤنج تک لایا۔ "مجھے اس فنڈ کی شدید ضرورت ہے۔" فنڈ سے زیادہ اسے اپنی عزت کی فکر تھی۔ ماما سے اور انس سے وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ اب صرف اسے ان کا بڑا والا چیک چاہیے تھا۔

"آپ اسے دے کیوں نہیں رہے؟" صوفیہ پوچھ رہی تھیں۔

ڈورس نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔ انہوں نے سرہلایا اور چیک لکھ کر اسے دیا۔ چیک دیکھ کر اس کی جان سلگ گئی۔ وہ پولٹری فارم میں پلنے والی مرغی تھی جو اسے ننھی منی فیڈ دی جارہی تھی؟

"پاپا... یہ اتنے سے پیسے؟"

"لاؤ واپس کردو پھر... ادھر لاؤ۔" انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے منہ بنا کر چیک جلدی سے جیب میں رکھ لیا۔

"تمہارے منہ میں کپڑا ٹھونس کر، تمہیں انٹارکٹیکا کی طرف میں دبا کر آؤں گا۔ ہزار سال بعد جب تمہاری ڈیڈ باڈی دریافت ہوگی تو ہزار سال بعد کی نسل تم پر طرح طرح کے کیمیکلز ڈال کر تمہیں مزا چکھائے گی۔ پھر دیناڈیز انسو ڈریسز میں پوز پر پوز... اونہہ۔"

ڈورس کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پاپا بھی اپنی ہنسی روک نہیں پائے۔

"اور پاپا آپ! یہ جو آپ سوٹڈ بوٹڈ ہو کر آفس جاتے ہیں نا... کل ہی آپ کی کمپنی کے شیئرز پرائز ایسے گریں گے کہ لنچ ڈنر کرنا بھول جائیں گے۔"

"کیا پھا پھا کٹنی بن کر بددعائیں دے رہے ہو... چپ رہو۔" وہ قہقہہ لگانے لگے۔

وہ منہ پھلا کر چلا گیا۔ ایک دو چیزیں پھر پھینکتا گیا۔

"تم اسے بہت تنگ کرتی ہو۔" انہوں نے اسے اپنے سینے سے ساتھ لگا کر کہا۔

"وہ یہی ڈیزرو کرتا ہے۔ اپنے فضول فرینڈز میں آپ کے پیسے ضائع کرتا ہے۔"

"اس کی ٹیم بہت اچھا کھیلتی ہے۔"

"پیسوں کی وجہ سے۔" وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"شاید اپنی پریکٹس کی وجہ سے۔" شرارت سے کہتے ہوئے انہوں نے احد کی طرف داری کی۔ اگر یہ باتیں وہ احد کے سامنے کرتے تو خوشی سے وہ دوسرے تیسرے آسمان پر ہوتا اور وہاں سے واپس آنا بھی نہ چاہتا۔ لیکن ڈورس کے سامنے وہ احد کی طرف داری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ احد ہر مسئلے ہر بات کو جلدی ہی بھول جاتا تھا۔ لیکن اگر کبھی ڈورس ان سے ناراض ہو جاتی تھی تو دونوں ان سے ناراض رہا کرتی تھی اور وہ اسے ناراض نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"آج اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا اگر میں نے اسے وہ چیک بھی لکھ کر نہ دیا ہوتا تو۔"

"پاپا! آپ اس کی اتنی فکر کیوں کررہے ہیں۔"

اس کے لہجے میں حسد جھلکنے لگا۔ اگر وہ ضرورت سے زیادہ انس یا احد کا خیال رکھنے لگتے یا ان کی حمایت کردیتے تو اسے جلن ہونے لگتی تھی۔ وہ دونوں اس کے بھائی تھے لیکن اسے برے لگنے لگتے تھے۔ اس کے بس میں ہوتا تو اپنے علاوہ کسی کو بھی پاپا کی اولاد نہ بننے دیتی۔ وہ اپنے باپ سے بے انتہا پیار کرتی تھی کیونکہ وہ اس کے لیے خاص تھے۔ جیسا کہ پاپا ہوتے ہیں' اس سے کچھ زیادہ والے پاپا... ایک خاص عمر کے بعد تک وہ راتوں کو اٹھ کر ان سے لپٹ کر سویا کرتی تھی۔ اسی کی وجہ سے انہوں نے کبھی اپنے بیڈروم کو لاک نہیں کیا تھا۔ اکثر ان کی آنکھ کھلتی تو وہ ان کے ساتھ موجود ہوتی۔

صوفیہ جانتی تھیں کہ وہ اس کے لیے نہیں بلکہ اپنے پاپا کی وجہ سے اپنے بیڈروم سے ان کے بیڈروم میں

آتی ہے۔ ایک عرصے تک وہ اسے سمجھاتی رہیں کہ اب تم اسکول جانے لگی ہو۔ تھری کلاس میں ہو۔ تمہاری کلاس فیلوز کو معلوم ہو گا تو وہ کتنا ہنسیں گی۔"

"میں ان پر ہنستی ہوں کہ وہ اپنے پاپا سے اتنا دور کیوں رہتی ہیں۔" وہ مزے سے جواب دیتی۔

ویسے بھی ماں بیٹے اور باپ بیٹی کی محبت سب کے لیے ہی قابل فخر ہوتی ہے۔ اس میں اعتراض کا پہلو نہیں نکالا جا سکتا۔ صوفیہ جانتی تھیں کہ ڈورس کے معاملات کیسے دیکھنے ہیں.... اس کے پاپا کو.... وہ خود ان کے معاملات میں نہیں بولتی تھیں۔ بچپن سے ڈورس کے سارے کام وہی کرتے تھے۔ ان کے منع کرنے کے باوجود بھی۔ اسے نہلانا' اسے کھلانا' اس کے بال بنانا' اس کی پونی بنانا' اس کی شاپنگ اور وہ سب کچھ جو اس کے لیے کرنا پڑتا تھا۔ پاپا کے پاس جتنا وقت ہوتا اس وقت سے زیادہ وقت وہ ڈورس کے ساتھ گزارتے تھے۔ آہستہ آہستہ صوفیہ کو عادت ہو گئی کہ انہیں ڈورس کے کام نہیں کرنے۔ ویسے بھی وہ صوفیہ کے ہاتھ سے کھانا کھاتی تھی نہ ہی بال بنواتی تھی۔

"اسے اپنے ساتھ لے کر جایا کریں۔" ایک بار ان کے ٹور سے واپس آتے ہی انہوں نے شکایت کی۔

وہ بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے تھے۔ اور ڈیڑھ سالہ ڈورس کچھ کھا نہیں رہی تھی۔ رو رو کر بیمار ہو گئی تھی۔ دو ہی دنوں میں اس نے اپنی ماں کو بے حال کر دیا تھا۔ وہ فون پر فون کر کے انہیں واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھیں اور پھر اگلی بار جب وہ ملک سے باہر گئے تو سب کو ساتھ لے کر گئے۔

پہلے پہل صوفیہ کو انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی تھی.... ہوتی اب بھی تھی۔ مگر اب انہیں لگتا تھا کہ ڈورس کے ہوتے ہوئے وہ دو سروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ ان کی میٹنگز منسوخ کروا دیتی تھی۔ آفس میں جا کر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی تک لے آتی تھی۔ چاہے آفس میں وزیر تجارت ہی کیوں نہ بیٹھا ان کا انتظار کر رہا ہو اور وہ خود بھی ایسے وقت میں سلیقے سے معذرت کر کے اس کے ساتھ لنچ یا شاپنگ کے لیے نکل آتے تھے۔ صوفیہ نے باپ کو بھی سمجھانا چاہا اور بیٹی کو بھی۔ لیکن دونوں اتنے سمجھ دار تھے کہ انہیں بے وقوف سمجھتے تھے۔ انس اور احد کی حق تلفی ہو رہی تھی لیکن ڈورس کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ انس تو محسوس نہیں کرتا تھا لیکن احد ہر وقت اتنا جلا بھنا رہتا تھا کہ اس میں سے باربی کیو کی خوشبو آتی رہتی تھی۔

آج پھر وہ کوئلوں پر پڑا جل بھن رہا تھا۔ پاپا واپس آ چکے تھے اور اس کی ساری چیزیں بھول آئے تھے۔

"اس کی چیزیں تو نہیں بھولتے آپ۔ میری ہی بھول جاتے ہیں۔" چیزیں دس منگوائی تھیں' آئیں صرف دو تھیں۔ فرمائش اور حاصل فرمائش میں اتنا فرق.... اس کی ساری خوشی انٹار کٹیکا کی برف میں "ڈیڈ" ہو گئی۔

"ہر بار کہاں.... پچھلی بار تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں کافی کچھ لایا تھا۔"

"سب نہیں صرف تین۔ وہ بھی آٹھ میں سے۔ اور وہ پانچ ہی ضروری چاہیے تھیں مجھے۔"

"باقی کی پانچ ملی ہی نہیں۔ پتا نہیں کیا الٹا سیدھا منگواتے ہو تم۔"

"الٹا سیدھا...." اسے صدمہ ہوا "کچھ جوگرز تھے۔ کچھ اسپورٹس میگزین.... اور...."

"ہاں وہی.... مجھے ملتے تو میں ضرور لے آتا۔"

"اس کی شاپنگ سے وقت ملے آپ کو تو آپ کو کچھ اور یاد آئے نا.... اس کی لپ اسٹکس کے کلرز تک تو آپ کو یاد رہتے ہیں۔ ہائی لو ٹاپ.... سمر کلیکشن' اسکرٹس' مضحکہ خیز جوتے' بیگز اور پرفیومز...."

"اچھا چلو تم میری یہ لپ اسٹک لے لو۔ اور یہ اسکرٹ بھی.... یہ شوز بھی پہن کر چیک کر لو۔" تینوں بیگ اس نے اس کے سامنے کر دیے.... کتنا بڑا دل تھا اس کا۔

"کتنی ضرورت تھی مجھے ان جوگرز اور شرٹس کی۔ تصویر بھی دکھائی تھی آپ کو۔" اسے اپنا دکھ کھائے جا رہا تھا۔

"اگلی بار جائیں گے تو لا دیں گے احد!" صوفیہ نے اسے تسلی دی جو انہیں بے کار ہی ہوتی نظر آ رہی تھی۔ باربی کیو جل چکا تھا۔

"یہ تیسری بار اگلی بار ہے۔ ہر اگلی بار یہ بھول جاتے ہیں۔ ہر بار اگلی بار میں سوچتا ہوں کہ اب انہیں یاد رہے گا۔"

"میں جاؤں گی تو میں لا دوں گی۔"

"آپ جاتی ہی کہاں ہیں۔" وہ چلا اٹھا۔ تپی ہوئی نظر سے ڈورس کو دیکھا۔ جو ایک ایک آئٹم چیک کر رہی تھی۔ اس کی لسٹ میں زیادتی ہوتی تھی کمی نہیں۔ وہ دل کھول کر منگواتی تھی۔ پاپا بھی دل بڑا کر کے لاتے تھے۔ بھولتے تو وہ صرف اس کا تھے۔

☼ ☼ ☼

"منال..." اسد نے اس کے پاس آ کر سرگوشی کی جو سوچوں میں گم بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔

"ہاں... کیا ہے؟" وہ پہلے بوکھلائی پھر چڑ گئی۔

"وہ ساتھ والے انکل کامران ہیں ناں... جن سے تم اور میں انگلش اور سائنس پڑھتے تھے۔ اماں انہیں دو تین دن سے اپنے پاس بلا رہی ہیں۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتی ہیں ان کے ساتھ۔ ایک بار میں نے انکل سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ اپنی اماں سے ہی پوچھ لینا۔"

"اچھا..." منال نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اس سارے معاملے میں۔ اس کا رد عمل دیکھ کر اسد کو مایوسی ہوئی۔ اماں کی طبیعت اتنی خراب رہتی تھی کہ وہ ہر وقت پریشان رہتی تھی۔

"منال..." وہ ان کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب انہوں نے بہت پیار سے اسے پکارا۔

"جی؟"

"میری خواہش تھی کہ میری بیٹی مجھ جیسی ہو۔" آج ان کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ اس لیے وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ وہ شاید مذاق کے موڈ میں تھیں... اسے محسوس ہوا۔

"تو کیا میں آپ جیسی نہیں ہوں؟" اس کی انداز میں خفگی در آئی۔ وہ ہنسنے لگیں۔

"مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گی اور ایسے ہی کہو گی... بس میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا غصہ ختم کر دو۔ ہمیشہ کے لیے۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

"میں نے کب غصہ کیا؟"

"کیا نہیں... لیکن کرتی ہو۔"

"جب لوگ غلط بات کرتے ہیں تو مجھے غصہ آجاتا ہے۔"

"غصہ غلط بات پر ہی آتا ہے۔ اسے ہی ختم کرنا ہوتا ہے... کوئی تم سے کہے گا کہ تم بہت پیاری ہو۔ تب تو تمہیں اس پر غصہ نہیں آئے گا ناں؟" وہ ہنسنے لگیں۔

"آپ سے کسی نے میری شکایت کی ہے کیا؟"

"نہیں... شکایت تو نہیں کی۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

بیماری سے مرجھائے ماں کے چہرے پر جو مسکراہٹ کچھ دیر پہلے آئی تھی وہ پھر سے غم کے غار میں جا چھپی تھی۔ "میں نے آپ کو دکھی کر دیا ناں؟"

"کل رات تم نے اپنے پاپا کے کپڑے قینچی سے کاٹ کر جلا دیے۔ وہ کپڑے میرے لیے بہت خاص تھے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کپڑے اسد پہن کر مجھے دکھائے۔" انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی اس سے چھپانے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے باپ کو اپنے سمیت ان سب کی زندگی سے نکال دینا چاہتی ہے۔ ان کی ہر نشانی مٹا دینا چاہتی ہے۔ اس کا غصہ، بے بسی اور اشتعال کبھی تصویروں پر تو کبھی کپڑوں پر نکل رہا ہے۔

"جب وہ ہماری زندگی میں شامل نہیں تو ان کی چیزیں رکھ کر کیا کرنا ہے۔ آپ کو وہ کپڑے خود ہی پھینک دینا چاہیے تھے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا انداز ناگوار ہو گیا۔

"پھینک دیتی اگر محبت نہ کرتی ان سے۔ وہ میرے

شوہر ہیں۔ مجھے ان کی سب چیزیں عزیز ہیں۔ تم نے وہ کپڑے جلا دیے۔ جیسے میرے ارمان جلا دیے اور تم شرمندہ بھی نہیں ہو۔" وہ شکوہ کیے بغیر رہ نہیں سکیں۔ ان کا دل ۔غم سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

"اس شخص کے لیے میرا ہر عمل ایسے ہی ٹھیک ہے جیسے ان کا ہم سب کے لیے۔" وہ ہمیشہ ان کے ایسے انداز پر خفا ہوتی تھی۔

"وہ شخص نہیں 'تمہارے پاپا ہیں۔ اسد کو دیکھو' کتنا پیار کرتا ہے اپنے پاپا سے۔ کرتی تو تم بھی رہی ہو لیکن......"

"غلطی کرتی رہی ہوں.... گناہ کیا۔"

"منال! دیکھو' جب وہ تم سے ملیں گے تو تم سے کتنی محبت کریں گے۔ تمہارے سارے شکوے دور کردیں گے۔"

"چھوڑدیں اماں! بس کردیں اب۔ آپ نے ہمیں بھی اپنے ساتھ اس آس کی ڈور سے باندھے رکھا۔ کانٹوں کی وہ فصل کھڑی کی آپ نے جو کبھی کاٹی نہیں جاتی.... ہمیشہ جلائی جاتی ہے۔"

"میری محبت اتنی بے مول نہیں منال! وہ ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ میں نے ان کے گھر اور آفس فون کروائے ہیں۔ ان کے آفس کے نمبر بدل چکے ہیں۔ لیکن تمہارے انکل نے نئے نمبر حاصل کرلیے ہیں۔"

"تو انکل کامران کے ساتھ آپ یہ کرتی رہی ہیں۔ کیوں رابطہ کررہی ہیں آپ؟"

"ان سے بات نہیں ہوسکی۔ وہ اپنے آفس میں نہیں تھے۔ کہیں باہر تھے۔ یہ ان کے نمبرز ہیں۔ تم انہیں سنبھال کر رکھ لو۔ تم خود ان سے بات کرنا۔ میں نے تمہارے انکل سے بھی کہہ دیا ہے کہ جب تک ان سے بات نہیں ہوجاتی وہ انہیں بار بار فون کرتے رہیں۔"

وہ خوش تھیں اور مطمئن بھی۔ منال نے اس کاغذ کو پکڑ کر غور سے دیکھا جس پر اس کے پاپا کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ لیکن جیسے کھارے پانی میں سے سارا نمک نکل گیا تھا اور جو پیچھے رہ گیا تھا وہ پھوک سے بھی بدتر تھا۔

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ وہ میرے سامنے آبھی گئے تو بھی میں ان سے بات نہیں کروں گی۔" اس نے واضح ناگواری سے جواب دیا۔

"ضد چھوڑ دو منال! اپنے پاپا سے ملو۔ ان سے بات کرو۔ میری آخری خواہش سمجھ کر مان لو۔"

"آخری خواہش...." وہ جی جان سے تڑپ اٹھی۔ "ایسے مت کہیے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میرا دماغ پھٹ جائے اور میں پاگل ہوجاؤں۔ میں روؤں.... چلاؤں.... مرجاؤں میں؟"

"ایسی باتیں نہ کرو میری جان! میں چاہتی ہوں کہ تم ایسی بن جاؤ کہ تمہارے پاپا کو تم پر فخر ہو۔ وہ تم سے خوش ہوں۔ تمہیں خود کو بدلنا ہوگا۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں سے لگالیا۔ "مجھے تمہاری فکر ہے۔" کہہ کر وہ بستر پر دراز ہوگئیں۔ وہ بولتے بولتے تھک گئی تھیں یا شاید سوچتے سوچتے۔ یا جدائی کا خنجر انہیں لہولہان کرنے لگا تھا۔

وہ انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ بچپن سے اس نے اماں کو بیمار ہی دیکھا تھا۔ تھکا تھکا' نڈھال۔ گھر کے کام کرنے کے بعد وہ بستر پر بیماروں کی طرح لیٹ جاتی تھیں۔ ان دونوں کے لیے وہ صحت یاب رہنے یا ہونے کی کوشش ضرور کرتی تھیں۔ لیکن وہ صرف کوششیں ہی ہوتی تھیں۔ حقیقت میں وہ کم ہی صحت یاب ہوتی تھیں۔ جس محبت کا دم 'ان کا دل بھرچکا تھا' اس محبت کی جدائی میں اس دل کا دم نکل رہا تھا۔ آنسو بہانے کے لیے راتوں کی کمی تھی نہ تنہائی کی' کمی تھی تو بس اب حال دل سنانے کی' اسے جو کبھی ان کی دسترس میں آنے والا نہیں تھا۔ جو چھوڑ کر جاچکا تھا' وہ ان کے دل کی کسی بھی آہ پر لوٹ کر آنے والا نہیں تھا۔

محبت کی سیڑھی پر وہ الٹی طرف سے چڑھی تھیں' اسی لیے پاتال کی طرف جارہی تھیں۔

وہ رات اس نے آنسو بہاتے گزاری۔ "میری آخری خواہش سمجھ کر مان لو۔" اس بات نے اسے

کتنی ہی راتیں سونے نہ دیا۔ دنوں، پہروں، شاموں، دوپہروں، اس نے قیامت کی گھڑیاں گنیں۔ وہ ہر وقت اماں کے پاس رہتی۔ وہ سو جاتیں تو ان کے ہاتھ کو تھام کر بیٹھی رہتی۔ یہ گھر، اس پوری دنیا میں اس کے پاس اس عورت کے علاوہ تھا ہی کون۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اسے شکوہ تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے؟ اسی کی اماں کیوں بیمار ہیں؟ وہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟ یہ سب اسی کے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں کیوں؟ اب کیوں کا جواب کہاں ہے بھلا...

☆ ☆ ☆

اسٹور تک وہ حفصہ کے ساتھ اماں کی دوا لینے گئی تھی۔ واپس آئی تو دیوار پر تصویر لگی ملی۔ اس نے گھور کر اسد کو دیکھا۔

"اماں نے کہا تھا کہ ڈھونڈ کر یہاں لگا دوں..." اسد نے ڈر کر بتایا۔ "رو رہی تھیں بہت۔ میں نے چپ بھی کروایا مگر مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔" وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔

"اس بیماری میں تم نے انہیں رونے دیا۔" وہ تیزی سے اماں کے کمرے میں گئی۔

"کیوں اتنی تکلیف دے رہی ہیں آپ خود کو اور ہمیں۔" اس کا انداز بہت کڑا تھا۔ لیکن ان کی طرف دیکھتے ہی وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

"میں آخری بار ان سے ملنا چاہتی تھی... اب تم مجھے انہیں دیکھ تو لینے دو۔"

لفظ 'آخری بار' نے اس کی روح کھینچ لی۔

"آخری بار کیوں؟ ایسے کہیں گی تو میں زہر کھا کر آپ کے سامنے ہی مر جاؤں گی۔" وہ رونے لگی۔

"لائیں مجھے نمبر دیں ان کا، میں خود فون کروں گی انہیں۔ انہیں آنا پڑے گا آپ سے ملنے۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ میری ماں نے ان سے کتنی محبت کی ہے۔ ان کی جدائی میں اس نے اپنی آنکھیں انتظار کے چراغ پر جلائے رکھی ہیں... وہ آجائیں گے۔ جب وہ سنیں گے کہ ایک عورت نے اپنی زندگی کی ساری بہاریں ان کی محبت میں خزاں کر لیں۔ انہیں آنا پڑے گا اماں... یہ دیکھنا پڑے گا کہ عورت جب محبت کرتی ہے تو خود کو ختم بھی کر لیتی ہے... آپ نے خود کو کیسے ان کے لیے ختم کر دیا... انہیں اس کا احسان ماننا پڑے گا... میں آپ کی زندگی کا ایک ایک ورق پڑھ کر انہیں سناؤں گی۔ ہر ورق پر اپنے نام کی تکرار سنیں گے تو لوٹ آئیں گے..." وہ ان کا ہاتھ چومتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔

باہر رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا... اندھیرا جو اپنے ساتھ روشن دن کی نوید لاتا ہے

یہ اندھیرا بھی کچھ لا رہا تھا، اپنی سرشت کے ہاتھوں مجبور "زندگی" نگل لینے کا عندیہ۔

☆ ☆ ☆

چھٹی کا دن تھا اور وہ سب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈورس پاپا کو اپنے ٹرپ کی تصویریں دکھا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی اور ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ اس کے مصر جاتے ہی وہ بھی اپنے بزنس ٹور پر روانہ ہو گئے تھے۔ وہ گھر میں نہیں ہوتی تھی تو وہ بھی گھر سے باہر رہتے تھے۔ فون پر تو دن میں کتنی کتنی بار بات ہوتی رہی تھی لیکن ملاقات پچیس دن بعد آج ہو رہی تھی۔

"اب دو ہفتوں تک اس کا مصر نامہ سننا پڑے گا۔ جس میں ستر فیصد گپیں شامل ہوں گی اور تیس فیصد سنی سنائی کہانیاں۔" کاؤچ پر نیم دراز احد نے اس کی بک بک پر منہ بنا کر زیر لب کہا۔

"پاپا! اس سال ڈورس کا یہ دوسرا ٹرپ ہے۔ دونوں بار یہ تین ہفتوں سے زیادہ رہ کر آئی ہے۔" مسٹر جلے بھنے کباب نے بلند آواز سے شکوہ کیا۔

"یہ مڈ ایئر ٹرپ تھا... سال مکمل ہونے میں ابھی بہت وقت ہے۔"

"یہ تمہارا اس سال کا لاسٹ ٹرپ تھا۔ سمجھیں۔ اور پاپا مجھے تو آپ صرف ایک ہفتے کے لیے سپورٹ

کرتے ہیں۔" وہ ایسی ناانصافی پر مقدمہ لڑنے کے لیے اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ لہرا لہرا کر دلائل دینے لگا۔۔۔ "یہ سمجھتی کیا ہے خود کو۔۔۔ جا کر دکھائے یہ اب اگلے کسی ٹرپ پر۔"

"تم ہر بات میں حساب کتاب لے کر بیٹھ جاتے ہو۔" انہوں نے ڈانٹا۔

"کیونکہ آپ ہر بار مجھ سے فراڈ کر جاتے ہیں۔۔۔ فراڈیے ہیں آپ۔۔۔"

"احد! تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا بند کر دینا چاہیے۔ جتنی جلدی تم یہ بات سمجھ لو گے' اتنی جلدی اپنی تمام تکلیفوں سے چھٹکارا حاصل کر لو گے۔"

"جو جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہی ہو نا۔ ایک دن تمہارے ساتھ بھی یہی سب ہو گا۔" اس کی بددعاؤں کی ٹیپ شروع ہونے والی تھی۔

"ہاہاہا۔۔۔ تم ایسے خواب دیکھ سکتے ہو' کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"اللہ سب دیکھ رہا ہے مس ڈورس! انصاف ہو گا۔۔۔ ضرور ہو گا۔" اس نے انگلی لہرا کر ایسے کہا کہ ڈورس نے کشن اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ اس سے صرف تین سال بڑی تھی لیکن وہ اسے بڑا نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھ ہر معاملے میں زیادتی ہو رہی ہے۔ وہ پاکٹ منی کا مسئلہ ہو یا شاپنگ کا۔ ڈورس اس کے لیے کچھ چھوڑتی ہی نہیں تھی۔

انس ٹی وی پر فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ اسے ان دونوں کی تکرار سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اپنی پڑھائی کے بعد اسے صرف فٹ بال کی فکر رہتی تھی۔ نہ وہ ہیپ ہاپ کڈ تھا نہ اسے شاپنگ کا جنون تھا۔ اسے ڈورس کے حد سے بڑھے ہوئے اخراجات پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ احد کی طرح ڈورس کی ہر ایکٹیویٹی پر نظر نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے وہ اس کی چھوٹی بہن اور پاپا کی لاڈلی تھی۔ سب جانتے تھے کہ ڈورس کو ہمیشہ زیادہ ہی ملا ہے۔ ویسا ہی جیسا وہ چاہتی ہے۔ پاپا لینڈ کی وہ "کراؤن پرنسز" تھی۔ یہ تو اس کی مہربانی تھی کہ اس نے "پاپا لینڈ" میں انہیں بھی رہائش کی اجازت دی ہوئی تھی۔ ویسے پاپا نے اسے بچپن میں ہی سمجھا دیا تھا کہ چونکہ وہ لڑکی ہے اور اکلوتی ہے۔ اس لیے وہ تھوڑی خاص ہے۔

وہ تھوڑی سی نہیں۔۔۔ "پوری کی پوری" خاص تھی۔ یا صرف وہی خاص تھی۔

ڈورس اس سے دو سال چھوٹی تھی اور احد کے آنے تک تو وہ بھی اکلوتا ہی رہا تھا۔ لیکن پاپا ڈورس پر ایسے فدا تھے جیسے وہ کوئی پری ہو۔ شروع میں بچگانہ اختلافات پیدا کرنے کی کوشش اس نے بھی کی تھی۔ لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ گیا کہ بہتر ہے کہ وہ مقابلے بازی چھوڑ دے اور حقیقت کو تسلیم کر لے۔

لیکن احد کے لیے مسئلہ تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ابھی کم عمر تھا۔ اسی طرح کا جس طرح کے جسٹن بیبر کو پسند کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو ہر نئے ٹرینڈ کو خواہ مخواہ کول سمجھنے لگتے ہیں۔ اور سلینا گومز کے میوزک البم کی پہلی کاپی لینے کے لیے گھنٹوں قطار میں کھڑے' بارش میں بھیگتے رہتے ہیں۔ جو سال کے گیارہ مہینے بڑا کھاتے' پائے جاتے ہیں اور کبھی پیسوں کے لیے کافی ہیں کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔

"میں بھی اس سال بیس دن کے لیے ساؤتھ افریقہ جاؤں گا اور پورا ٹرپ آپ افورڈ کریں گے۔" اس نے خود سے ہی بلاوجہ اعلان کر دیا۔

"اوکے۔۔۔ چلے جانا۔۔۔" اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

"کیا سچ۔۔۔؟" اسے یقین نہیں آیا۔

"ہاں۔۔۔ چلے جانا۔۔۔ ہر بار تم مجھے کاپی کرتے ہو۔ اس بار بھی کر لینا۔" ڈورس اب کچھ بھی کہتی اسے غصہ نہیں آتا تھا۔

"آپ کا فون۔۔۔" صوفیہ نے انہیں فون لا کر دیا۔ جوان کے پکڑنے سے پہلے ہی ڈورس نے پکڑ لیا۔ وہ ایسے ہی ان کی فون کالز سنا کرتی تھی۔ خاص کر چھٹی والے دن۔ وہ بہت طریقے سے ان کی آفیشلز کالز کو ٹال دیا کرتی تھی۔

"لیس۔۔۔ ان ہی کا گھر ہے یہ۔۔۔" ڈورس نے بات

سن کر کہا۔

"نہیں وہ بات نہیں کرسکتے... میسج پلیز۔" کہہ کر وہ انتظار کرنے لگی۔

"واٹ...؟" وہ اتنی زور سے چیخی کہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "آپ یقیناً" مذاق کر رہے ہیں؟"

اس بار وہ ایسے ہنسی جیسے دوسری طرف سے کوئی جوک سنایا گیا ہو۔ "ویٹ پلیز..." اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر سب کی طرف دیکھا۔

"سنیں' سب سنیں' پاپا کوئی آپ کے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انس فون کال پرانک ہے۔" سرگوشی میں کہہ کر اس نے اسپیکر آن کردیا۔

"دوبارہ بتائیں آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنی ہے...؟" ڈورس اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بات کرو بیٹا..." اسپیکر میں سے آواز آئی... کسی نے گہرا سانس لیا اور خاموشی کے بعد آواز گونجی۔

"مجھے سکندر احمد سے بات کرنی ہے' میں منال ہوں' ان کی اور ثریا کوثر کی بیٹی..."

آواز بوجھل تھی تھکی' افسردہ' اور سوگوار۔

سکندر احمد کے چہرے کا رنگ اتنی تیزی سے بدلا کہ فون ہاتھ میں پکڑ کر ہنستی ڈورس کے دل کی دھڑکن مس ہوئی۔

"آپ کی بیٹی..."

انٹارٹیکا کی برفانی جھیل اس کا خون جما رہی تھی' وہ ڈوب رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فون مجھے دو ڈورس۔"

"نہیں دوں گی... پہلے بتائیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"ڈورس" وہ غصے سے چلائے اور فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

ڈورس بے یقینی سے مسلسل ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سکندر احمد فکر مندی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ سب انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ ڈورس جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ فون پر اس کے پاپا کی بات ہی ختم نہیں ہو رہی تھی اور اسے ٹھیک سے سانس نہیں آرہی تھی۔

"پاپا! کون تھی وہ لڑکی؟" انہوں نے جیسے ہی فون بند کیا ڈورس لپک کر ان کے پاس جا کر پوچھنے لگی۔

"مجھے پاکستان جانا ہے صوفیہ۔ آج کی فلائٹ سے۔ میری پیکنگ کردو جلدی سے۔" کہہ کر وہ باہر کی طرف جانے لگے۔

صوفیہ ان کی بات سنتے ہی بنا کچھ پوچھے ان کی پیکنگ کرنے کے لیے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آگئیں۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد سے انہوں نے کبھی پاکستان جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ آج اگر جا رہے تھے تو یقیناً" کوئی مسئلہ ہو گا۔ وہ سوال جواب کرتی تھیں۔ مگر ان کا مزاج اور وقت دیکھ کر...

"کیوں جانا ہے آپ کو...؟" صرف ڈورس ہی ایسے ماحول میں پوچھنے کی ہمت کرسکتی تھی۔ انس اور احد تو ان کا انداز دیکھ کر ہی چپ ہوگئے تھے۔

"ضروری کام ہے مجھے..." انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

"کون ہے وہ جس کا فون آیا تھا؟ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔" وہ اس بات کی وضاحت مانگ رہی تھی۔ جس کی تصدیق اس کا دل اور سکندر احمد کا فق چہرہ کرچکا تھا۔

"وہ میری بیٹی ہے..." ڈورس کے گال پر ہاتھ سے تھپکی دی۔

کتنے ہی لمحے ڈورس ان کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے وہ ابھی ہنس ہی دیں گے۔ جیسے اکثر مذاقاً" جھوٹ بولنے پر بعد میں وہ ہنس دیتے تھے... لیکن اب... وہ ویسے ہی خاموش کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

پاپا لینڈ کی "کراؤن پرنسز" کی آنکھیں آنسوؤں سے یکدم بھر گئیں۔

سکندر احمد کا خیال تھا کہ وہ ان سے لپٹ کر ہزاروں سوال کرے گی۔ مگر آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسکتی

وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اور پھر اس شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ انس اور احد ایک ساتھ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔

اسے زندگی میں کبھی رونے کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا' اب تو رونے کے لیے صدمہ دے دیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دو دن سے خاندان کا ہر فرد ان سے لڑ رہا تھا۔ ان کے آتے ہی کہرام برپا ہو چکا تھا۔ خاندان میں فیصلے کرنے والے بڑے تو نہیں رہے تھے۔ لیکن جتنے بھی لوگ تھے' وہ سب کے سب سکندر احمد سے سخت خفا تھے۔ ہر وہ شخص جو انہیں' ثریا اور منال کو جانتا تھا' طرح طرح کے سوال کر رہا تھا۔

"کہاں تھے تم اب تک؟ پلٹ کر اپنے خاندان کی خبر کیوں نہیں لی۔ دوسری شادی کر لی تھی تو پہلی شادی کی خبر بھی رکھنی چاہیے تھی۔ بیوی بچے یاد نہیں آئے تمہیں؟ مرنے والی مر گئی اب کیا لینے آئے ہو؟"

محلے والے' رشتے دار' دوست احباب' سب آ آ کر منال کے باپ کو دیکھ کر تصدیق کر رہے تھے کہ وہ واقعی میں آ چکا ہے یا صرف افواہ ہے۔

"ہاں! آ ہی گیا ہے...."

"اب بھی نہ آتا تو کب آتا....؟"

"یہ باپ تب آیا جب اس کی ماں کا جنازہ اٹھ گیا۔"

جب وہ کمرے میں آئی تھی تو اسد ان کے ساتھ چہک چہک کر باتیں کر رہا تھا۔ اسے جیسے قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف ماموں کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی تھی کہ اگر وہ ان کے سامنے آ بھی گئے تو وہ ان سے بات نہیں کرے گی۔ خاندان کے لوگ ان سے لڑے تھے' ناراض ہوئے تھے لیکن بہرحال وہ ان سے ملے ضرور تھے۔ لیکن منال نہ لڑی تھی نہ ملی تھی۔ وہ' وہ واحد فرد تھی جس نے انہیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ حفصہ اور نادیہ تک ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ مگر وہ خاموش تھی۔

جب انہوں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگانا چاہا تھا تو وہ ماموں کے پیچھے آڑ میں ہو گئی تھی۔

"تمہاری بیٹی تم سے ناراض ہے سکندر! اسے منانا اب تمہارا کام ہے۔" ماموں نے فوراً کہا۔

"منال! بیٹا ادھر آؤ میرے پاس...."

وہ جیسے ہی اس کی طرف بڑھے' وہ الٹے پیروں کمرے سے باہر نکل گئی۔ تیزی سے بھاگتی ہوئی وہ اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر لیا اور زمین پر ڈھیر ہو کر سسکنے لگی۔

سارا بچپن اس نے بچپن کے ساتھیوں سے اپنے باپ کی گمشدگی کے طعنے سنے تھے۔ اماں کو سسکتے سجدے میں گڑگڑا کر دعائیں مانگتے دیکھا تھا۔ خود ان کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ شدت سے ان کا انتظار کرتی رہی تھی.... لیکن اب سب ختم ہو گیا تھا....

اس کا باپ آ گیا تھا.... اس کی ماں جا چکی تھی۔

شاید اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا کہ اسے ایک ملے گا تو دوسرا گم رہے گا....

ایک ایسا شخص جس کا انتظار کرتے کرتے کسی کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں کیسے چمک سکتی تھیں۔ وہ اپنے زندہ باپ کے گلے سے کیسے لگ جاتی.... جب وہ اپنی مردہ ماں کے وجود سے لپٹ لپٹ کر ایسے روئی تھی کہ سارا خاندان دم سادھے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے رونے نے سب کو ساکت کر دیا تھا۔ اس کے غم کی شدت نے ان کے منہ سی دیے تھے' وہ اسے صبر' تسلی' حوصلے کے الفاظ کہنے سے معذور ہو چکے تھے۔ اس کے دکھ کے واویلے نے ان کے سینے چھلنی کر دیے تھے۔

ان کے آخری دنوں میں جب منال ان کا ہاتھ پکڑ کر یہ وعدہ لیا کرتی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔ تب وہ اس سے صرف ایک ہی بات کہتی تھیں۔

"میرا ہر اصرار تم نے رد کر دیا۔ اب تم ایک وعدہ کرو۔ میرے بعد تم اپنے پاپا کو فون کرو گی....؟"

"آپ میرے بعد کیوں کہتی ہیں؟ میں آپ کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ساتھ کوئی وعدہ آپ کے بعد کے لیے نہیں کر سکتی۔"

"تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ تمہیں ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔" انہوں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں چاہتی کہ تم اکیلی رہو۔ رشتے دار لاکھ اچھے سہی 'پر ہیں تو رشتے دار ہی ناں۔ تم ان کا خون ہو۔ ان کی اولاد ہو اور اولاد' اولاد ہی ہوتی ہے۔"

"نہ مجھے ان کی ضرورت ہے نہ ہی پڑے گی۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہہ کر ان کا سر چوما۔

"موت کبھی زندگی کے ساتھ نہیں رہتی۔" وہ حد سے زیادہ اداس تھیں۔

"آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے مجھ پر ترس نہیں آتا۔ آپ کیسے موت کا ذکر کر سکتی ہیں۔ وہ بھی ایسے بات بات پر؟"

"میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔" انہوں نے نقاہت سے کہا۔

"مجھے نہیں سمجھنا کچھ بھی...." اس نے ان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"مجھے ہمیشہ یہ خوف رہا کہ اگر میں نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے طلاق دے دیں گے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح کم سے کم تمہیں تمہارے پاپا مل جاتے۔"

"اگر وہ آپ کو چھوڑ دیتے تو کیا ہم انہیں اپنا لیتے۔"

"تم باپ کی شفقت سے محروم رہی ہو۔ ایک بار ان کے زیر سایہ چلی جاتیں تو یہ سب نہ کہتیں۔"

کہنے سننے کے لیے اب کوئی نہیں رہا تھا۔ خالی کمرے میں بیٹھی وہ ایک ایک بات یاد کر رہی تھی۔ وہ کئی بار اس کمرے میں چلا چلا کر اماں کو غائبانہ بتا چکی تھی کہ وہ انہیں ہاں کیوں نہیں کہتی تھی۔ انہیں کوئی وعدہ کیوں نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ اس کے دل میں وہم بیٹھ چکا تھا کہ اگر اس نے ہاں کہہ دی تو وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گی۔

"میں تو بس یہ چاہتی تھی اماں! کہ آپ کو یہ یاد دلاتی رہوں کہ آپ کو ہر حال میں میرے ساتھ رہنا ہے۔ آپ ہی میرا سہارا ہیں۔ آپ کو ہمارے لیے زندہ رہنا ہے۔ لیکن میری کوئی ترکیب کارگر نہیں ہوئی۔ کسی نسخے نے کام نہیں کیا۔"

"وقت محتاج نہیں ہے اور موت کا وقت 'اسے لفظوں' جذبوں 'منتوں کی بھیک دے کر روکا نہیں جا سکتا۔"

اس آخری رات جو اس نے ماں سے کہا تھا کہ ہاں میں انہیں فون کروں گی تو وہ اس نے پورا کر دیا تھا۔ ان کے مرنے کے تین دن کے بعد اس نے انکل کامران کے ذریعے فون کیا اور اپنے بارے میں بتایا۔ باقی باتیں ماموں' خالہ اور خاندان کے دوسرے لوگ ان سے کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ہی ساری تفصیل انہیں بتائیں۔

دس دن ان کے ساتھ رہ کر سکندر احمد واپس یونان چلے گئے۔ ماموں کے اکاؤنٹ میں ان کے لیے پیسے آنے لگے تھے۔ وہی پیسے جس کے لیے اس کے کزنز اس کو تنگ کرتے تھے۔ لیکن اب کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ نادیہ اور احمد بھی نہیں.... کیونکہ وہ دونوں اب جا رہے تھے۔ اپنے پاپا کے پاس.... جس چیز کے خواب انہوں نے سارا بچپن دیکھے تھے.... وہ خواب اب پورا ہونے جا رہا تھا.... لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ اس کی ماں کے آخری الفاظ۔

"اپنے پاپا کو بلا لینا.... ان کے ساتھ رہنا۔" نہ ہوتے تو وہ اپنی ماں کے کمرے میں گل سڑ کر مرجاتی لیکن اپنے باپ کے پاس نہ جاتی۔

گلے شکوے سب اپنی جگہ تھے۔ لیکن سب سکندر احمد کی کامیابی سے خوش تھے۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ ثریا کوثر ان کی کامیابی نہیں دیکھ سکی تھیں۔ لیکن اب ان کی اولاد دیکھنے والی تھی۔ ماموں' خالہ' حفصہ' احمد' سب خوش تھے کہ وہ ایک اچھی زندگی گزارنے جا رہے ہیں۔ ساری زندگی جو محرومیاں دیکھی تھیں' اب ان کا ازالہ ہونے جا رہا ہے۔ اسد پڑھنے لکھنے میں بہت لائق تھا' اب کسی اچھے کالج میں

پڑھ سکے گا۔ اپنے باپ کی طرح بڑا آدمی بنے گا۔

بچپن میں جو لوگ اسے بے چاری سمجھتے تھے' اب اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ دو ڈھائی لاکھ تو انہوں نے دونوں کو شاپنگ کے لیے دیا تھا کہ وہ جو کچھ پاکستان سے اپنے ساتھ لانا چاہتے ہیں' لے آئیں۔ اسد نے تھوڑی بہت شاپنگ کی تھی' اس نے اپنا پرانا سامان ہی باندھ لیا تھا۔

"بیٹا! اپنے بابا سے ناراضی ختم کر دو۔ وہاں ہنسی خوشی رہنے کی کوشش کرنا۔" ماموں اسے سمجھا رہے تھے۔

"ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گی؟" جب سے اس کے پیپرز بن رہے تھے تب سے حفصہ رو رہی تھی۔ ایک ہی سوال پوچھتی رہتی تھی۔

"سکندر بہت اچھا انسان ہے۔ تم دونوں کا بہت خیال رکھے گا۔"

وہ خاموشی سے سب کی نصیحتیں سنتی رہی۔ ہوں ہاں کرتی رہی۔ اماں کے جانے کے بعد' اس کا کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ اپنے سامان میں اس نے اماں کے کپڑے بھی رکھ لیے تھے۔ ان کی تصویریں' ہاتھ کی سونے کی دو باریک چوڑیاں' شال اور جائے نماز۔ وہ اماں کو سامان کی صورت سمیٹ کر اپنے ساتھ اس گھر میں لے جا رہی تھی' جہاں وہ زندہ وجود کی صورت نہیں جا سکی تھیں۔ خود کو تسلی دینے کے لیے وہ ایسے اپنی ماں کو اپنے ساتھ رکھ رہی تھی۔

جہاز میں بیٹھ کر اس نے اپنے دل کو نیچے زمین کی طرف کھنچتے پایا۔ جیسے وہ اماں کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو۔ سکندر احمد کی طرح ان سے دور بھاگ رہی ہو۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کچھ عرصہ بعد وہ دونوں بہن بھائی پاکستان واپس آجائیں گے۔ پاکستان میں ماموں' خالہ' حفصہ وغیرہ سب تھے۔ یہ لوگ اس کا خاندان تھے۔ انہوں نے ہی اسے پیار دیا تھا۔ اسے ان ہی کے پاس لوٹ کر واپس آنا تھا۔

وہ دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ اسد بہت خوش تھا۔ وہ تو پاکستان میں بھی روز دس بار ان سے فون پر بات کرتا تھا۔ اب تو وہ پھر ان کے پاس ہی جا رہا تھا۔

ایتھنز (یونان) کے ایئرپورٹ پر وہ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اسد گرم جوشی سے ان کے سینے سے جا لگا۔ وہ ایک طرف ان سے ہٹ کر کھڑی رہی۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے کبھی کراچی سے آگے سفر نہیں کیا تھا۔ کراچی تک بھی ٹرین میں گئی تھی۔ جب نیا نیا لاہور ایئرپورٹ بنا تھا تو وہ سب لوگ وہاں آؤٹنگ کے لیے گئے تھے۔ تب وہ چھوٹی تھی' یہی سوچتی تھی کہ اسی ایئرپورٹ سے ایک دن وہ اپنے پاپا کو لینے آئے گی۔ لیکن یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس ایئرپورٹ سے اسے ہی اڑ کر پاپا کے پاس جانا ہو گا۔

کچھ خواب پورے ہوتے ہیں تو بڑی تکلیف دیتے ہیں.... بہتر ہے وہ ادھورے ہی رہ جائیں....

"یہ تمہارا بھائی ہے احد.... اور احد یہ منال ہے۔ تمہاری بہن اور یہ اسد تمہارا بھائی...."

مسکراتے ہوئے احد نے اسد سے ہاتھ ملایا' پھر منال کے آگے اپنا ہاتھ کیا۔ منال نے اتنی ناگواری سے اسے گھورا کہ اسے اپنا ہاتھ پیچھے کرنا پڑا۔ "جہنم میں جاؤ۔" تاثرات کو دبا کر اس نے گاڑی کی طرف بڑھنا مناسب سمجھا۔ اسد بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ دونوں نے مل کر گاڑی میں سامان رکھا۔

منال کے لیے جہاز کا سفر بور تھا۔ لیکن گاڑی کا نہیں۔ کھڑکی سے باہر کے نظارے نے اس کا مزاج خوشگوار کر دیا تھا۔ تیزی سے گزرتی عمارتیں' سڑکیں' لوگ' آرائش' سب کچھ اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بھول گئی کہ وہ کہاں ہے' کس کے ساتھ ہے۔ وہ بچوں کی طرح ایک ایک چیز کو حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی گھر کے لیے بنی سڑک پر آئی' بے یقینی سے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ سب سے پہلے انہیں لان نظر آیا۔ جس میں پھولوں سے زیادہ سبز پودوں کی آرائش تھی۔ اب گاڑی لان کے درمیان بنی سڑک پر چل رہی تھی۔ پھر گھر نظر آنے

لگا۔

گھر۔ یعنی کہ اگر وہ گھر ہی تھا تو۔۔۔

اسد جلدی سے کود کر باہر نکلا اور احد کے ساتھ مل کر سامان نکالنے لگا۔ وہ کھڑی ہو کر اس گھر کو دیکھ رہی تھی جس پر اسے ابھی بھی شک تھا کہ وہ سکندر احمد کا ہے۔

"یہ یقیناً" کوئی ہوٹل ہو گا۔ شاید کھانا کھلانے لائے ہیں۔" اس نے سوچا۔

اسد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں روش پر چلنے لگے۔ اسد کے ایک طرف وہ تھی اور دوسری طرف پاپا۔ داخلی دروازہ کھول کر جس کے کھلتے ہی سارا گھر اپنے ہر زاویے سمیت آنے والے پر واضح ہو جاتا تھا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پوری کھل گئیں۔

اگر وہ گھر ہی تھا تو۔۔۔

اس نے اپنے رشتے داروں کے، محلے والوں کے، دوستوں کے، ٹی وی ڈراموں کے گھر دیکھے تھے۔ ایسے گھر نہیں جس گھر میں وہ اس وقت کھڑی تھی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ جب آیا تو وہ بدمزہ ہو گئی۔ اس کے ذہن میں ناگوار خیالات آنے لگے۔ وہاں موجود ہر چیز اسے زہر لگنے لگی۔ انہیں دو کمروں کے گھر میں بھول کر وہ خود اس عالیشان گھر میں رہتے رہے تھے۔ پھر انہیں ان کی، ثریا کی یاد کیسے آئی۔۔۔ اپنے آگے چلتے سکندر احمد کی پشت کو اس نے ناگواری سے دیکھا۔

"صوفیہ! بچے آ گئے ہیں۔"

صوفے پر بیٹھی وہ فون پر بات کر رہی تھیں۔ آواز سن کر فوراً" انھیں، فون بند کیا اور ان کی طرف آئیں۔ کھلے ٹراؤزر اور شرٹ میں، بالوں کا ڈھیلا جوڑا بنائے وہ اماں سے عمر میں بیس سال چھوٹی لگ رہی تھیں۔

اسد نے فوراً" آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اس کی طرف وہ خود بڑھ کر آئیں۔ اسے گلے سے لگایا اور حال احوال پوچھنے لگیں۔ وہ بے زاری سے جواب دے رہی تھی۔

احد نے ان کا سامان لا کر تقریباً" پٹخا اور جانے لگا۔

"بیٹا سامان کمرے تک لے جاؤ۔"

احد نے رک کر ماں کو دیکھا پھر نئے نویلے بہن بھائیوں کو۔ "جن کا سامان ہے وہ خود لے جائیں گے۔ اور پتا نہیں کیا کیا بھر کر لائی ہیں کہ اٹھایا جا رہا تھا نہ گھسیٹا۔ آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے ماما! کہ ہر طرح کے لیبر ورک کے لیے میں مناسب ترین شکار ہوں۔"

"میں تمہارے پاپا سے تمہاری شکایت کروں گی۔"

"شکایت بھی لگائیں اور مجھے پھانسی پر بھی لٹکا دیں۔ گھر کا چھوٹا بچہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ مجھ پر ظلم و زیادتی کی انتہا کر دیں۔" اس کا میلو ڈراما دن میں ہی شروع ہو چکا تھا۔

اسد فوراً" اٹھا اور سامان اٹھانے لگا۔ "آنٹی! میں لے جاؤں گا۔"

"لے جاؤ لیکن ایک بات یاد رکھنا' یہ گھر ایک عقوبت خانہ ہے جہاں تم سے دن رات مشقت لی جائے گی۔ پلس یہاں ایک ہٹلری ڈور سی بھی رہتی ہے۔ وہ تمہیں زندہ رہنے دے گی نہ مرنے۔۔۔ تیار رہنا۔" احد ہاتھ لہرا لہرا کر تقریر کر رہا تھا۔

"اچھا بس کرو اپنا ڈراما۔ تنگ نہ کرو انہیں۔۔۔"

صوفیہ ہنس رہی تھیں۔ منال اور اسد حیرت سے اس کی پٹر پٹر چلتی زبان کو سن رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے پیس صرف پاکستان ہی پروڈیوس کر سکتا ہے۔ لیکن یونان بھی پاکستان سے پیچھے نہیں تھا۔

"تم دونوں فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر دونوں سے کہا۔

صوفیہ بے حد متحمل مزاج اور مثبت سوچ کی مالک خاتون تھیں۔ سکندر احمد سے شادی صرف اور صرف ان کی محبت کا نتیجہ تھی۔ وہ نہ ان کی طرح تعلیم یافتہ تھے نہ ان کی فیملی کی طرح ویل میٹلڈ۔ ان کے دادا نے پاکستان سے یہاں آ کر کام شروع کیا تھا اور ان کے جوان ہونے تک دادا اور پاپا کامیاب بزنس مین بن چکے تھے۔ ان کا سارا خاندان یونان میں ہی آباد تھا۔ وہ سب پاکستانی تھے۔ لیکن یونانی پاکستانی۔

پاکستانی کمیونٹی میں وہ جانے پہچانے پاکستانی تھے۔

لیکن مقامی آبادی میں ان کا اثر ورسوخ زیادہ تھا۔

سکندر احمد سے شادی ان کا اپنا ذاتی فیصلہ تھا۔ سکندر نے ان سے اپنی منگنی اور شادی دونوں کو چھپایا تھا۔ اتنے سالوں بعد جب انہیں سب معلوم ہوا تو انہوں نے واویلا نہیں کیا۔ وہ سمجھ دار اور پڑھی لکھی تھیں۔ پھر سکندر سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس لیے ان کی بتائی ایک ایک بات سمجھ گئیں کہ ان کی شادی کن حالت میں ہوئی اور وہ انہیں پاکستان لے کر کیوں نہیں جاتے۔

انس اور احد کو بھی انہوں نے سمجھا دیا تھا۔ انس تو نارمل رہا اور احد کو بس اتنا افسوس ہوا کہ ایک اور ویمپائر بہن کے نام پر نکل آئی۔ اس کا ماننا تھا کہ دنیا کی ہر بہن "چڑیل" ہوتی ہے "بھائیوں کا خون پیتی ہے اور انہیں جلا جلا کر کوئلہ بنا دیتی ہے۔ اس کا یہ بھی ماننا تھا کہ مستقبل قریب میں ایک ایسی دوا مارکیٹ میں دستیاب ہوگی، جس کے استعمال سے بھائی "اذیت پروف" ہو جائیں گے۔

اور ڈورس..... وہ ہفتوں کمرے میں بند رہی۔ انتہائی بدتمیزی سے اس نے ملنے کے لیے آنے والے اپنے دوستوں تک کو دفع ہو جانے کے لیے کہا۔ گھر کی بہت ساری چیزیں اٹھا کر اس نے پول میں پھینک دیں۔ اپنی ہی لائی کچھ قیمتی چیزیں اس نے توڑ دیں۔ عام حالات میں احد اسے اور تنگ کرتا لیکن اب وہ بھی اس کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ اس سارے معاملے کا سب سے زیادہ صدمہ اسی نے لیا تھا۔ بات صرف اس کے ایسے رویے کی رہتی تو شاید سکندر احمد برداشت کر لیتے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان سے بات نہیں کر رہی تھی۔ اس نے اس دن کے بعد سے ان سے بات کرنا ہی بند کر دی تھی۔ اس کے پاپا نے دوسری شادی کی ہوئی تھی اور ان سے یہ سب چھپایا ہوا تھا۔ اور اب ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا بھی ہے۔

وہ خود نہیں جانتی تھی کہ اسے کس بات کا دکھ زیادہ ہے۔ ان کے شادی شدہ ہونے "دو بچوں کا باپ ہونے یا صرف "اپنے پاپا" نہ ہونے کا۔ اسے تو انس اور احد برداشت نہیں تھے "وہ دو اور کو برداشت کرے گی؟ اپنی محبت میں اسے شراکت داری قبول نہیں تھی۔ اب تو دو اور حصے دار آ گئے تھے۔

"اگر مجھ سے محبت کرتی ہو ڈورس! تو مجھے اس محبت کا اظہار بھی دو۔ مجھے اور پریشان نہ کرو۔ میرا ساتھ دو۔ اپنے باپ کو ایسے اکیلا نہ کرو۔ تمہیں یہ سمجھنا ہی پڑے گا کہ وہ شادی میری مجبوری تھی۔ لیکن وہ میرے بچے ہیں۔ انہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ تم انہیں احد اور انس کی طرح سمجھو۔ میں نے ہمیشہ وہ کیا جو تم نے کہا۔ تمہاری خوشی کے لیے میں نے آسمان کے ستارے بھی توڑ لانے چاہے۔ اپنے پاپا کے لیے تم بھی کچھ کرو۔ ناراضی چھوڑ دو۔ مسکرا دو۔ مجھے آج رات کی فلائٹ سے پاکستان جانا ہے۔ تمہیں ایسے چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا۔"

ان کے گلے سے لگ کر وہ رونے لگی۔ "آپ جلدی واپس آ جائیں گے؟"

"ہاں! بہت جلد....."

"آپ مجھ سے ہمیشہ پیار کرتے رہیں گے؟"

"ہاں! ڈورس..... باپ کا پیار کبھی اپنی اولاد کے لیے کم نہیں ہوتا۔"

☆ ☆ ☆

منال اور اسد دونوں ایک کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "کیا کریں" کہاں جائیں؟ انہیں اپنے اس نئے گھر میں اپنا مس فٹ ہونا بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اگر اس گھر میں اماں ہوتیں تو وہ خوشی سے چھلانگیں لگاتے۔ زندگی کی تصویر مکمل ہو جاتی۔ اب سب کچھ اجنبی لگ رہا تھا۔ پاپا "یہ گھر" اس گھر کے لوگ "پھر وہاں موجود ہر چیز اتنی خوب صورت تھی کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو رہے تھے۔ سکندر "صوفیہ" احد اور وہ گھر..... ایسی خوب صورت زندگی میں کم صورت "معمولی لوگ کہاں فٹ ہو سکتے ہیں۔

"میں باہر جاؤں؟" اسد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیوں؟" اس نے گھور کر دیکھا۔ وہ دونوں جڑواں تھے۔ لیکن اسد پر وہ بڑی بہنوں کی طرح رعب ڈالتی تھی۔

"باہر لان میں چلتے ہیں ناں.... کتنا پیارا ہے۔"

"آرام سے بیٹھے رہو.... کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی۔"

"اتنا تو آرام کیا تھا جہاز میں۔ چلو آؤ گھر کی سیر کرتے ہیں۔"

"تم اتنا خوش کیوں ہو رہے ہو؟" اسد کو ایسے دیکھ کر اس کی جان جل رہی تھی۔

"تو کیا کروں.... دیکھو کتنا پیارا گھر ہے ہمارا۔ پاپا کتنے امیر ہیں۔"

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے اور وہ ہمارے پاپا بھی نہیں ہیں۔ وہ ان کے پاپا ہیں جن کے ساتھ وہ یہاں رہتے ہیں۔ احد کو دیکھا کیسے ہمیں باتیں سنا رہا تھا۔ اور آنٹی کے کپڑے دیکھے ہیں تم نے؟ ہماری اماں بے چاری سرکاری ہسپتالوں کے چکر لگاتے لگاتے مر گئیں۔ صبح سے دوپہر تک پرچی لے کر لائن میں کھڑی رہتی تھیں پھر کہیں جا کر چیک اپ ہوتا' دوا ملتی۔ اور یہاں یہ سب عیش سے زندگی گزارتے رہے۔"

"ہاں! اگر پاپا ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھتے تو میں احد کی طرح لگتا اور اماں آنٹی کی طرح...." اسد بھی افسردہ ہو گیا۔

"اور ہم خوش ہوتے۔ اماں زندہ ہوتیں۔"

ایسی ہی باتیں یاد کر کر کے وہ بار بار روتی رہتی تھی۔ جس نے کسی کے غموں کے ساتھ زندگی گزاری ہو وہ اپنی خوشیوں میں بھی غم زدہ ہی رہتا ہے۔ اس کے لیے یہ بڑا عالیشان گھر بے معنی تھا۔ سکندر احمد کا بے حد امیر ہونا بے حیثیت تھا۔ کیونکہ ان کی حیثیت.... گزرا وقت واپس نہیں لا سکتی تھی۔ وہ اس گھر میں مجبوری کے تحت لائے گئے تھے' شوق یا محبت سے نہیں۔ وہ اس گھر اور اس گھر کے لوگوں سے کیسے محبت کر سکتی تھی۔ وہ تو ہر چیز کو آگ لگا دینا چاہتی تھی۔

صوفیہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ ان کی اماں' ان کی بیماری اور وفات کا پوچھ رہی تھیں۔ ان دونوں سے وہ مہذب طریقے سے افسوس کر رہی تھیں۔ مگر منال کو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ ان کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ وہ ایسی عورت کا ذکر کر رہی تھیں۔ جو کبھی ان کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔

پھر وہ انہیں رات کے کھانے کے لیے میز تک لائیں۔

"یہ تمہارا بڑا بھائی ہے انس...." انس اکیلا ہی کرسی پر ترچھا بیٹھا لاؤنج کی طرف منہ کر کے بار سلونا کا میچ دیکھ رہا تھا۔

"ہائے...." اس نے خوش دلی سے کہا۔

"انس! یہ منال ہے اور یہ اسد.... دونوں جڑواں ہیں۔"

انس مسکرانے لگا۔ اسد انس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ایسے میچ دیکھنے لگے' جیسے سالوں سے ایسے ہی ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھتے رہے ہوں۔ منال نے گھور کر اسد کو دیکھا لیکن اسد اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوا۔

"بیٹھ جاؤ منال!"

اور منال بیٹھ گئی۔ انس نے اسے دیکھا۔ میز لگاتی صوفیہ نے بھی ہاتھ روک کر منال کو دیکھا اور گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔ پاپا کراؤن کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ وہ ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے والی ہے تو وہ وہاں ہرگز نہ بیٹھتی۔ لیکن اب وہ بیٹھ چکی تھی۔ احد بھی آ کر بیٹھ گیا اور اسے دیکھ کر سیٹی ماری اور ماں کی طرف دیکھ کر' آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس نے سیٹی بھی سن لی تھی اور اشارہ بھی دیکھ لیا تھا لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ انس کی نظروں کے تعاقب میں پلازمہ اسکرین پر میچ دیکھنے لگی۔

"ہائے...." اسے سریلی آواز سنائی دی۔

اس آواز سے پہلے انٹرنس ڈور دھاڑ سے کھلا اور بند ہوا تھا۔ پھر جوتے کی ٹھک ٹھک سے گھر کا سکوت ٹوٹنے لگا تھا۔

"آئی ہوپ' میں لیٹ نہیں ہوئی...." لاؤنج کے

صوفے پر اس نے ہاتھ میں پکڑے ڈھیر شاپر پھینکے اور جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے پاپا کے گال کے ساتھ اپنا گال مس کیا۔۔۔ اور ٹھیک اسی وقت منال نے اسے دیکھا۔۔۔ اور اس نے منال کو۔۔۔

"آؤ ڈورس! منال اور اسد سے ملو۔۔۔" صوفیہ نے اس کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

احد نے پھر سے سیٹی بجائی اور ایک ہاتھ سے میز پر انگلیوں سے ردھم بجانے لگا۔۔۔ ون ٹو تھری۔۔۔

"ہائے منال!" اس نے منال کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے احد کے ہاتھ کی طرح اگنور کر دیا گیا۔ احد کی انگلیوں کا ردھم بدلا۔

"تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔۔۔ جلدی کرو، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کہا۔

اگر وہ میچ سے نظریں ہٹا کر دیکھ لیتی تو اسے معلوم ہوتا کہ کوئی اسے مسلسل گھور رہا ہے۔ ڈورس۔۔۔

"پاپا! منال سے کہیں، یہ میری چیئر ہے۔ یہاں سے اٹھ جائے۔"

اپنا نام سنتے ہی اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "ڈورس۔۔۔" اس نے زیر لب نام لیا۔

"ڈورس۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے۔ ایک بار پھر صوفیہ نے آواز دی۔ "ادھر آؤ میرے پاس۔" اپنی کرسی کے پاس کھڑی وہ اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

"نو ماما! پاپا! منال سے کہیں کہ وہ میری چیئر سے اٹھ جائے۔" اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور ناپسندیدگی بھی۔

وہ پاپا کے ساتھ والی اسی کرسی پر بیٹھتی تھی، اور صرف اسی کرسی پر بیٹھتی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی یا محبت۔ جو بھی تھا ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ وہ گھر میں نہیں ہوتی تھی تب بھی اس کی اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ احد اگر اسے تنگ کرنے کے لیے بیٹھ بھی جاتا تھا تو وہ کرسی الٹ دیا کرتی تھی۔ اسے کتنی چوٹ آئی اور کہاں کہاں آئی، وہ پروا نہیں کرتی تھی۔ وہ تو اس کا قتل تک کر سکتی تھی۔

"ڈورس! اپنی ماما کی بات مانو اور ان کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے پیار سے کہا۔ پر اس نے سنا ہی نہیں۔

"منال! تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔۔۔" اب اس نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔

منال نے سر اٹھایا نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔ وہاں ڈورس نہیں، نادیہ کھڑی تھی۔ جو اسے اپنے پاپا کی گود سے ذلیل کر کے اٹھا رہی ہے۔

"اٹھو میرے پاپا کی گود سے۔۔۔" نادیہ اسے کہہ رہی ہے۔ "اٹھو! اٹھتی کیوں نہیں ہو؟" نادیہ کی نوکیلی چبھتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ "یہ میرے پاپا ہیں۔ اٹھو یہاں سے۔ جاؤ اپنے پاپا کے پاس۔" کیا اب اتنے سالوں بعد، اپنی ماں کو کھو دینے کے بعد بھی اس کے ساتھ یہی سب ہو گا۔ اسے دوسرے کے لیے اپنی جگہ چھوڑنی ہو گی۔

نہیں، اب اسے نہیں اٹھنا تھا۔۔۔ وہ ایک بار پھر سے کسی نادیہ کو خود پر حکومت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"مجھے نہیں اٹھنا یہاں سے۔" اس نے جیسے بیک وقت دونوں کو جواب دیا۔ نادیہ کو بھی اور ڈورس کو بھی۔

ڈورس اس کی شکل دیکھنے لگی۔ احد نے ٹیبل بجانا بند کیا۔

"دوبارہ مجھے ایسے حکم نہ دینا۔ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے تو میرے بھی باپ کا گھر ہے۔"

سکندر احمد کے محل نما گھر میں منال بنت ثریا کوثر کے الفاظ ماضی کی ساری تلخیاں لیے، للکار کی طرح گونجنے لگے۔

ڈورس نے اپنی زندگی میں ایسا لہجہ اور ایسے الفاظ نہیں سنے تھے۔۔۔ انکار تو بالکل نہیں سنا تھا۔ وہ بھی پاپا کے سامنے۔

"تم ماما کے ساتھ جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"تم اپنی ماما کے ساتھ جا کر بیٹھ جاؤ۔۔۔" اس نے ہم

اپنی ماما' پر زور دے کر کہا۔ نظریں اس کی بدستور اسکرین کی طرف تھیں۔

"یہ میری جگہ ہے مس منال! انس اور احد بھی یہاں نہیں بیٹھتے۔" لہجہ وہ بھی بدل سکتی تھی۔

"یہ میرا کمرا ہے۔ یہ میرے پاپا ہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔" نادیہ دور کہیں سے چنگھاڑ رہی تھی۔

"آج سے یہ میری جگہ ہے میڈم ڈورس!" وہ چنگھاڑ کر بولی اور ہال میں سکوت چھا گیا۔

"ڈورس! میری بات مانو اور ماما کے ساتھ جا کر بیٹھ جاؤ۔" پاپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

منال نے ڈورس کے ہاتھ اور باپ کے پیار کو دیکھا۔ دل کی بستی تو پہلے ہی قائم نہیں تھی' اب اور اجاڑ ہوگئی۔

"منال! کھانا کھاؤ۔" صوفیہ نے چاول کی ڈش اس کی طرف بڑھائی۔ ڈورس دور بیٹھی اسے ترچھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے نہیں کھانا۔" غصہ اسے سکندر احمد اور ڈورس کی محبت پر آیا تھا۔ نکالنا وہ کھانے پر چاہتی تھی۔

"کیوں' کھانا پسند نہیں آیا؟" وہ فکرمند سی ہو گئیں۔

"کھانا تو پسند آیا ہوگا۔ ٹیبل پر بیٹھ کر کھایا نہیں جا رہا ہوگا۔" احد نے شاید ڈورس کا بدلہ لیا تھا۔

"ٹھیک کہا۔ ہمیں چیئر پر بیٹھ کر کھانے کی عادت نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے؟ کیونکہ ہمارا باپ سکندر احمد' تمہارا باپ بننے میں اتنے مصروف تھے کہ ہم انہیں یاد نہیں آئے۔ وہ تم سب کو کھلاتے رہے۔ اور ہم بھوکے بھی رہے اور جاہل بھی۔"

☼ ☼ ☼

سکندر کبھی اپنی اولاد کے سامنے اتنا شرمندہ نہیں ہوئے تھے جتنا اس وقت ہو رہے تھے۔ منال ان کی دوسری ان چاہی بیٹی ضرور تھی۔ مگر وہ اس کے والد تھے۔ جب وہ پاکستان میں سب کچھ چھوڑ کر واپس یہاں آئے تھے تو دو ماہ بعد ہی ڈورس ان کی گود میں آ گئی تھی۔ منال اور اسد کے آنے کی خبر انہیں ثریا نے دی تھی لیکن انہوں نے یقین ہی نہیں کیا تھا۔ کاش کر لیا ہوتا تو آج ان کی بیٹی ان سے اتنی نالاں نہ ہوتی۔

احد نے تمسخر سے اس کی طرف دیکھا۔ صوفیہ بوکھلا گئیں۔ "کیا کھاؤ گی؟ بتاؤ' میں ابھی بنا دیتی ہوں۔"

"مجھے یہ سب نہیں کھانا۔"

"انہیں اچھا کھانا کھانے کی عادت نہیں ہوگی ماما! وہ جو انڈین لوگ الٹا سیدھا کھاتے ہیں نا' وہ لا دیں انہیں۔" احد کو وہ بری نہیں' بہت بری لگ رہی تھی۔

اتنی سی دیر میں اس نے ان کے گھر کا سارا ماحول بدل دیا تھا۔

اس کے دماغ کا پارہ بھی کافی چڑھ گیا تھا۔ الفاظ وہ نظر انداز کر سکتے تھے لیکن انداز نہیں۔ اور کیوں کرتی؟ اس نے سامنے پڑا سوپ کا پیالہ احد کی طرف اچھال دیا۔

"مجھے اپنی یہ والی بہن مت سمجھنا۔" اس نے ڈورس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

یہ کام وہ اسد کے ساتھ تب تب کرتی تھی جب اس کا غصہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اسد کو جان سے مار دے۔ اس کا دل چاہا احد کو بھی مار دے۔

سوپ احد کے منہ اور شرٹ پر گرا۔ سب ایک ساتھ اٹھے۔ احد کے منہ سے تیزی سے انگلش میں گالیاں نکلنے لگیں۔ وہ اس کے سر پر کچھ دے مارنا چاہتا تھا۔ انس' احد کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا جو غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

صوفیہ نے سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر نے بس ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یہ ان سب کے لیے نیا تھا۔ احد اور ڈورس کی لڑائیاں ہوتی تھیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

سکندر نے احد کو ڈانٹ کر کمرے میں بھیج دیا۔

"صوفیہ! تم منال سے پوچھ کر اس کے لیے کچھ بنا دو۔"

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔" اس نے اطمینان سے

جواب دیا۔ اسد اسے مسلسل گھور رہا تھا۔
صوفیہ سکندر احمد کی طرف دیکھنے لگیں کہ اب کیا کریں۔
”منال، اسد! میرے ساتھ آؤ۔ صوفیہ! تم گاڑی کی چابی لے آؤ۔“
”پاپا! میں ڈرائیونگ کروں گی۔“ ڈورس جانتی تھی کہ ان کی نظر کمزور ہے۔ ان کے لیے رات کو ڈرائیونگ کرنا ٹھیک نہیں۔
”اوکے... آجاؤ۔“ وہ آگے بڑھے۔
”ہمیں صرف آپ کے ساتھ جانا ہے۔“ اس نے براہ راست پہلی بار پاپا کو مخاطب کر کے کہا۔
ڈورس کے ہاتھ سے چابی لے کر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ ڈورس انہیں جاتا ہوا دیکھنے لگی۔
”بیٹا! وہ اتنا عرصہ اپنے پاپا سے دور رہی ہے۔ پھر وہ کچھ ناراض بھی ہے ان سے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑا وقت لگے گا۔“ صوفیہ نے ڈورس کو سمجھانا چاہا۔
”ماما! میں صرف پاپا کے لیے یہ سب برداشت کر رہی ہوں۔ پاپا سے بدتمیزی میں برداشت نہیں کروں گی۔ وہ کتنی بدتمیزی سے بات کرتی ہے پاپا سے؟؟“
”کیونکہ وہ خفا ہے ان سے۔“
”میں بھی خفا ہوتی ہوں پاپا سے۔ میں تو ایسے بی ہیو نہیں کرتی۔“
”تم میں اور اس میں فرق ہے ڈورس۔“
”ہاں، مجھ میں اور اس میں بہت فرق ہے اور یہ فرق ہمیشہ رہنے والا ہے۔“

☆ ☆ ☆

سکندر احمد اس سے بات چیت کی ہر کوشش میں بری طرح سے ناکام ہو چکے تھے۔ وہ انہیں مخاطب کرتی تھی نہ ان کی طرف دیکھتی تھی۔ انہوں نے دونوں کو شاپنگ کروائی۔ انہیں اپنے ساتھ آؤٹنگ کے لیے لے کر گئے۔ مگر پھر بھی ان کے درمیان اجنبیت موجود رہی۔ صوفیہ کی وجہ سے منال ان کے ساتھ چلی بھی گئی تھی۔ ورنہ شاید کبھی نہ جاتی۔ ان کی نسبت وہ صوفیہ کا لحاظ کر لیتی تھی۔ صوفیہ سے بات بھی کر لیتی تھی۔
اسد کو الگ کمرا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ فی الحال منال کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ انہیں عادت تھی ایک ہی کمرے میں سونے کی۔ پاکستان میں تینوں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ وہ اماں کے ساتھ بیڈ پر اور اسد صوفے پر۔

”ڈورس آپی جیسی خوب صورت لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“
وہ دونوں اپنے کمرے سے ڈورس اور پاپا دونوں کو جاگنگ کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔
”خوشی ہر انسان کو خوب صورت بنا دیتی ہے۔“ کمرے کی کھڑکی سے وہ دونوں کو ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
”انس بھائی نے کہا ہے کہ میں ان کے ساتھ لندن چلوں۔“
”تم لندن جاؤ گے؟“ شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ تم مجھے چھوڑ کر لندن جاؤ گے۔
”ہاں! انس بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہاں میرا ایڈمیشن آسانی سے ہو جائے گا۔“
اسد کو باہر جا کر پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کہاں...؟ بس باہر۔ کوئی سا بھی ملک ہو۔ کوئی بھی کالج یا یونیورسٹی ہو۔ وہ لائق بھی بہت تھا۔ اماں ہمیشہ ان دونوں سے کہتی تھیں کہ وہ دونوں کو پڑھنے کے لیے باہر بھیجیں گی۔ اسی لیے انہوں نے سکندر احمد کا آبائی گھر سنبھال کر رکھا ہوا تھا تاکہ اسے بیچ کر وہ ان دونوں کو پڑھا سکیں۔ وہ انہیں سکندر احمد کے لیے قابل فخر بنانا چاہتی تھیں تاکہ وہ انہیں قبول کرتے ہوئے شرمائیں نہیں۔
باہر کہیں جا کر پڑھنے کا شوق تو منال کو بھی بہت تھا۔ لندن یا امریکہ۔ اس کے محدود جغرافیائی علم میں ایتھنز کہیں نہیں آتا تھا۔ لیکن اب اسے یہیں رہنا تھا۔ سکندر احمد کے گھر میں ڈورس کی جگہ پر۔ وہ جیسے جیسے سکندر احمد اور ڈورس کی محبت کو دیکھ رہی تھی، ویسے ویسے اسے اپنے بچپن کی سب باتیں یاد آنے لگی

تھیں۔ سارے مذاق‘ سارے سوال‘ سب واقعات‘ سب کچھ۔ یہاں رہ کر اسے ماضی کا حساب لینا تھا۔

باہر لان میں وہ ابھی بھی پاپا کے ساتھ جاگنگ کر رہی تھی۔ ان کے شانے سے جھول رہی تھی‘ ان کے ساتھ ریس لگا رہی تھی۔ تین دن پہلے ہونے والے واقعہ کے بعد سے ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ احد کو جتنا صوفیہ اور سکندر احمد نے ڈانٹا تھا‘ وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن پاس سے گزرتے ہوئے فائر کرنا بند بھی نہیں کرتا تھا۔

”میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ اس گھر پر برا وقت آنے والا ہے۔ اتنا برا وقت آنے والا ہے‘ یہ نہیں جانتا تھا۔“

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس افتادہ گھر سے اٹھا کر باہر پھینک دوں۔“ اس کی فائرنگ کے جواب میں وہ بھی خاموش نہیں رہی۔

”میرے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ ہوتا تو اس وقت پاپا تمہارے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر سائن کر رہے ہوتے۔“

وہ اس کی زبان کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ لیکن دوبدو ہونے سے ڈرتی نہیں تھی۔

”تمہیں پتا ہے اس گھر کی خوب صورت ترین جگہ کون سی ہے؟“ اسد گھر کا چپہ چپہ گھوم چکا تھا۔

”لان....“ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

”لان کو بھول جاؤ.... اس گھر کے سب سے خوب صورت انسان کا کمرہ ہی سب سے خوب صورت ہے۔“ ایسی باتیں کرنے میں اسد کو بہت مزہ آتا تھا۔

”ڈورس کا؟“ اس کی خوب صورتی اس کی شناخت تھی۔ اسے نام پوچھنے میں دیر نہیں لگی۔

”ہاں! تم سوچ بھی نہیں سکتیں ایسا کمرا ہے ڈورس آپی کا۔ کمرے میں لان کی طرف جو دیوار ہے‘ وہ پوری کی پوری شیشے کی ہے۔ زمین سے لے کر چھت تک‘ وہاں سے شام کے سورج کا جو منظر نظر آ رہا تھا نا۔ بس کمال لگ رہا تھا۔ اوپر سے کمرے کی ڈیکوریشن‘ سچی دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اسی کمرے میں کھڑا ہوں۔ خود بھی کسی ہیروئین سے کم نہیں ہیں ڈورس آپی۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔۔۔ اور یہ تم اسے آپی کیوں کہتے ہو؟ مجھے تو نہیں کہتے؟“

”تم مجھ سے بڑی تو نہیں ہو‘ ویسے وہ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ کل اسپورٹس کار میں گھمانے کی آفر کر رہی تھیں۔ تمہارے ڈر سے میں نے انہیں انکار کر دیا۔“

”اگر میں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھ لیا نا تو اچھا نہیں ہو گا اسد!“ غصہ اسے ڈورس کے کمرے کا احوال سن کر آ رہا تھا۔ نکال وہ اسد پر رہی تھی۔

پاکستان میں ان کے دو کمرے چھوٹے لیکن روشن تھے اور وہ ان کی ضرورت کے لیے کافی تھے۔ کافی بڑا تو یہ کمرہ بھی تھا جو اسے دیا گیا تھا۔۔۔۔ لیکن ڈورس کا کمرہ.... اتنے سالوں کے بعد ملنے پر بھی سکندر احمد نے انہیں سب سے پیچھے ہی رکھا تھا۔ انہیں اپنی پہلی اولاد سے کم ہی دیا تھا۔ یہ تو اس کی ہتک تھی‘ اماں کی محبت کا صلہ ملا تو یہ؟

اسد کو وہیں چھوڑ کر وہ نیچے آ گئی۔ صوفیہ کچن میں کام کر رہی تھیں۔ ڈورس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لیکن لاک نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ جو کچھ اسد نے بتایا وہ بہت کم تھا۔ فرنیچر کی جو قسم وہاں موجود تھی وہ ان کے نام تک سے واقف نہیں تھی۔ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ اس کی وسعت میں آرام سے سائیکلنگ کی جا سکتی تھی۔ لان کی طرف کا سارا حصہ باریک لکڑی کے فریم کا بنا تھا۔ یہ فریم چھت تک اور چھت سے اوپر کی طرف ترچھا تھا۔ اور اس بڑے دیوہیکل فریم میں صاف شفاف شیشہ نصب تھا۔ کمرے سے سارا لان نظر آ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں سب سے پہلے یقیناً اسی کمرے میں پڑتی ہوں گی۔ صبح‘ شام‘ دن‘ دوپہر‘ رات‘ دھوپ‘ بارش‘ گرمی‘ سردی۔ سارے موسم سب پہر اس کمرے کی آرائش ہوتے ہوں گے۔ وہ صرف ایک کمرا نہیں تھا‘ وہاں تو ایک عالم آباد تھا۔

جن کے لیے وہ اہم تھی وہ چلی گئیں... اس کی منت سماجت کے باوجود۔ جو اس کے پاس تھے ان کے لیے کوئی اور اہم تھا۔

رات کو جب پاپا اور ڈورس چیس کھیل رہے تھے تو وہ ان کے سر پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے میرا کمرا چاہیے۔" تنے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

ڈورس نے ناپسندیدگی سے اس کی طرف دیکھا... انہوں نے صوفیہ سے پوچھا۔ "منال کو شاید اپنا روم پسند نہیں آیا۔ تم اس سے پوچھ کر سیٹنگ کروا دو۔"

"جو روم مجھے دیا گیا' وہ روم نہیں چاہیے۔" صوفیہ کے کچھ بھی بولنے سے پہلے اس نے جلدی سے کہا۔

"گھر میں ایک اور روم بھی ہے۔ تم وہ بھی دیکھ لو۔" حسب عادت صوفیہ نے نرمی سے کہا۔

"میں سب رومز دیکھ چکی ہوں۔ ویسے بھی مجھے فرسٹ فلور پر نہیں رہنا۔ مجھے نیچے وہ روم چاہیے۔" اس نے ہاتھ سے کمرے کی طرف اشارہ کیا... ڈورس کے کمرے کی طرف' لیپ ٹاپ پر کام کرتے انس نے اس کے اشارے کی طرف دیکھا۔ آئی فون کے ساتھ مصروف احد نے بھی اور صوفیہ نے بھی۔

ڈورس نے اس کے ہاتھ کے اشارے کے بجائے اسے دیکھنا ضروری سمجھا' اس کی بھنوئیں تن گئیں۔

"وہ روم ڈورس کا ہے۔" پاپا نے نرمی سے کہا۔ "تم کوئی اور روم دیکھ لو..."

"آپ نے تو کہا تھا کہ یہ میرا بھی گھر ہے۔" وہ انہیں یاد دلاتے ہوئے جتا رہی تھی۔

"ہاں یہ گھر تمہارا ہے۔ جیسے ان سب کا ہے۔"

"مجھے اپنے گھر کا وہ روم چاہیے۔" اس کا ہاتھ بدستور اسی کمرے کی طرف تھا۔ ڈورس کے لب بھینچ گئے۔

"تم میرا روم لے لو۔ آؤ میں تمہیں اپنا روم دکھاؤں۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"مجھے وہی روم پسند ہے اور مجھے چاہیے بھی صرف وہی۔ آپ کو میری پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔" اس آخری بات میں ان کے لیے جو گہرا طنز تھا اسے وہاں بیٹھے ہر شخص نے اچھی طرح سے محسوس کیا۔

احد اس ساری سچویشن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے ڈورس کی طرف دیکھا اور آنکھ ماری۔

"آج کا نیا جوک! انہیں ڈورس کا روم چاہیے۔ چاند مل جائے گا۔ وہ روم نہیں۔" احد اپنی زبان کو شٹ اپ نہیں کہہ سکا تھا۔

"بیٹھ جاؤ منال! اور آرام سے میری بات سنو۔ ایسے بے جا ضد نہ کرو۔ جیسے میں تم سے کچھ بھی چھین کر کسی اور کو نہیں دے سکتا' ایسے ہی کسی اور سے کچھ لے کر تمہیں کیسے دے دوں؟"

"پر ہمیں تو آپ نے کبھی کچھ دیا ہی نہیں؟"

سکندر احمد کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا۔

"بولیں' کیا دیا ہے ہمیں؟ آپ کی بیوی' میری ماں' سالوں پھٹے پرانے کپڑوں سے تن ڈھانپتی رہیں کیونکہ نئے کپڑوں کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ہمیں اکثر پیدل چل کر اسکول جانا پڑتا کیونکہ ہمارے پاس کرایہ نہیں ہوتا تھا۔ مہینہ ختم ہونے سے پہلے راشن ختم ہو جاتا تھا تو اماں کو ماموں سے ادھار پیسے لینے پڑتے تھے۔ ادھار نہیں ملتا تھا تو ہم تینوں کو بھوکے جاکر تین وقت کھانا کھانا پڑتا تھا... بتائیں نا کیا کیا آپ نے ہمارے لیے؟ سب کچھ تو آپ نے اپنی اس اولاد کو دے دیا۔ آج آپ مجھے سنا رہے ہیں کہ آپ ان سے کچھ چھین نہیں سکتے۔ ان سے نہیں چھین سکتے تو ہم سے ہمارا بچپن کیوں چھینا؟ ہماری ماں کیوں چھینی؟ مجھے وہ روم چاہیے' آج اور ابھی ورنہ میں پاکستان واپس چلی جاؤں گی۔"

"آج اور ابھی کیا' وہ تمہیں کبھی بھی نہیں ملے گا۔" ڈورس کو کمرے کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اس کے باپ کی بے عزتی کر رہی تھی اور وہ اسے جان سے مار دینا چاہتی تھی۔

"مجھے یہ نہیں چاہیے۔" اس نے سکندر احمد کی طرف اشارہ کیا۔ "تم شوق سے انہیں ساری زندگی

اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔ لیکن کمرا تو میں لوں گی۔"
"پاپا کو بہت شوق تھا انہیں یہاں لانے کا۔" احد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے احد!" وہ غصے سے چلا دیے۔ "منال! تم ڈورس کا روم اس کے ساتھ شیئر کر لو۔"
"پاپا! اب میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔ یہ مجھ سے میری مرضی کے خلاف میرا سب کچھ نہیں لے سکتی۔"
"یہ تم سے آج روم مانگ رہی ہے۔ پھر اسے تمہارے کپڑے، جوتے، تمہاری گاڑی بھی چاہیے ہو گی۔" احد باز نہیں آیا تھا۔
"یہ سب میں مانگوں نہیں، بلکہ چھین لوں گی۔"
منال نے قسم کھالی تھی کہ وہ ان سب کا سکون برباد کر کے ہی۔۔ رہے گی۔
"تم مجھ سے چھینو گی؟" اس نے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا۔ اس فقرے میں کھلی دھمکی تھی۔
"ہاں۔" اس نے بہت آرام سے کہا۔
"ہونہہ! کیا تم صبح اٹھ کر مرر نہیں دیکھتیں؟ کل ضرور دیکھنا۔ میرے روم کو بھول جاؤ۔ دوبارہ میری چیزیں کاؤنٹ نہ کرنا۔ مجھے اس سب کی عادت نہیں ہے۔" وہ بدتمیزی کیے جا رہی تھی، تو ڈورس نے بھی ابتدا کر دی۔
صوفیہ نے دو تین بار، دونوں کو باری باری روکنے کی کوشش کی۔ مگر کوئی بھی ان کی بات نہیں مان رہا تھا۔
احد آڑا ترچھا کھڑا کلائمکس کے انتظار میں تھا۔ انس اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر جا چکا تھا۔ سکندر احمد اپنی جگہ بے بس کھڑے تھے۔
"یہاں رہنا ہے تو رہو ورنہ مجھ سے کہو، میں تمہاری سیٹ بک کروا دوں۔" بالوں کو جھٹک کر حسن کی دیوی نے، ہاتھ سینے پر باندھ کر کہا۔
"منال! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں اور صوفیہ تمہارے پاس آتے ہیں۔"
ڈورس کے بجائے انہوں نے اس سے کہا۔ ان

کے چہرے پر چھائی پریشانی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے میں ڈورس کو مجبور کرنا نہیں چاہتے کہ تم اپنا کمرہ دے دو۔ تو وہ ڈورس کو اب بھی اولیت دے رہے تھے۔ انہیں وہی عزیز تھی اب بھی۔
"اسے کمرے میں نہیں، پاکستان واپس بھیجیں پاپا!" ڈورس نے تمسخر سے ہنس کر کہا۔
اس نے ڈورس کی آنکھوں کے غرور کو دیکھا۔ اعتماد سے تنی ہوئی اس کی گردن کو۔ باپ کے زیر سایہ پلنے والے اس کے حسن کو۔
اس نے قدم وہاں سے آگے بڑھائے لیکن اوپر اپنے کمرے کی طرف نہیں۔ لاؤنج سے دائیں طرف۔۔۔ صوفیہ، اسد، اور احد نے اسے ڈورس کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔۔۔
وہ اس کے روم کی طرف کیوں جا رہی ہے۔۔۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ۔۔۔
شیشوں کے ٹوٹنے کی زوردار آواز نے انہیں کمرے کی سمت تیزی سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ احد سب سے پہلے کمرے کی طرف بھاگا۔ ڈورس سب سے آخر میں وہاں پہنچی۔ آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ چیزیں مسلسل ٹوٹ رہی تھیں۔
خوفناک کہا جائے یا حیران کن، کمرے کے منظر نے سب کی آنکھیں اور منہ کھول دیے۔
اس کے ہاتھ میں اسٹینڈنگ لیمپ کی موٹی وزنی سلاخ تھی۔ لیمپ کہیں دور گرا ہوا تھا۔ لان کی طرف بنے بہت سے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ کمرے کے وسط میں کبھی خوب صورت رہا فانوس بھدا ہو چکا تھا اور ٹوٹا پھوٹا جھول رہا تھا۔ کرسٹل کی سب چھوٹی بڑی، نفیس اشیا ٹوٹ چکی تھیں یا بکھری ہوئی تھیں۔ وال کلاک اور بیڈ کے عین سامنے لگی اس کی اور پاپا کی تصویر زمین بوس ہو چکی تھی۔
یہ ڈورس کا کمرہ تھا جو پانچ منٹ پہلے تک آراستہ و پیراستہ تھا۔
یہ منال تھی۔ ایک ہی وقت میں اس نے بہت سوں سے بدلہ لے لیا تھا، احمد، احد، نادیہ، ڈورس اور

سکندر راحمد سے۔

"تم پاگل ہو گئی ہو؟" اسد نے لپک کر اسے بری طرح سے جھنجھوڑا۔ جو ابھی بھی بری طرح سے چیزیں توڑنے میں مصروف تھی۔

"ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں۔" اس نے پاگلوں کی طرح کہا۔

صوفیہ نے سکندر راور احد کو اشارہ کیا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ اور وہ تینوں چلے گئے۔ البتہ ڈورس دروازے میں چپ چاپ کھڑی تھی، کمرے پر اس نے بس ایک نظر ڈالی تھی، اب وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

اسد کے بازو کو اس نے بری طرح سے جھٹکا اور چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ "جو میرے پاس نہیں ہو گا، وہ تمہارے پاس بھی نہیں رہے گا۔"

"تم نے ٹھیک نہیں کیا... اپنے ساتھ... تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ وہ بھی بہت زیادہ" ڈورس نے بہت اطمینان سے کہا۔

☼ ☼ ☼

سارے گھر کی طرح ان دونوں کے درمیان بھی وہی خاموشی تھی، جس نے گھر کا ماحول درہم برہم کر دیا تھا۔ اسے کمرے تک گھسیٹ کر لا کے، اسد لڑتا رہا تھا۔ لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ چپ ہو گیا۔ اس کی بہن اتنی پاگل ہو جائے گی، اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ ڈورس سے اس کی طرف سے معذرت کر کے آیا تھا۔ اور اب شرمندگی کی وجہ سے کمرے سے ہی باہر نہیں نکل رہا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" اسد کو کمرے سے باہر بھیج کر انہوں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔" اپنی چہیتی بیٹی کو دلاسا دینے کے بعد وہ اس کے پاس آئے ہیں۔ منال نے جل کر سوچا۔

"تم مجھے پسند نہیں کرتیں، مجھے اندازہ تھا۔ لیکن اتنا ناپسند کرتی ہو، جان کر دکھ ہوا۔ میرا قصور ہے لیکن مجھے وقت دو کہ میں تلافی کر سکوں۔"

"قصور تو اماں کا تھا۔ جنہوں نے آپ سے شادی کی۔"

"منال! مجھے معاف نہیں کر سکتیں تو کم سے کم خود کو تکلیف دینا بند کرو۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں خوش رکھ سکوں۔ تمہیں ہر چیز دے سکوں۔"

"پھر آپ نے مجھے وہ روم کیوں نہیں دیا؟"

"وہ روم اس کا ہے۔"

"اگر وہ اس کے لیے ہو سکتا ہے تو میرے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اتنے سالوں سے وہاں ہے۔ اب میری باری ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جتایا۔

"میں تمہیں ہر چیز دوں گا جو تم کہو گی۔ لیکن تم ڈورس کو تکلیف نہ دو۔ میں نے ثریا کو کبھی بیوی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی خبر بھی نہیں لی۔ میں نے غفلت دکھائی۔ برا کیا بہت برا کیا۔ اگر میں ایک بار اس کی خبر لے لیتا تو مجھے تمہارے بارے میں بھی معلوم ہو جاتا۔ میں اپنی ہر غلطی تسلیم کر چکا ہوں منال! مجھے ہر طرح سے سزا دے لو لیکن ڈورس سے کچھ نہ کہا کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کوئی بھی تکلیف میں ہو۔ اسے اپنی بہن سمجھو۔ دوستی کرو لیکن ایسا نہ کرو۔"

اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ اس کے سامنے بیٹھے ڈورس کی تکلیف کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ اس کے لیے التجا کر رہے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھے وہ اقرار کر رہے تھے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ اس سے سب کچھ چھین سکتی تھی لیکن وہ محبت نہیں جو وہ ڈورس سے کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ہی انہوں نے ڈورس کو صوفیہ کے ساتھ تفریح کے لیے بھیج دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے فی الحال دور رہیں۔ منال کے لیے انہوں نے گیسٹ روم اور گھر کی دوسری جگہ استعمال کرتے ہوئے کمرے کی تعمیر۔ کروا دی تھی۔ احد نے اتنی بڑی تعمیر ہوتے دیکھی تو اسے یقین ہو گیا کہ پاور آف

اٹارنی ہمیشہ ایک عورت کے پاس ہوتی ہے۔ خاص کر ایک بہن کے پاس ' اور سوتیلی بہن کے پاس تو سب سے زیادہ۔ ڈورس نے تو صرف اس کی زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔ اس بہن نے تو سارے گھر والوں کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ وہ اکثر اپنے فرینڈز سے پوچھتا تھا کہ اس معاملے میں وہی زیادہ خوش قسمت ہے یا ان پر بھی کچھ قسمت کی دیوی مہربان ہے۔

"میری تو بہن ہی نہیں ہے۔" "میری پیدا ہوتے ہی مرگئی۔" "میری ایک بہن تھی' وہ مام کے ساتھ آسٹریلیا رہتی ہے۔" "میری دماغی طور پر مفلوج ہے۔" جواب میں وہ کہتے۔

اور میری دماغی اور جسمانی دونوں طرح سے مجھے مفلوج کررہی ہے۔" یعنی وہی سب سے زیادہ لکی نکلا ... تالیاں....

سکندر احمد اس سے پوچھ پوچھ کر سب کام کروا رہے تھے۔ اسے کیٹلاگ دکھائی گئیں کہ اسے اپنا کمرہ کیسا چاہیے۔ اسد بھی اس سے ناراض تھا تو اسے اپنے دماغ سے ہی کام لینا پڑ رہا تھا۔ اسے ان سب چیزوں کی بالکل معلومات نہیں تھی۔ لیکن اب اس نے پنگا لیا تھا تو بھگتنا ہی تھا۔ ان معاملات میں وہ کم و بیش اماں جیسی تھی۔ انہیں ایک چیز چاہیے تھی' کسی کی واپسی اور ان کی محبت۔ اسے بھی ایک ہی چیز چاہیے تھی مگر بہت پہلے۔

پندرہ دن بعد وہ اور صوفیہ واپس آگئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنا رخ بدل لیا کرتی تھی۔ اگر ڈورس ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہوتی تھی تو وہ واپس پلٹ جاتی تھی۔ بعد میں اپنے کمرے میں کھانا کھالیتی تھی۔ اگر ڈورس اسے بیٹھا دیکھ لیتی تھی تو وہ بھی یہی کرتی تھی۔ سکندر' صوفیہ نے دونوں کو ہی آواز دے کر کھانے کے لیے روکنا چھوڑ دیا تھا۔

ڈورس نے اپنا کمرہ پھر سے سیٹ کرلیا تھا اور اس کے لیے اسے کسی انٹیریئر ڈیزائنر کی مدد نہیں لینی پڑی تھی۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں تھی' سلیقہ مند بھی تھی۔ وہ کسی بھی طرح سے ڈورس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ ان میں ایک ہی چیز مشترک تھی کہ وہ ایک باپ کی بیٹیاں تھیں....

اکثر وہ سوچتی' صوفیہ آنٹی میں کتنا تحمل ہے بالکل اماں کی طرح۔ انہوں نے کبھی اس کے لیے ماتھے پر شکن نہیں ڈالی تھی۔ کبھی خفا ہو کر یا ناگواری سے بات نہیں کی تھی۔ احد کو اسد کو ڈانٹ دیتی تھیں مگر اس کے ساتھ ہمیشہ نرمی سے پیش آتی تھیں۔ اسے ان سے انسیت ہونے لگی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کچن میں مدد کروادیا کرتی تھی۔ ان سے ہلکی پھلکی بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ وہ جیسے جیسے ان سے قریب ہو رہی تھی' یہ جان رہی تھی کہ پاپا نے ان سے شادی کیوں کی۔ وہ ان سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں۔

"بہت خوب صورت..." اس کا کمرہ سب سے پہلے انہوں نے ہی دیکھا۔

کمرہ انٹیریئر ڈیزائنر نے سجایا تھا لیکن ہر چیز میں اس کی پسند شامل تھی۔ گو اسے ایسا کوئی تجربہ تھا نہ کوئی خاص معلومات لیکن کیٹلاگ سامنے تھیں اور بڑبڑ کرتے ڈیزائنر۔ تو کچھ نہ کچھ اچھا ہو ہی گیا۔

اسے ساتھ لے جاکر انہوں نے شوروم سے کار بھی لے دی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ کمرے کی طرح وہ ڈورس کی کار بھی توڑے اور اسے تکلیف دے۔ احد نے سنا تو اسے معلوم ہوا کہ "ہارٹ اٹیک" ہونا کسے کہتے ہیں۔ آسمانی بجلی کیسے گرتی ہے۔ کنپٹی پر پسٹل سے فائر ہو تو موت کتنی دیر میں واقع ہو جاتی ہے....

ایک عذاب پہلے سے ہی اس گھر میں موجود تھا تو ایک اور عذاب کا پاکستان سے لانا کیا ضروری تھا؟

"کیا آپ کو میں نظر نہیں آتا؟" وہ پاپا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"آتو رہے ہو نظر... تم نے پھٹی پرانی گھٹیا سی جینز پر بلیو شرٹ پہنی ہوئی ہے۔ تمہارے بالوں پر گوند ٹائپ کی کوئی چیز چپکی ہوئی ہے۔"

"یہ سب نظر آرہا ہے لیکن بیٹے کے دل کا حال نہیں دکھائی دے رہا۔ ساری دنیا کی اچھی کاروں پر آپ

کی بیٹیوں کا حق ہے۔ ساری دنیا کی محرومی پر اس بیٹے "احد" کا حق ہے۔ آپ رات کو چین سے سو کیسے جاتے ہیں؟"

"جیسے تم چھپ چھپ کر سگریٹ پی کر چین سے سو جاتے ہو۔"

وہ گڑبڑا گیا۔ "میں کوئی اسموکنگ وغیرہ نہیں کرتا۔ اوہ! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں؟ اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ میں اسموکنگ کرتا ہوں اس لیے میں ان آسائشوں سے محروم ہوں؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تم خود کماؤ اور مزے سے اڑاؤ۔"

"یہ سبق آپ اپنی بیٹیوں کو کیوں نہیں دیتے؟"

"جاتے ہوئے کمرے کی لائٹ بند کرتے جانا۔ گڈ نائٹ۔" ہاتھ میں پکڑی کتاب سائیڈ میز پر رکھ کر وہ لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

"پاپا؟ پاپا؟"

جواب میں وہ خراٹے لینے لگے۔ "یہ ڈراما جو آپ لگا رہے ہیں نا' آپ کو بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔"

"پھر میں آج سے ہی بچت شروع کر دیتا ہوں۔ کل سے پاکٹ منی بند۔" نیند میں ڈوبی آواز میں وہ بڑبڑائے۔

وہ بھی بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ لاؤنج سے گزرا تو منال نظر آگئی۔

"سنو! وہاں پاکستان میں تو تم نے پلاسٹک کی سائیکل بھی نہیں چلائی ہوگی' یہاں تم شوروم سے کاریں دیکھتی پھر رہی ہو۔"

"یہاں تو تم نے پلاسٹک کی سائیکلیں چلائی ہوں گی نا؟ پھر تم کیوں نہیں شوروم سے کاریں دیکھتے پھر رہے؟"

باپ بیٹی' دونوں جواب دینے میں ماہر تھے۔ اس نے اپنا موڈ اور خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی کھٹارا کار میں' غم غلط کرنے گھر سے ہی دور چلا گیا۔

اسد کا ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ لندن جا رہا تھا۔ اس کا ایک ہی خواب تھا جو پورا ہو رہا تھا۔ وہ گھر کا ایسا فرد لگتا تھا جو ہمیشہ سے اسی گھر کا ہی حصہ رہا تھا۔ سکندر احمد نے منال کو بھی تعلیمی ماہرین سے ملوایا تھا۔ انہوں نے اس کے رجحانات جانچے تھے۔ اس کے لیے جو سبجیکٹ تجویز کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک انٹیریئر ڈیزائننگ بھی تھا۔

دن میں کئی کئی بار حفصہ سے فون پر بات کرنا اس کا معمول تھا۔ وہ انہیں بتاتی تھی کہ پاپا کتنے امیر ہیں اور یہ کہ اس کے پاس اب سب کچھ ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بچپن کے داغ دھل جائیں۔ جب کبھی وہ ان کے پاس واپس جائے تو اسے پھر سے طعنے نہ سننے کو ملیں۔

☆ ☆ ☆

"ہو از شی؟" (یہ کون ہے؟) وہ کمرے سے کچن کی طرف جا رہی تھی جب اس نے پیچھے سے یہ آواز سنی۔ وہ سب ڈورس کے دوست تھے۔ پول پارٹی کے بعد اب وہ لاؤنج میں پراجیکٹر کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے قہقہے سارے گھر میں گونج رہے تھے۔

سکندر احمد بزنس ٹور پر تھے۔ صوفیہ آنٹی اپنے کمرے میں تھیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے وہ ان سب کو کافی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ ڈورس ان سب کے ساتھ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ سب ہلا گلا کر رہے تھے' مختلف کھیل کھیل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کی حرکتیں دیکھ کر تو وہ بھی ہنسنے لگی تھی۔ اس کا بھی دل چاہا کہ وہ ان کے ساتھ جا کر انجوائے کرے۔

جب وہ سب باری باری پول سے غائب ہونے لگے تو وہ سمجھی کہ وہ جا چکے ہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہ سب لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے ہیں تو وہ کبھی بھی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ کچھ اس طرح احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی کہ ان کے قریب جانے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

"اگنور ہر (نظر انداز کر دو اسے)" اس کے بعد ڈورس نے انگلش میں گالی دی اور وہ سب ہنسنے لگے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف واپس جا رہی تھی اور وہیں

رک گئی۔ گالی اور گالی کا مطلب ' وہ دونوں سمجھ گئی تھی۔ اب کچھ ڈورس کو بھی سمجھانا چاہیے تھا۔

سامنے ہی سبز آنکھوں والا لڑکا بیٹھا تھا۔ شاید اسی نے پوچھا تھا۔ کیونکہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک لڑکا احد کے گٹار کے ساتھ مصروف تھا اور ایک کچن کی سمت سے ہاتھ میں کین لیے آ رہا تھا۔

''میں بتاؤں میں کون ہوں۔۔۔؟'' اس نے ڈورس کے پیچھے اور ان سب کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ ڈورس اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھی۔ اس نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

''میں مسٹر سکندر کی دوسری بیوی کی بیٹی ہوں۔ اس کے پاپا میری ماں کو پاکستان میں چھوڑ کر یہاں بھاگ آئے تھے تاکہ ہم بھوکے مر جائیں۔''

''شٹ اپ!'' جتنی زور سے وہ چلا سکتی تھی' اس نے چلا کر کہا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

وہ سب باری باری دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی خوش گپیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اطمینان سے چلتی وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اندر سے وہ کانپتی رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ڈورس کی گالی گونج رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اس کے کمرے میں موجود تھی۔

''تم نے میرے فرینڈز کے سامنے پاپا کی بے عزتی کی۔ تم چاہتی ہو میں تمہیں پاپا کی بیٹی کی حیثیت سے لوگوں سے متعارف کرواؤں؟ جبکہ پاپا کی صرف ایک بیٹی ہے۔۔۔ ''ڈورس''۔۔۔

ہتک سے منال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی' صرف وہی ان کی بیٹی تھی۔ چیزوں کے مل جانے سے دلوں میں گھر نہیں مل جاتے۔

''آج تم یہاں ہو' کل نہیں ہو گی۔''

''تم مجھے یہاں سے نکالو گی؟''

''بالکل نہیں' تم خود یہ گھر چھوڑ کر جاؤ گی۔'' کہہ کر وہ چلی گئی۔

وہ یہ بات کہہ سکتی تھی۔ وہ پاپا کی لاڈلی تھی۔ ان دونوں کی محبت مثالی تھی۔ اکثر انہیں ڈورس ہی آفس سے پک کرتی تھی۔ اگر وہ گھر میں ہوتی تھی تو لاؤنج میں بیٹھ کر ان کا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ دونوں گھر آتے ہی ایک دوسرے کا پوچھتے تھے۔ پاپا کو گھر آتے ہی ڈورس دیکھنے کو ملنی چاہیے تھی بس۔ دونوں ڈنر اور لنچ کے لیے اکثر گھر سے باہر جاتے رہتے تھے۔ وہ پاپا کے ساتھ بزنس پارٹیز میں جاتی تھی۔ سکندر احمد کے ایک لیدر برانڈ کا نام ''ڈورس'' تھا۔

''ڈورس۔۔۔'' اس میں ان کی جان تھی۔

اس نے ہمیشہ پاپا کے لوٹ آنے کے خواب دیکھے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بچے بھی ہوں گے' یہ وہ کیسے سوچ سکتی تھی۔ ان کی ایک بیٹی اور ہو گی اور اس بیٹی پر وہ جان دیتے ہوں گے۔ یہ بدنما حقیقت' کسی بد صورت خواب میں بھی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن یہ سچ تھا کہ وہ اس دنیا میں کسی اور کے ناز نخرے اٹھانے میں مصروف تھے اور وہ ان کے لیے رونے میں۔ کیسا لگتا ہے' جب ایک ہی رشتے کے ساتھ دو لوگ دو مختلف زندگیاں گزاریں۔

ماضی عذاب لگتا ہے۔۔۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کے پہلے دن سے پہلے تک وہ ڈرائیونگ سیکھ چکی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کار تو آ گئی تھی' اس میں اعتماد نہیں آیا تھا۔ اس کا باپ امیر تھا وہ بھی امیر ہو گئی تھی' لیکن دل سے ابھی بھی وہ وہی غریب' بے چاری سی لڑکی تھی جو لنڈے سے سوئیٹر اور سیل سے جوتے لے کر پہنتی تھی۔ جو ہزار پندرہ سو لے کر عید کی شاپنگ کے لیے جاتی تھی اور سارے بازار میں سستی چیزیں ڈھونڈتی صبح سے شام کر دیتی تھی۔ وہ وہی لڑکی تھی جس کے بیگ میں سے کبھی پچاس ساٹھ روپے اور تین چار سکوں سے زیادہ پیسے نہیں نکلے تھے۔ جس نے ساتویں کلاس میں دس روپے ہفتے کی کمیٹی ڈالی تھی تاکہ سال ختم ہونے پر جب کمیٹی اس کے ہاتھ میں

آئے تو وہ آٹھویں کلاس میں وہ بیگ لے سکے جو اس کی کلاس فیلو زوہا کے پاس تھا۔

پھر اس گھر میں آ کر وہ تنہا ہو گئی تھی۔ وہاں ماموں کا گھر بھرا پرا تھا۔ دس پندرہ دن میں خالہ اور ان کے بچے آ جاتے تھے۔ حفصہ اور وہ صبح شام ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی تھیں۔ میلاد میں جانا' اتوار بازار سے ہفتے بھر کی سبزی وغیرہ لانا۔ محلے کی سہیلیوں کے گھر آنا جانا۔ اور نہیں تو احمد کی بائیک پر بیٹھ کر چاٹ کھانے چلے جانا۔

اس کے پاس ایک اسد تھا اور وہ بھی لندن چلا گیا تھا۔ وہ روز ماموں وغیرہ سے بات کرتی تھی لیکن پھر بھی تنہائی اسے گھیرے رکھتی تھی۔ وہ پاپا سے لڑتی' ڈورس کا جینا حرام کیے رکھتی تو اس کی اداسی اور بڑھ جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہی۔ اسے احساس تھا کہ اس طرح وہ انہیں نہیں' خود کو تکلیف دے رہی ہے۔ لیکن زندگی اسے اتنی منتشر سی ملی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اکٹھی نہیں کر سکی۔ اس کے دل میں اتنے زخم تھے کہ ان زخموں کا بدلہ وہ ہر اس انسان سے لینے لگی جو اس کے سامنے آنے لگا۔

ڈورس..... وہ اسے بہت بری لگتی تھی۔ لیکن وہ متاثر بھی اسی سے تھی۔

ڈورس ٹھیک کہتی ہے کہ وہ اسے کاپی کرتی ہے لیکن وہ چاہ کر بھی اسے کاپی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اکیلی ہی اتنی خوب صورت تھی کہ اس جیسی لاکھوں مل کر بھی اس کی خوب صورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کا بیٹھنا' اٹھنا' بات کرنا' چلنا' رکنا' غصہ کرنا تک' اسٹائلش تھا۔ وہ فیشن کے ہر ٹرینڈ کو سیٹ کرتی تھی۔ شروع میں اسے لگتا تھا کہ وہاں رہنے والی ہر لڑکی ڈورس جیسی ہو گی' لیکن جب وہ گھر سے باہر جانے لگی تو اسے احساس ہوا کہ ہر لڑکی ڈورس جیسی نہیں ہے۔

وہ دن میں دس بار بھی کار لے کر نکلتی تھی تو ہارن پر دس سیکنڈ تک ہاتھ رکھنا نہیں بھولتی تھی۔ کار کے ٹائر چرچرا کر جھٹکے سے اسٹارٹ کرتی' دنیا کو اپنے جوتے کی نوک سے مسلتی تھی۔ وہ گھر میں ہوتی یا گھر سے باہر جاتی' خبر دیتی تھی کہ "ڈورس" آ چکی ہے "ڈورس" جا رہی ہے۔

صوفیہ کے ساتھ وہ کئی بار مارکیٹ گئی تھی۔ شاپنگ بھی کی تھی۔ وہ جو چاہے لے سکتی تھی۔ لیکن کیا.....؟ پاکستان میں وہ سوٹ لے کر' اس پر لیس لگوا کر پہن لیا کرتی تھی۔ بہت ہوا تو کبھی ریڈی میڈ سوٹ لے لیا۔ پاکستان سے آتے ہوئے بھی اس نے کوئی خریداری نہیں کی تھی۔ صوفیہ آنٹی اسے جو جو کچھ لے کر دے رہی تھیں' وہ وہی کچھ لے رہی تھی۔ اسے ان کپڑوں کی کوئی سمجھ ہی نہیں تھی۔ گھر واپس آ کر جب وہ ان ڈریسز کو چیک کرتی تو اکثر تو سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ فلاں ٹاپ کا سامنے کا حصہ کون سا ہے اور پیچھے والا کون سا۔ کچھ جوتے اس نے صوفیہ آنٹی کے کہنے پر لے تو لیے تھے لیکن جب انہیں کمرے میں پہن کر دیکھا تو اسے دنیا ہلتی ہوئی نظر آئی۔ اس سے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ صوفیہ آنٹی نے اسے شاید ڈورس کے معیار کی شاپنگ کروا دی تھی۔

یونیورسٹی کے پہلے دن سکندر احمد اسے چھوڑنے آئے تھے۔ انہوں نے اسے پھول اور گفٹس بھی دیے تھے۔ جو اس نے لاتعلقی سے ایک طرف رکھ دیے تھے۔ اس کے لیے یہ سب دکھاوے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ روز ان کے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس لیے ان سے اچھی طرح سے میٹرو بس اور ٹرام کا پوچھ لیا تھا۔ ایڈمیشن وغیرہ کے لیے وہ صوفیہ آنٹی کے ساتھ پہلے بھی آ چکی تھی۔ یونیورسٹی بھی گھوم چکی تھی' لیکن آج وہ بالکل اکیلی تھی۔ کافی دیر تک ایک ہی جگہ پر کھڑی وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ یہ پاکستان کا اس کا اسلامیہ کالج نہیں تھا' جہاں ہر طرف سفید یونیفارم میں ملبوس اس جیسی لڑکیاں چلتی پھرتی نظر آتی رہتیں۔ وہ ایتھنز کی یونیورسٹی تھی۔ جہاں وہ کسی کو نہیں جانتی تھی۔ کسی کو اسے جاننے میں دلچسپی نہیں تھی۔

چار و ناچار وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانے لگی۔ راستے میں کچھ لڑکے لڑکیوں نے اسے ہائے کہا تو

وہ ہونقوں کی طرح انہیں دیکھنے لگی کہ وہ تو انہیں جانتی بھی نہیں تو وہ کیوں اسے "ہائے" کہہ رہے ہیں۔

تین چار اور "ہائے" وصول کرتی وہ اپنی کلاس میں آکر بیٹھ گئی۔ وہاں سب پہلے سے ہی گروپس میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ اس کی قسمت اچھی تھی' سب سے آخر میں اس جیسے کپکپاتی ٹانگوں' دھڑکتے دل' والوں کے لیے سیٹ خالی تھی۔ سیٹ پر بیٹھ کر وہ اپنی سانس بحال کرنے لگی۔ اتنے کلاس فیلوز کے درمیان میں سے وہ "زندہ' سلامت' بے ہوش' ہوئے بغیر سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

جب سانس اور وہ خود کچھ بہتر ہوئی تو وہ کلاس کا جائزہ لینے لگی۔ سب کسی نہ کسی سے بات کررہے تھے۔ ایک وہی چپ چاپ بیٹھی ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ (گھور رہی تھی)

اگر وہ ہر لڑکی سے اپنا موازنہ کرنے میں مصروف نہ ہوتی تو اپنی کلاس ضرورت سے زیادہ انجوائے کرلیتی۔ وہ سب کو نوٹ کرنے' ان کا جائزہ لینے میں حد سے زیادہ مصروف رہی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھے ایک لڑکے نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ گھبرا گئی۔ پاکستان میں کوئی بھی لڑکا ایسے کسی بھی لڑکی کو مخاطب کر کے بات نہیں کرنے لگتا۔ اسکول سے کالج تک وہ لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑھی تھی' تو اسے 'بوائز کلاس فیلوز کی عادت نہیں تھی۔

"تم کہاں سے ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"پاکستان سے۔"

"آر یو اوکے؟"

وہ اس کی شکل دیکھنے لگی کہ اس نے یہ کیوں پوچھا۔ شانے اچکا کر وہ خاموش ہو گیا اور وہ نظریں چرا کر رہ گئی۔ اعتماد تو صفر ہو ہی رہا تھا' بات کرنے کا سلیقہ بھی کمزور پڑتا جا رہا تھا۔

ساری کلاسز لینے کے بعد وہ صبح کی نسبت اچھا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی دو لڑکیوں سے ہلکی پھلکی دوستی بھی ہو چکی تھی۔ بس اسٹاپ تک آتے ہوئے اس نے راستے میں آنے والی فوڈ شاپ پر رک کر اپنے لیے آئس کریم لی اور کھانے لگی۔ دن روشن اور نکھرا نکھرا تھا۔ اسے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ یہ اس کی زندگی کا بہترین دن تھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن بہت کچھ تھا۔ اس کے ذہن سے ڈورس' سکندر احمد حتیٰ کہ پاکستان بھی محو ہو چکا تھا۔ رک رک کر اس نے کچھ **سیلفیاں** لیں اور **حفصہ** کو بھیج دیں۔ پھر بس کے بجائے وہ ٹرام میں بیٹھ گئی کہ صوفیہ کا فون آگیا۔

"کہاں ہو بیٹا؟"

"آرہی ہوں آنٹی۔" اسے ان کا فکر کرنا اچھا لگا۔

"مجھے ڈر تھا کہ تم کھو نہ جاؤ۔ تم گھبرا بھی جلدی جاتی ہو نا۔"

وہ گھر آئی تو انہوں نے فکر مندی سے کہا۔ وہ ہنسنے لگی۔ "آج نہیں کھوئی تو کل کھو جاؤں گی۔"

"کھو جانا تو آسانی سے واپس مل بھی جانا۔" اس کے گال تھپک کر انہوں نے محبت سے کہا۔

اسے صوفیہ آنٹی اچھی لگتی تھیں۔ کچن کے ساتھ ساتھ وہ لان کی دیکھ بھال میں بھی ان کی مدد کروا دیا کرتی تھی۔ ان کے گھر کے سبزے پر ہزار قسموں کے پھول پودے کھلے تھے' جن کے نام کیا شکلوں تک سے وہ واقف نہیں تھی۔ وہ تو گلاب وغیرہ کو ہی جانتی تھی۔ اس لیے اس نے اسی کا پودا لا کر وہاں لگا دیا تھا۔ اسے سرخ گلاب اچھا لگتا تھا۔ اسے لگانے کے لیے تھوڑی زیادہ محنت کرنی پڑی۔ لیکن وہ جیسے تیسے پھلنے پھولنے لگا تھا۔

جس دن اس پر پہلا پھول آیا اس دن اسے معلوم ہوا کہ باغ کے مالی کی جان اس کے جسم کی بجائے' اس کے لگائے پھول' پودوں' درختوں' میں کیوں ہوتی ہے۔ چھوٹا سا مہکتا' پھول اسے کسی بڑی کامیابی کی طرح لگ رہا تھا۔ جسے توڑے بغیر وہ سبزے پر بیٹھی' پھول پر جھکی اس کی خوشبو سونگھ رہی تھی کہ ایک ہاتھ آگے بڑھا اور بے دردی سے اسے توڑ کر پھینک دیا۔

یہ ڈورس تھی۔ اس نے پھول پر ہی بس نہیں کیا تھا' چھوٹا سا پودا بھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔

"اب انجوائے کرو۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے کر اس نے آنکھ سے پھول کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں معلوم ہے تم نے کیا کیا ہے؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"بالکل! تمہیں اپنے یہ فضول شوق کہیں اور جا کر پورے کرنے چاہئیں۔"

"تمہیں لگتا ہے کہ ایسے تم مجھے تکلیف پہنچا سکتی ہو؟" وہ استہزائیہ ہنس دی جبکہ دل تو اس کا چاہ رہا تھا کہ وزنی گملا اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

"میں دوں تو اتنی معمولی تکلیفیں نہیں دیتی۔" کہہ کر وہ چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

چھٹیوں پر ڈورس مراکش چلی گئی تھی۔ تین چار دن بعد اسے لوٹ آنا تھا۔ اس کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں پھر بھی سکندر احمد نے اس سے بھی پوچھا کہ وہ کہیں جانا چاہتی ہے تو اس نے انکار کر دیا۔ ایک تو اس کی فرینڈز نہیں تھیں' دوسرا اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اگر اسے جانا ہے تو کہاں جانا ہے۔ انہوں نے اسے صوفیہ کے ساتھ بھیجنے کی بات بھی کی لیکن وہ نہیں مانی۔

اس کے اور سکندر احمد کے درمیان معاملات ابھی بھی پہلے دن جیسے ہی تھے۔ فاصلہ وہیں کا وہیں تھا' جہاں سے شروع ہوا تھا۔ وہ تو اس کے پاس آتے' حال چال پوچھتے لیکن وہ ان کے پاس کبھی نہیں جاتی تھی۔ وہ انہیں دیکھ لیتی تھی تو اپنا رخ بدل لیتی تھی۔ جہاں وہ بیٹھے ہوتے تھے' وہاں سے چلی جاتی تھی۔

یونیورسٹی کے پہلے دن کے بعد وہ اس کے پاس آئے اور اس کی کلاسز کا احوال جاننا چاہا تو اس نے چند جملے کہہ کر اپنا منہ بند کر لیا۔ اس کے رویئے کی سرد مہری' ان پر بہت اچھی طرح سے واضح تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا رشتہ کسی معاہدے کی طرح چل رہا ہے۔ اس میں گرمجوشی نہیں ہے۔ وہ منال سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ منال اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ بھی بہت زیادہ غلط نہیں

ہیں۔ وہ منال کو وقت دے رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ منال بھی ڈورس کی طرح ان کے بہت قریب آجائے گی۔ ماں ہو یا باپ' بیٹیاں دونوں سے زیادہ وقت تک دور نہیں رہ سکتیں۔

اسد اور انس تو پہلے ہی گھر سے دور تھے' اب جب ڈورس بھی چلی گئی تو اسے احساس ہوا کہ گھر میں رہنے والے لوگوں سے ہم کتنا ہی لاتعلق کیوں نہ رہیں' وہ بہر حال ہماری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ احد ویسے ہی زیادہ وقت گھر سے غائب رہتا تھا۔ لیکن جو سناٹا ڈورس کے جانے سے ہوا۔ وہ ان تین لوگوں کی غیر موجودگی سے بھی نہیں ہوا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اپنا بھی کام کر آؤں۔ ڈورس کی واپسی تک آجاؤں گا۔ اس طرح تو گھر میں دل ہی نہیں لگتا۔"

وہ اپنے لیے کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ جب اس نے انہیں کہتے ہوئے سنا۔ ڈورس کے جانے کے بعد ان کے معمولات بھی بدل جاتے تھے۔ جاگنگ' چیس' بیڈمنٹن' سائیکلنگ سب بند ہو جاتا تھا۔ کھانا کھا کر وہ جلدی سو جاتے تھے۔

سکندر احمد کی باتیں سن کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دکھی ہو گئی۔ اگر وہ اور ڈورس ایک ساتھ پلی بڑھی ہوتیں تو وہ ایسا محسوس نہ کرتی۔

سکندر احمد' ڈورس کو بری طرح سے مس کر رہے تھے بلکہ بات بات پر یاد کرتے رہتے تھے۔ اور وہ بھی بات بات پر یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ اور ڈورس کبھی برابر نہیں ہو سکیں گی۔ وہ بھی چلے گئے تو وہ دونوں ہی گھر میں اکیلی رہ گئیں۔ وہ صوفیہ آنٹی کے اور قریب آ گئی۔ دونوں فارغ وقت میں خوب گپیں لگاتیں۔

"ڈورس سے ملنے کوئی آیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ گھر کے کسی بھی فرد سے انہیں ملوا دیا جائے۔"

وہ یونیورسٹی سے آئی تو میڈ نے اس سے آکر کہا۔

"آنٹی کہاں ہیں؟"
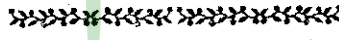
"وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ آفس کے بعد مارکیٹ جائیں گی۔"

"ان سے کہہ دو گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"وہ دو گھنٹے سے ویٹ کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں ملنا بہت ضروری ہے۔"

"کرنے دو پھر ویٹ....." اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ واپس ڈرائنگ روم کی طرف پلٹ گئی۔

"ہائے...." وہ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ عجلت میں اس نے اپنا تعارف کروایا اور ڈورس کا پوچھنے لگا۔

"کافی دونوں سے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ہو نہیں رہا۔ کہاں ہیں وہ؟" وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔

"وہ مر چکی ہے...." اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"واٹ" (کیا)....؟" حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

"یس! ہم سب کے لیے وہ مر چکی ہے۔ پاپا نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"

پھر وہ کافی دیر تک کیری کے پاس بیٹھی اسے ڈورس کے مرنے اور گھر سے نکالے جانے کی تفصیل سناتی رہی۔

☆ ☆ ☆

ایک دن وہ یونیورسٹی سے واپس گھر کی طرف آرہی تھی کہ اسے راستے میں احد ملا۔ وہ بیس بائیس لڑکوں کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ کے باہر کھڑا تھا۔ وہ تو اسے پہچانے بغیر اس کے قریب سے گزر رہی تھی لیکن اس نے اسے روک لیا۔

"مس منال! آپ کے پاس کچھ ایکسٹرا پیسے تو ہوں گے ہی۔ آخر کو ڈورس کے بعد گھر کا امیر ترین انسان آپ ہی ہیں۔" اس کے لہجے میں طنز کا عنصر کم تھا تو منال نے سر ہلا دیا۔ "ہاں' ہیں۔ کیوں؟"

"مجھے ادھار چاہیے...."

اپنی ساری انا کو بلائے طاق رکھ کر وہ اس سے پیسے ادھار مانگ رہا تھا' تو اس نے بھی بیگ میں سے پاؤچ نکال لیا۔ "کتنے پیسے؟" احد نے اس کے ہاتھ سے

یاؤچ ہی اچک لیا اور اس کے ہاتھ میں بس کا کرایہ دے کر باقی پیسے اپنے پاس رکھ لیے۔ منال کا منہ بن گیا۔

"یہ ادھار پیسے کب واپس کروگے؟"

"کون سے پیسے؟ کب دیے مجھے؟ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟" اپنے دوستوں کی طرف جاتے جاتے ٔ رک کر وہ گردن موڑ کر اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ اسے غصہ تو آیا لیکن اب بیس بائیس لڑکوں کے گینگ کے سامنے وہ کیا لڑتی۔ چپ چاپ اپنی راہ چلنے لگی۔

"ہوازشی؟" اسے اپنے پیچھے کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔

"فرسٹ لیڈی آف آل ویمپائرز۔" (سب چڑیلوں کی سردار)

قہقہوں کا طوفان اسے اپنے پیچھے سنائی دیا۔ پہلے تو وہ غصے سے بل کھاتی رہی پھر بس میں بیٹھنے تک خود بھی ہنسنے لگی۔ اس نے گھر میں ڈورس اور احد کی لڑائیاں بھی دیکھی تھیں۔ ایک دن اس نے ڈورس کے ہاتھ باندھ کر اسے پول میں پھینک دیا تھا۔ پھر ڈورس نے رات سوتے میں اس کے بالوں میں ایلفی انڈیل دی تھی۔ اسے اپنے بال صاف کروانے پڑے تھے۔ اگلی بار اس نے ڈورس کے میک اپ میں کوئی ایسی دوا مکس کردی تھی کہ اسے الرجی ہوگئی تھی۔ جواب میں ڈورس نے اس کے شیمپو میں کچھ ملا دیا تھا کہ کوئی دو ہفتے تک وہ اندھوں کی طرح اپنی آنکھوں کا علاج کرواتا رہا تھا۔

"شکرادا کرو پورے اندھے نہیں ہوگئے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہوجائیں گی آنکھیں۔" اپنے اندھے پن کی شکایت لے کر جب وہ پاپا کے پاس گیا تو انہوں نے یہ کہا۔

"پچھلے دس دن سے تو ہوئیں نہیں۔"

"ڈورس کی الرجی بھی مہینے میں ٹھیک ہوئی تھی۔"

"لیکن اس کا دماغ صدیوں میں بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ دیکھ لیجیے گا آپ سب۔ ایک دن یہ لڑکی ہم سب کو ماردے گی۔"

"دیکھ لینا تم۔۔۔ ہم سب میں وہ تمہیں سب سے پہلے ختم کرے گی۔" پاپا نے قہقہہ لگایا۔

ڈورس کا ذکر کرتے ہی پاپا کھل اٹھتے تھے۔ جب وہ واپس آئی تو گھر بھی کھل اٹھا۔ ہنگامے جاگ اٹھے۔ لان سے کچن تک ہر چیز میں بہار آگئی۔ باپ بیٹی کی باتیں شروع ہوتیں تو رات دو دو بجے تک دونوں لاؤنج میں بیٹھے نظر آتے۔ اس کے آتے ہی کار کا ہارن بجنے لگا اور ٹائر چرچرانے لگے۔

منال پر نظر پڑتے ہی وہ ناگواری سے منہ پھیر لیتی۔ منال کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اصل ناگواری ڈورس کو کب ہونے والی تھی۔

"کیری تم سے ملا تھا ناں؟" دو دن بعد ہی ڈورس اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اطمینان سے مگ ہاتھ میں پکڑے لان میں کھڑی تھی۔

"کون کیری۔۔۔؟" اب وہ مسکرا سکتی تھی۔

"وہی کیری جسے تم میرے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتاتی رہی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ ڈر گز اور روڈ وائلنس کی جھوٹی کہانیاں سنا کر تم مجھے ملنے والا کنٹریکٹ کینسل کرواسکتی ہو۔"

"لیکن میرا نہیں خیال کہ یہ سن کر کہ تم نے مجھے جان سے ماردینے کی کوشش کی تھی ٔ وہ تمہیں سائن کرے گا۔ اگر میں تمہاری بہن نہ ہوتی تو تم اس وقت جیل میں ہوتیں۔ تمہیں پاپا نے گھر سے نکال دیا ہے۔ پاپا تم سے سخت ناراض ہیں۔ تمہارے دونوں بھائی تمہیں سپورٹ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تم سائیکو ہو۔۔۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کو اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھنے کی بیماری میں مبتلا ہو۔۔۔ کیا ابھی بھی وہ تمہیں سائن کررہا ہے۔۔۔ کچھ دن پہلے میں نے نیوز پیپر میں ایک نیوز پڑھی تھی کہ ایک سپر ماڈل کو ٔ ملازمہ پر تشدد کرنے پر جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس کے سب کنٹریکٹ بھی کینسل ہوگئے۔"

ڈورس اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ "تم اور تمہاری یہ تھرڈ کلاس پلاننگ ٔ ہونہہ۔"

"انتظار کرلو ٔ جلد ہی نتیجہ سامنے آجائے گا۔"

دو دن بعد نتیجہ سامنے آگیا تھا۔ وہ یونیورسٹی جانے

کے لیے تیار ہو رہی تھی جب اسے اپنے پیچھے کھڑی ڈورس سامنے شیشے میں دکھائی دی۔

"یعنی کنٹریکٹ کینسل ہو گیا؟" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے اندازہ لگانے میں وقت نہیں لگا۔

"ہاں" اس نے سپاٹ انداز سے کہا۔

وہ مسکرادی اور چلتی ہوئی اس کے پاس آئی "تم نے کہا تھا کہ تم مجھے یہاں سے نکال باہر کروگی۔ فی الحال تو میں نے تمہیں کنٹریکٹ سے نکال باہر کیا ہے۔ تمہیں اپنے یہ شوق کہیں اور جا کر پورے کرنے چاہئیں ... ڈیئر ڈورس۔" اس نے حساب برابر کیا۔

"اور کچھ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' میں دوں تو' معمولی تکلیفیں نہیں دیتی' بس اب تم جا سکتی ہو۔"

اور وہ چلی گئی۔ کوئی اور بات نہیں کی۔

گھر میں موجود میگزینز میں اس نے ڈورس کی پیپر ماڈلنگ دیکھ لی تھی۔ ایک دو میگزین کی وہ کور گرل بھی رہی تھی۔ وہ خود فیشن ڈیزائننگ کی اسٹوڈنٹ تھی تو اپنے ڈریسز کے لیے بھی ماڈلنگ کرتی تھی۔ کیری کسی انٹرنیشنل برانڈ کا ایجنٹ تھا اور ڈورس کو سائن کرنے کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے ملنے کے بجائے وہ منال سے مل گیا۔ وہ کمپنی کا ایجنٹ تھا اور اپنے کریڈٹ پر ایسی ماڈل متعارف کروانا نہیں چاہتا تھا جس کے لائم لائٹ میں آتے ہی بریکنگ نیوز بھی آنے لگتیں۔ اسے امید تو نہیں تھی لیکن کنٹریکٹ سائن ہونے سے پہلے ہی کینسل ہو گیا۔

"تم نے کیا کہا تھا کیری سے؟" وہ پہلی بار اس سے سخت لہجے میں بات کر رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"تم ڈورس کو پریشان کیوں کرتی ہو؟"

"کیونکہ اسے پریشان دیکھ کر آپ پریشان ہو جاتے ہیں' اس لیے۔" اس کی آواز بلند ہو گئی۔ "آپ ایک بیٹی کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں اور دوسری کی خوشی کا۔ ایک سے ہمدردی رکھتے ہیں اور دوسری سے محبت کرتے ہیں۔ آپ اس کی تکلیف پر بلبلا اٹھتے ہیں۔ اس کے لیے اداس ہوتے ہیں۔ وہ گھر میں نہیں ہوتی تو آپ بھی گھر رہنا نہیں چاہتے۔ اس کی پروا کرتے ہیں' اور مجھ سے آ کر سوال کرتے ہیں؟" وہ تیز تیز بولتی جا رہی تھی۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو بیٹا! اس کے لیے یہ کنٹریکٹ بہت اہم تھا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کرنا تو اسے بھی بہت کچھ نہیں چاہیے لیکن میں اس کی شکایت لے کر آپ کے پاس نہیں آتی۔ کیونکہ جانتی ہوں کہ وہ آپ کے دل میں رہتی ہے اور میں آپ کے گھر میں۔ آپ نے مجھے اس کے جیسا روم دیا' اس کے جیسے کار' جتنے پیسے اسے دیتے ہیں اتنے ہی مجھے دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میں اسے تکلیف نہ دوں۔ مجھے ہر چیز اس کی وجہ سے دی جا رہی ہے.... وہ اتنی پیاری ہے آپ کو... اور اتنی ہی بری لگتی ہے وہ مجھے۔"

"تم ہر چیز کو غلط رنگ دے رہی ہو منال! ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"میری زندگی کا اینگل ہی غلط رہا ہے.... ماموں کو پاپا سمجھتی رہی تھی.... اب اپنے پاپا کو "ڈورس کے پاپا" سمجھتی ہوں۔ میں ہمیشہ غلط رہی ہوں' عادت ہے مجھے۔" نم آنکھیں اس نے پونچھ لیں۔

✲ ✲ ✲

آج وہ کچھ لیٹ ہو گئی تھی اسی لیے تقریباً" بھاگتے ہوئے کلاس کی طرف جا رہی تھی کہ کسی سے اس بری طرح سے ٹکرائی کہ ایک ساتھ بہت کچھ گرنے کی آواز آئی۔ یعنی اتنا کچھ گرنے کی آوازیں کہ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا' رکنا چاہا' لیکن پھر بھی رکی نہیں اور اپنی کلاس کی طرف جانے لگی۔

"مس! سو میٹر ریس کا ریکارڈ بعد میں برابر کر لینا.... پہلے ذرا پیچھے پلٹ کر یہ میڈلز سمیٹ لو...."

غصیلی آواز آئی تو اسے رکنا پڑا۔ جلدی سے پلٹ کر پیچھے آئی تو وہاں اتنا کچھ بکھرا ہوا تھا کہ وہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”یہ صرف تمہارے گھر کا سامان ہے یا پڑوسیوں کا بھی کچھ شامل ہے؟“

بے ساختہ وہ طنز کر گئی اور کتابیں اور کتابیں‘ کاغذ کاغذ اور کاغذ‘ جیکٹ‘ فائل‘ سمیٹ سمیٹ کر اسے دینے لگی۔ پین‘ ہینڈ فری‘ فون‘ بیٹری وغیرہ اس نے خود ہی سمیٹ لی تھی۔

”تمہیں شرمندہ ہونا چاہیے‘ نہ کہ طنز کرنا چاہیے۔“

وہ جانے لگی تو اس نے کہا۔ ”آئی ایم سوری! میں شرمندہ ہوں۔ اب میں جاؤں؟“

”وہ ذرا دور دیکھو! وہاں ایک کافی مگ بھی گرا نظر آ رہا ہو گا؟“

اس نے ذرا دور دیکھا‘ ایک ڈسپوزبل مگ وہاں لڑھک تو رہا تھا۔ ”یس! نظر آ رہا ہے....“

”وہ اب خالی ہو چکا ہے۔ اسے بھر کر لا دو....“

”کس سے؟ پانی سے.... دیکھو میں جلدی میں ہوں.... کلاس سے لیٹ ہو رہی ہوں۔“

”اس یونیورسٹی میں اس وقت صرف تمہاری کلاس ہی نہیں ہوتی۔ ہماری بھی ہوتی ہے۔ میں سوپر نہیں ہوں یہاں کا۔“

”میں کلاس کے بعد کافی دے دوں گی۔“

”یعنی تمہیں لگتا ہے کہ میں اتنا بے وقوف ہوں۔“

اس نے غصے سے جیب میں سے پیسے نکال کر اس کے سامنے لہرائے۔ ”تو یہ لو کافی کے پیسے! ویسے شکل سے تم ایسے کوئی بھکاری بھی نہیں لگتے۔“

دونوں ہاتھوں میں اپنے گھر کا اور کچھ پڑوسیوں کا سامان سمیٹ کر کھڑا وہ ہنس دیا ”او کے! کلاس کے بعد یہیں کافی لے کر آ جانا۔“ وہ سر ہلا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ پھر کلاس کے بعد کافی لی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

”لاؤ دو....“

وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مگ پکڑایا اور جانے لگی۔

”میرا نام عجیم ہے.... اور تمہارا؟“

”منال....“ چلتے چلتے گردن موڑ کر اس نے کہا۔

”منال! اس کافی کے لیے تھینکس.... ان فیکٹ جو کافی مگ تمہیں وہاں دکھایا تھا وہ میرے ہاتھ سے نہیں گرا تھا۔ تم نے بھی عقل سے کام نہیں لیا کہ اگر مگ میرے ہاتھ سے پھسلا ہی ہوتا تو آس پاس کافی گری ہوئی نظر آتی۔“

منال نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تو مجھ سے کیوں جھوٹ بولا؟“

اس نے قہقہہ لگایا اور شانے اچکا دیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین سکندر

عفت کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ مگر اس کی گود خالی تھی۔ جب بھی وہ کسی کی گود میں گول مٹول سا بچہ ہمکتے ہوئے دیکھتی۔ تڑپ جاتی تھی اور اللہ سے دعا کرتی تھی کہ یارب میری بھی گود ہری کر دے۔ شاید رب کو اس کی آزمائش مقصود تھی تب ہی ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی مگر مایوس نہ تھی۔ اس نے اپنی اس چار سالہ شادی شدہ زندگی میں بے شمار اتار چڑھاؤ دیکھے تھے اور ایس کی بدولت اس کے جذبۂ ایمانی میں بھی وسعت آئی تھی' ہر معاملہ میں شیر و شکر ہو کر رہنے والی عادت حاوی ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ اس کی نند اس کو کسی بھی موقع پر بے عزت کرنے سے پیچھے نہ رہی تھیں۔

"لوگوں کی تو بھابھیاں آتے ہی نوید سنا ڈالتی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے اکلوتے بھائی کی خوشی کو ترس رہے ہیں۔ نہ جانے کب یہ آرزو پوری ہوگی۔"

نازیہ آہیں بھرتیں۔ اور عفت نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن جاتی۔ یہ آنکھ مچولی نہ جانے کتنے عرصہ تک رہنے والی تھی۔

عفت کی ساس ایک نیک خاتون تھیں اور شوہر بھی محبت لٹانے والا تھا۔ طارق اکثر اسے دلاسے دیتا رہتا تھا۔ اور شازیہ بیگم بھی اس کی تشفی کرواتے نہ تھکتی تھیں۔

"دیکھو' نازیہ کی باتوں کو دل پر مت لینا۔ وہ ناسمجھ ہے۔ نہیں جانتی کہ یہ سب اللہ کے کام ہیں' یہ تمہارے اختیار یا ہمارے بس کی بات نہیں ہے' جب وہ کن کہے گا تب ہی اس گھر میں بچے کی قلقاری گونجے گی۔ یوں تمہیں کوس کر' برا بھلا کہہ کر میں اپنے رب کی مجرم نہیں بننا چاہتی ہوں۔"

نازیہ اپنی ماں کے برعکس غصیلی طبیعت کی مالک تھیں۔ ایسا نہ تھا کہ وہ کوئی ناسمجھ بچی تھیں۔ بلکہ ان کی تو اپنی بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی۔ فائزہ کی اگلے ماہ شادی بھی تھی۔ درحقیقت عفت کے ساتھ شادی کے بعد ساس اور شوہر کی محبت اور وارفتگی دیکھ کر عفت کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر نازیہ ماضی میں چلی جاتی تھیں۔

جب ان کی شادی ہوئی اور وہ بیاہ کر اگلے گھر گئیں ــــ تو کسی نے بھی ان کی یوں قدر نہ کی تھی۔ اور ایک سال تک بچہ نہ ہوا تو سب نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ جبکہ اس معاملے میں ان کی نظر میں عفت خوش قسمت تھی۔

پھر طارق کے حوالے سے بھی خواہش کہ وہ جلد از جلد پھوپھی بن جائیں اس لیے بھی تھی کہ ایک تو طارق ان سے کئی سال چھوٹا تھا۔ پھر یہ اکلوتا رشتہ تھا جہاں سے انہیں کوئی امید وابستہ تھی۔ بقول ان کے۔

"میرے کون سے سات سات بھائی ہیں جو چپ سادھ کر بیٹھ جاؤں۔ یہی ایک اکلوتا بھائی ہے میرا۔ دل تڑپتا ہے میرا۔ اور کوئی بھی سمجھتا ہی نہیں۔" لیکن بات یہیں تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا۔

آرزو کا تو واقعی کوئی مول نہیں ہوا کرتا۔ اور آرزو ان مول ہوا کرتی ہے۔ مگر بات تو یہ تھی کہ ان کی آرزو دوسروں کے لیے تکلیف دہ تھی۔ اور دکھ دینے کا موجب بن رہی تھی۔ عفت اگرچہ بہ ظاہر خاموش رہتی تھی مگر اکیلے میں نم آلود چہرہ لیے سوال کرتی تھی' اپنے رب کے سامنے سربسجود رہتی تھی کہ کاش میرا رب مجھے بھی اولاد کی نعمت سے نواز دے۔ اور پھر

ایک دن تو حد ہی ہو گئی محلے سے کوئی عورت آکر بیٹھی تو نازیہ نے اس کے سامنے عفت کی گود نہ بھرنے کا دکھڑا رونا شروع کر دیا اور پھر ان کے سامنے عفت کو بانجھ ہونے کا کہہ کر اس کے سارے زخموں کو ہرا کر دیا۔ عفت کچن سے ٹرے میں لوازمات لیے آئی تو نازیہ نے باتوں کا رخ ہی موڑ ڈالا۔ مگر اس عورت نے عفت کو ہمدردی کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا کہ اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے دے۔ اس کی اولاد بھی تو آخر عفت کی ہی اولاد ہو گی۔ عفت بھونچکی ان کا منہ دیکھتی رہ گئی اور پھر خود کو کمرے میں بند کر کے خوب روئی تھی۔

اولاد کی محرومی ہی ناکافی تھی جو وہ طارق سے بچھڑ جاتی۔ طارق اس کی اولین محبت تھے اس نے اس کی محبت میں ہی عفت کی باتیں سہی تھیں۔ اور طارق ہی اس کے نہ رہتے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی اور محبت میں شراکت بھی برداشت نہ تھی طارق آئے تو اس کا رویا چہرہ ساری کہانی سنا رہا تھا۔

"کیا ہوا، آج بیگم صاحبہ کے مزاج برہم لگ رہے ہیں اللہ خیر ہی کرے۔" طارق نے خوش دلی سے کہا تھا۔ مگر وہ تو باقاعدہ رونے لگ گئی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ پھر روتے روتے اس نے ساری داستان کہہ ڈالی۔

"میں کبھی ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا اور پھر اولاد تو رب کی ودیعت کردہ نعمت ہے، مجھے ملنی ہو گی تو تم سے ہی مل جائے گی اور اگر میرے مقدر میں نہیں تو دس شادیاں کر کے بھی نہیں ملے گی۔ تم قصوروار ہو نہ میں سزاوار ہوں۔" طارق کی باتوں سے اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی مگر نازیہ نے تو جیسے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا

ڈالا تھا۔

ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ماں اور بھائی کو دوسری شادی کے لیے اکساتی رہتی تھیں اور عفت خاموش تماشائی بنی سنتی رہتی تھی۔

"یہ حمیدہ ہے میری نند' چند دن یہیں رہے گی۔" کم عمر لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اس کی عمر کے برعکس چہرہ پختہ کار تھا۔ وہ دونوں آنکھیں مٹکا مٹکا کر اطراف کا جائزہ لے رہی تھی اور ایک گہری نگاہ عفت پر بھی ڈالی تھی اور شاید اسے اپنے سجے' سنورے سراپے کے سامنے عفت کا سراپا بے حد بھدا اور عام سا لگا تھا۔ تب ہی نخوت سے منہ پھیر گئی تھی۔

پھر اس حمیدہ نے تو جیسے عفت کے ہر کام میں کیڑے نکالنا فرض جان لیا تھا۔

"ارے عفت جی۔ یہ کیا کر رہی ہیں' شلغم..... ایسے تھوڑا ہی بنایا کرتے ہیں۔" حمیدہ کے ہاتھوں میں واقعی بے پناہ لذت تھی' کبھی کبھار عفت کے ہاتھوں سے سبزی پکڑ کر بنانے لگتی اور کبھی عین طارق کی آمد پر نت نئے میٹھے پکوان بنا لاتی۔

"یہ بیسن کا حلوہ کھا کر دیکھیں' میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" حمیدہ کا بس ہی نہ چلتا تھا کہ چمچہ..... چمچہ کر کے خود طارق کے منہ میں حلوہ ڈال دے۔

طارق اس کے انداز پر بوکھلا کر خود ہی حلوہ کھانے لگتے تھے۔ اس کی بے باک نگاہیں اور بے چین انداز انہیں بھی بے چین کرنے لگے تھے۔ وہ ایک پاک دامن مرد تھے اور کبھی بھی عفت کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مگر جب لڑکی ذات خود ہی ہر حد بندی کو ختم کرنے پر تلی تھی' تو وہ بھی اب گھبرانے لگے تھے۔ کبھی اس کے کاجل لگی آنکھوں کے ڈورے دیکھ کر گھبرا کر پلٹ کر عفت کو تلاشنے لگتے تھے اور عفت ایسی چالاکی اور مکاری نہ سمجھتی تھی۔ پھر بھی نہ جانے ایسا کیا تھا جو اب عفت کے دل میں بھی کھٹکنے لگا تھا۔ وہ بھی حواس باختہ سی رہتی تھی۔

پھر جب ایک دن حمیدہ' طارق کے لیے تحفے میں پینٹ شرٹ لائی تو شازیہ بیگم بھی چونک گئی تھیں۔

"یہ تمہاری رشتے میں لگتی نند کب واپس جائے گی۔" شازیہ بیگم نے بیٹی کو ٹوک دیا' وہ نہ جانے کتنے دنوں سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھیں اور اب مزید خاموش رہنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

"امی آپ کو بتایا تو ہے کہ دس بہن بھائی ہیں۔ حالات تنگ ہیں ان لوگوں کے' بیٹیوں کو جلد از جلد بیاہ دینے کا ارادہ ہے۔ اسی لیے اس کے رشتے کی غرض سے اسے یہاں بھیجا ہے' تاکہ آپ کوئی رشتہ ڈھونڈیں۔" نازیہ نے سبھاؤ سے بات کی۔

"ارے ہم کیا رشتہ ڈھونڈیں۔ یہ تو خود ہی رشتے تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی ہے۔ یاد رکھنا بیٹا! از خود رشتہ تلاشتی لڑکیاں ہمیشہ آلودہ ہی گردانی جاتی ہیں۔ توکل علی اللہ بڑی بات ہے۔ ملنا تو وہی ہے' جو مقدر میں رقم ہے۔ مگر خود کو ارزاں کر کے کیا ہم گناہ گار نہیں ہو جاتے۔" شازیہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔

نازیہ نے برا سا منہ بنایا۔ وہ حمیدہ کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتی تھیں' تاکہ حمیدہ ان کی بھابھی بن جائے۔ تو ضروری تھا کہ وہ ماں کو اس کے لیے ہمدردی پر اکساتیں۔ مگر شازیہ بیگم تو نازیہ کی کسی بات میں بھی نہیں آ رہی تھیں۔

"جو بھی ہے تم اب اس کو چلتا کرو۔" شازیہ بیگم نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

حمیدہ جو کمرے کی اوٹ میں کھڑی ساری بات سن رہی تھی۔ سخت برافروختہ ہو رہی تھی۔ اب کام جلد تمام کرنا تھا اور اس کے لیے نازیہ کی مدد درکار تھی۔

نہ جانے نازیہ اور حمیدہ نے عفت کی چائے میں ایسا کیا ملا دیا کہ وہ نیند میں گم ہوتی چلی گئی۔ سارا کام آج حمیدہ نے کیا۔ طارق کے من پسند کھانے بنائے اور خود شازیہ بیگم کو بھی نازیہ لے کر بہانے سے باہر چل دیں۔

"امی چلیں نا..... وہاں فائزہ کے سسرال جانا ہے۔ آپ میری بچی کے سسرال نہیں چلیں گی۔"

شازیہ بہنی کے سامنے بے بس سی ہو گئی تھیں پھر ان کو تسلی تھی کہ عفت تو گھر پر ہی ہے۔ اس لیے انہوں نے آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ جب طارق گھر آئے تو سامنے حمیدہ کو گہرے میک اپ اور چست لباس میں دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔

"عفت کہاں ہے؟" انہوں نے بے زاری سے کہا۔

"جی وہ تو سو رہی ہیں۔" حمیدہ نے سادگی سے کہا۔

"بات سنو تم انہیں بھابھی کہا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔" حمیدہ نے طارق کی بات کا مدعا سمجھ کر سخت برا منایا۔ وہ انہیں کیا درجہ دینے کی خواہاں تھی اور وہ اسے کیا نصیحت کر رہے تھے۔

"میں آپ کے لیے چائے لاؤں۔" حمیدہ بولی۔ انداز بے حد عجلت والا تھا۔

"نہیں تم رہنے دو' ویسے بھی مجھے چائے عفت کے ہاتھ کی ہی پسند ہے۔" طارق بھی بچے نہ تھے۔ سارے انداز سمجھ رہے تھے۔ "اور آپا کہاں ہیں اور امی بھی نظر نہیں آ رہیں؟" طارق نے اب گھر کی فضا میں رچی خاموشی کو دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"وہ تو جی کہیں گئی ہیں۔" حمیدہ کا دل برا ہو رہا تھا۔ اپنی اتنی نارسائی پر اس کا رونے اور ماتم کرنے کا دل کر رہا تھا۔ پھر ایک پل لگا تھا طارق کو سارا معاملہ سمجھنے میں۔ نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"دیکھو حمیدہ! تم میری چھوٹی بہنوں جیسی ہو' کسی کی باتوں میں آ کر اپنا کردار خراب نہ کرو اور کوئی نہیں تو یاد رکھنا اللہ پاک سب دیکھ اور سن رہا ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

نہ جانے طارق کے الفاظ میں ایسا کیا تھا کہ حمیدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ لمحہ بھر میں اسے اپنا آپ آلودہ لگا تھا۔ طارق کمرے میں آئے تو دیکھا کہ عفت بے سدھ سو رہی ہے اور طارق کے آواز دینے پر بھی نہیں جاگی۔ وہ گھبرا کر عفت کو اٹھائے ڈاکٹر کے پاس چل دیے تھے۔ دوسری جانب شازیہ بیگم اور نازیہ گھر آئیں تو حمیدہ بیگ تیار کیے کھڑی تھی۔

"آپا جی! میں جا رہی ہوں۔" نم آلود چہرہ کوئی انہونی سنا رہا تھا۔ نازیہ چونک گئیں۔

"ارے اس طرح اچانک؟ سب ٹھیک تو ہے؟" نازیہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"جی باجی' سب ٹھیک ہے اور اب سب ٹھیک ہی ہو گا' نہ ہی میں آپ کے ہاتھ کا مہرہ بنوں گی نہ میری عصمت پر آنچ آئے گی۔" وہ بیگ تھامے دہلیز پار کر گئی تھی۔ اسی وقت طارق اور عفت نے گھر میں قدم رکھا تھا۔

"ارے تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟" شازیہ بیگم نے عفت کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر دریافت کیا تھا۔

"امی! ہم لوگ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ مبارک ہو' آپ دادی بننے والی ہیں اور آپا آپ پھوپھو' حمیدہ اگر عفت کو نیند کی دوا نہ کھلاتی تو ہمیں معلوم ہی نہ ہوتا۔"

آخری جملہ بے حد طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ نازیہ کا سر جھک گیا تھا۔ جبکہ شازیہ بیگم نے آگے بڑھ کر بہو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوما تھا۔ رب کریم نے ان کی سن لی تھی۔

☆

مریم عزیز

ہوئے جب تم روبرو

مکمل ناول

وہ سر جھکائے ان کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے یوں خاموش رہنے پر ان کا نرم لہجہ غصیلا ہوتا جا رہا تھا۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں نوفل!" شاہد صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

"سن رہا ہوں ابو۔"

"تو کیا سمجھ میں آیا تمہارے؟" ان کا انداز امتحان لینے والا تھا۔

"یہی کہ مجھے لاہور جانا ہے۔"

"برخوردار! صرف لاہور ہی نہیں جانا' وہاں جا کر جاب بھی کرنی ہے۔ میں ممتاز سے بات کر چکا ہوں' اس نے بینک میں تمہاری جاب کا بندوبست کیا ہے۔ تمہیں خاور کے گھر رہنا ہے' میں وہاں بھی بات کر چکا ہوں۔"

"ابو' میں کسی کے گھر نہیں رہ سکتا۔" وہ احتجاجاً بولا۔

"کیوں وہاں رہنے میں تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم نے کون سا ان کے گھر رہنا ہے۔ اس نے تمہارے لیے انیکسی میں انتظام کیا ہے اور وہاں جا کر یہ مت بتانا کہ تم ماڈلنگ جیسا بے ہودہ کام بھی کرتے ہو۔"

"ابو جی' میرے شوق کو بے ہودہ تو نہیں کہیں۔" وہ قدرے ناراضی سے بولا۔

"بے ہودہ کو بے ہودہ نہ بولوں تو اور کیا بولوں۔ اچھا خاصا پڑھ لکھ کر یہ بھانڈوں والا کام کرتا تھا تمہیں۔" نوفل نے اب کچھ کہنے کے بجائے سر جھٹکنے پر اکتفا کیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اسے اٹھتا دیکھ کر وہ غصے سے بولے۔

"آپ کو جو کہنا تھا' میں نے سن لیا ہے۔"

"میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔" ان کے کہنے پر وہ طوعاً" و کرہاً" واپس بیٹھ گیا۔

"خاور کی ایک بیٹی بھی ہے۔" کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تو نوفل منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ہم نے بچپن میں تمہاری بات اس کے ساتھ طے کر دی تھی۔"

"کیا؟" وہ چیخ اٹھا تھا۔

"آہستہ بولو۔ کان کے پردے پھاڑو گے کیا۔" شاہد صاحب نے ناگواری سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا۔

"ابو! آپ کو پتا ہے' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نے جیسے انہیں ان کی بات کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"ہوش و حواس میں ہوں برخوردار! پتا ہے مجھے کیا کہہ رہا ہوں۔ ہم نے ایک بات کی تھی' کوئی رسم نہیں کی تھی۔ تمہیں وہاں بھیجنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم اس بچی سے مل لو پھر جو تمہاری مرضی ہو گی۔" نوفل کو ان کی آخری بات سے تھوڑا حوصلہ ہوا ورنہ اسے اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آرہا تھا۔

"اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ' اتنی تکلیف میں بیٹھے ہو جیسے صوفے میں کیلیں جڑی ہوں۔" اس کے باہر نکلتے ہی شاہد صاحب نے افسوس سے سرہلایا۔

کمرے میں آکر اس نے بے زاری نظر کمرے میں بکھرے سامان پر ڈالی۔ ایک تو اسے پہلے ہی انجانی جگہ پر جانے پر چڑ ہو رہی تھی اوپر سے ابو نے نیا شوشا چھوڑ دیا تھا۔

"ایک لڑکی جسے میں جانتا بھی نہیں' ابو نے اس سے میری بات طے کردی' رُبش۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ غصے سے کپڑوں کے گولے بنا کر سوٹ کیس میں پھینکنے لگا تب ہی اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اسکرین پر سائرہ کا نام دیکھ کر اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"ہیلو کیسی ہو۔"

"میں تو ٹھیک ہوں تم اپنی بتاؤ' زیادہ بزی ہو جو نہ فون کیا اور نہ ہی کوئی میسج؟"

"ہوں' بزی تو ہوں۔ تمہیں بتایا تو تھا لاہور جارہا ہوں۔ اسی کی تیاری میں بزی ہوں۔"

"اچھا جانے سے پہلے مل سکتے ہو؟" کپڑے رکھتا نوفل کا ہاتھ ایک پل کے لیے رکا تھا۔

"خیریت۔" وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"ہاں خیریت ہے' ویسے ہی کہہ رہی تھی پھر پتا نہیں کب ملاقات ہو۔" اس کی بات سن کر نوفل مسکرا دیا تھا۔

"میں ہمیشہ کے لیے نہیں جارہا۔"

"جانتی ہوں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"اچھا دیکھتا ہوں' وقت ملا تو تم سے بھی مل لوں گا۔"

"اتنا احسان کرنے کی ضرورت نہیں' نہیں ملنا تو نہ ملو۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ نوفل نے سر جھٹکا وہ ناراض ہو گئی تھی اور نوفل میں اس وقت بالکل ہمت نہیں تھی کہ اسے منا سکے۔ وہ تیزی سے سامان پیک کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

ایک تو سردی کا موسم' دوسرے آج سورج نے اپنی شکل ہی نہیں دکھائی تھی تو موسم زیادہ سرد ہو گیا تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی جھرجھری لی تھی۔ چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ چائے کا پانی رکھ کر وہ ابو کے کمرے کی طرف آئی۔ وہ حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ آہٹ پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔

"ابو میں یہ پوچھنے آئی تھی آپ ناشتے میں کیا لیں گے؟"

"جو تم کھاؤ گی۔"

"میرا تو آج پراٹھا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے' میں بھی پراٹھا کھالوں گا۔" ان کے کہنے پر وہ سرہلاتی ہوئی واپس مڑ گئی۔ واپسی پہ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں اس کا اور ابو کا ناشتا تھا۔

"انیکسی صاف کروادی تھی۔" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے شرمین سے پوچھا۔

"جی وہ تو کل ہی صاف کروادی تھی۔" وہ جواب دے کر ناشتا کرنے لگی کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولی۔

"ابو آپ کے دوست کا بیٹا کتنا عرصہ یہاں رہے گا۔"

"جب تک وہ رہنا چاہے۔"

"ابو! کیا اس کا یہاں رہنا مناسب ہو گا۔" خاور صاحب نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔
"تمہیں پسند نہیں اس کا یہاں رہنا؟"
"بات پسند کی نہیں ابو۔۔۔"
"دیکھو بیٹا۔" خاور صاحب اس کی بات کاٹ کر بولے۔ "شاہد میرا بہت اچھا دوست ہے اور اتنا دیل آف ہے کہ اس کا بیٹا کہیں اور بھی رہ سکتا تھا لیکن شاہد نے اسے خصوصی تلقین کی ہے یہاں رہنے کی اور مجھے جب اس نے اطلاع دی کہ نوفل آرہا ہے تو میں کیا کہتا اسے نہ بھیجو۔"
ان کی اتنی تفصیل پر وہ کچھ شرمندہ ہو کر بولی۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا؟"
"جانتا ہوں بیٹا، تم کیا کہنا چاہتی ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ شاہد اپنے بیٹے کو خاص مقصد سے بھیج رہا ہے۔"
اب کی بار شرمین نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"بچپن میں اس نے جو بات کی تھی۔ شاید وہ اس کو حتمی شکل دینا چاہتا ہے۔"
شرمین نے سر جھکا۔ "وہ بچپن کی بات تھی ابو! اتنے سال گزر گئے، انہوں نے کبھی رابطہ نہیں کیا، ملنے نہیں آئے اور اب اچانک اپنے بیٹے کو بھیج رہے ہیں۔ ضروری تو نہیں ان کا یہ مقصد ہو اور پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں نہ ہی ایک دوسرے کی پسند، ناپسند اور عادتوں کو جانتے ہیں۔"
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اگر ایسا ہو جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آج کے دور میں گھر بیٹھے اچھا رشتہ مل جانا اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہے ورنہ بیٹیاں ماں باپ کی دہلیز پر اچھے رشتے کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔" وہ افسردگی سے بولے تو اب کی بار شرمین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس خاموشی سے ٹرے لے کر کھڑی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"بیٹا! یہاں پہنچنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔" انہوں نے سامنے بیٹھے نوفل سے پوچھا۔
"نہیں انکل۔" اس نے بمشکل مسکرا کر جواب دیا وہ اس وقت اتنا تھکا ہوا تھا کہ دل چاہ رہا تھا فوراً" سو جائے۔
"شاہد کیسا ہے؟"
"ابو بھی ٹھیک ہیں۔ آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔"
"وعلیکم السلام۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "میں کروں گا کل اسے فون۔" کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔
"چلو میں تمہیں انیکسی دکھادوں، امید ہے تمہیں پسند آئے گی۔"
نوفل نے شکر ادا کیا کہ انکل کے انٹرویو کا سلسلہ اختتام کو پہنچا۔ انیکسی دو کمروں اور ایک کچن پر مشتمل تھی۔ صاف ستھری انیکسی دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا۔
"تم آرام کرو بیٹا پھر ملاقات ہو گی۔" ان کے جاتے ہی وہ گرنے کے انداز میں بیڈ پر گرا تھا اور کچھ دیر بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس کی آواز نامانوس آواز سے کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے آنکھ کھلنے کی وجہ پر غور کیا، کوئی دروازہ بجا رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور پھر آتے ہی وہ تیزی سے اٹھا۔ خاور انکل ٹرے لیے دروازے میں کھڑے تھے۔ وہ شرمندہ ہوا۔
"سوری انکل! میں سو گیا تھا۔"
"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرا کر بولے۔
"یہ کھانا لایا تھا۔"
"انکل آپ نے کیوں زحمت کی۔"
"زحمت کی کیا بات ہے بیٹا! تم تھکے ہوئے آئے تھے، بھوک بھی لگی ہوئی ہو گی کھانا گھر میں بنا ہوا تھا تو لے آیا۔" انہوں نے ٹرے اس کی طرف بڑھائی تو رومال اٹھاتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ گرما گرم بریانی ساتھ رائتہ اور سلاد اس نے کھڑے کھڑے چمچہ بھر کر منہ میں ڈالا۔ بریانی بہت مزے کی تھی اور

اس نے بے ساختہ اظہار بھی کر دیا۔

"بہت مزے کا کھانا ہے انکل! آپ بیٹھیں ناں۔"

اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ جب سے آئے ہیں کھڑے ہیں۔

"نہیں، تم آرام سے کھاؤ۔ ویسے تو یہاں ہر چیز موجود ہے لیکن اگر کچھ چاہیے ہو تو مارکیٹ نزدیک ہے۔" نوفل ہاتھ روک کر خاور انکل کو دیکھنے لگا یہ سب باتیں بتانے کا ان کا جو مقصد تھا وہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ "تو نوفل! بڑے میاں کا مطلب ہے' آئندہ اپنے کھانے کا بندوبست خود کر لو۔" اس نے دل میں خود کو مخاطب کیا۔

"اچھا بیٹا تم آرام کرو۔"

"آرام کیا خاک کرنا ہے۔" ان کے جانے کے بعد وہ بڑبڑایا۔ کھانے کا مزہ دوبالا ہونے کے بجائے کرکرا ہو گیا تھا۔ برتن لے کر وہ کچن میں آیا تو باقی انیکسی کی طرح کچن بھی صاف ستھرا تھا۔ اس نے سنک کے اردگرد نظر دوڑائی وہاں برتن دھونے والا صابن کہیں نہیں تھا اس نے گہرا سانس لے کر بالوں میں ہاتھ چلایا اور کیبنٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ کچن میں برتنوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سارا سامان لانے والا تھا۔

اگلے دن' ایک تو آفس میں اس کا پہلا دن تھا دوسرے وہ مارکیٹ چلا گیا تو اسے گھر پہنچنے میں زیادہ دیر ہو گئی۔ شاپرز ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ پر آہٹ ہوئی اور پھر ایک نسوانی آواز آئی۔ نوفل نے چونک کر گیٹ کو یوں دیکھا جیسے گیٹ کے پار اسے وہ چہرہ نظر آ ہی جائے گا۔

"میں نوفل' کل انیکسی میں شفٹ ہوا ہوں۔"

اس نے اپنا پورا تعارف کروایا کہ پتا نہیں وہ اسے جانتی بھی ہے یا نہیں۔ اس کے بتانے پر قدموں کی آواز سنائی دی جیسے کوئی واپس اندر چلا گیا ہو۔ وہ جی بھر کر حیران ہوا اور اب کی بار اس نے ہاتھ سے گیٹ پر دستک دی تھی۔ دوبارہ قدموں کی آواز آئی اور اب کی بار گیٹ کھل گیا۔ خاور انکل سامنے کھڑے تھے اور ان کی شکل دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نیند سے اٹھ کر آئے ہیں۔

"اسلام علیکم۔" اس نے جلدی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ کافی سنجیدگی سے بولے۔ ان کے راستہ دینے پر وہ اندر آگیا۔

"بیٹا' ایک بات کہنی تھی۔"

"جی انکل۔" وہ جاتے جاتے مڑ کر دیکھنے لگا۔

"میں ذرا جلدی سو جاتا ہوں اور گھر میں صرف میں اور میری بیٹی ہوتے ہیں اور اتنی لیٹ ہم گیٹ نہیں کھولتے۔"

نوفل جی بھر کر شرمندہ ہوا۔ "سوری انکل' آج بینک میں میرا پہلا دن تھا' وہاں سے لیٹ نکلا پھر کچن کا کچھ سامان لینا تھا۔ مارکیٹ کا مجھے پتا نہیں تھا' سواری بھی کوئی نہیں تھی میرے پاس' اس لیے دیر ہوئی آئندہ دھیان رکھوں گا۔" آخر میں وہ سنجیدگی سے بولا تو وہ سر ہلا کر اندر کی طرف مڑ گئے۔ جبکہ نوفل کی شرمندگی کی جگہ غصے نے لے لی۔

"عجیب لوگ' دس بجے سو جاتے ہیں۔" دروازہ کھولتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

"گھر نہ ہوا ہوٹل ہو گیا۔ اتنے بجے اٹھو اتنے بجے سوؤ۔ ایسے نہ کرو ویسے کرو۔" اس نے شاپرز کو میز پر پٹخا۔

"ابو نے بھی پتا نہیں مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا عجیب کنزرویٹو لوگ ہیں۔ بیٹی دروازہ نہیں کھول سکتی 'پردے کی بوبو۔" اس نے کلستے ہوئے اس کو عجیب سا نام دیا اور بازار سے لائی ہوئی بریانی پلیٹ میں نکالنے لگا۔

وہ باتھ روم سے نکلا تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔

"ہیلو۔" اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے گالیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

"ذلیل' کمینہ' خبیث جیسے نام تمہارے لیے بنے ہیں۔" نوفل نے مسکراتے ہوئے موبائل کندھے اور

سر کے درمیان اٹکایا اور دوسرے ہاتھ سے برش کرنے لگا۔

"کیا بات ہے، تجھے مجھ پر اتنا پیار کیوں آرہا ہے۔" جواباً "وہ اور بھڑکا تھا۔

"شرم تو تمہیں چھو کر بھی نہیں گزری نوفل! میں شاید تمہیں گالیاں دے رہا ہوں کان کی میل ہٹا کر سنو تو سنائی دے گا۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے سبطین مراد کہ میں ابھی ابھی نہا کر آیا ہوں۔ کان بھی صاف کیے ہیں میں نے۔ یہ الگ بات ہے مجھے گالیاں بھی پھول کی طرح لگتی ہیں۔" وہ بھی پورا ڈھیٹ تھا۔

"لعنت ہو تم پر۔" سبطین جل کر بولا۔

"مہربانی نوازش ہے جناب کی" وہ ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھ کر بیڈ کی طرف آگیا۔

"تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ تم مجھے بتا دیتے کہ تم لاہور جا رہے ہو۔ وہ تو آج میں گھر گیا تو پھوپھو نے بتایا کہ تم لاہور گئے ہو پھوپھو کے سامنے شرمندہ کروا دیا مجھے 'یہ دوستی ہے ہماری' یہ ہو تم میرے لنگوٹیے یار۔" اس کی اصطلاح پر نوفل قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"معاف کر دو یار! سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ بتانے کا ٹائم نہیں ملا۔"

"بکواس نہ کرو نوفل! سائرہ تمہاری پھوپھی لگتی ہے جسے بتا کر آئے ہو۔"

"اوہ! تو تمہیں غصہ اس بات کا ہے۔" نوفل نے او کو لمبا کھینچا۔

"نہیں، مجھے غصہ اس بات کا ہے کہ تم گئے کیوں بتائے بغیر اور میرے بغیر۔"

"یار بتایا تو ہے اچانک جاب لیٹر آگیا اور دوسرا میں غصے میں تھا ابو نے اچانک حکم دے دیا کہ ان کے دوست کے گھر ٹھہروں اور جہاں تک سائرہ کی بات ہے تو اس نے مجھے فون کیا تھا میں نے نہیں اور تمہیں آج نہیں تو کل میں فون کرنے والا تھا۔"

"رہنے دو اب میری آواز سن کر تمہیں یاد آیا کہ مجھے بتانا تھا۔" سبطین اب قدرے ناراضی سے بولا۔

"اب ناراض بیویوں کی طرح اینٹھتے ہی رہو گے یا کچھ بولو گے بھی۔ سخت نیند آرہی ہے' صبح پھر جلدی جانا ہے۔"

"جا' مرجا۔" وہ غصے سے بولا۔

"بول نا یار۔"

"میں بھی لاہور آرہا ہوں۔" آخر کار بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ نوفل کی بند ہوتی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟ مجھے وہاں جاب نہیں مل سکتی کیا' تمہیں کیا لگتا ہے لاہور والوں نے بس تمہیں جاب دینے کا ٹھیکہ لیا ہوا تھا۔" کیوں کے جواب میں وہ طنزیہ بولا۔

"اور میں رہوں گا بھی تیرے ساتھ۔" سبطین کے کہنے پر وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا' میں خود بیزار بیٹھا ہوں۔ پتا نہیں انہوں نے کتنی مشکل سے مجھے رکھا ہوا ہے۔ اب تم بوجھ بن کر آجاؤ گے تو تمہیں چھوڑ مجھے بھی نکال دیں گے۔ آگے ہی آج دیر سے آنے پر انہوں نے مجھے اتنی باتیں سنائی ہیں۔"

"یہ سب مجھے نہیں پتا' میں بس صبح آرہا ہوں۔ ایڈریس تم بھیج رہے ہو یا میں انکل سے رابطہ کروں۔"

"فٹے منہ تمہارا سبطین' بن بلائے مہمان بن رہے ہو۔"

"جو بھی سمجھ لو بس ایڈریس بھیج دو میں صبح پہنچ جاؤں گا۔" کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ جبکہ نوفل نے بے ساختہ ہاتھ کا مکا بنا کر بیڈ پر مارا۔

نوفل کی بات سن کر کچھ دیر کے لیے خاور صاحب کچھ بولے ہی نہیں' نوفل بھی نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔

"انکل وہ میرا ماموں زاد ہے اور بہت شریف لڑکا ہے اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو ابو سے فون کر کے پوچھ لیں۔"

خاور صاحب نے سنجیدہ نظر نوفل پر ڈالی۔ "میں پہلے ہی بتا چکا ہوں میرے ساتھ ایک جوان بچی کا ساتھ ہے' میں نہیں چاہتا لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع ملے۔"

اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتے نوفل بول پڑا۔ "انکل آپ کو ہم دونوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی اگر کوئی پرابلم ہوئی تو ہم اسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔" خاور صاحب نے گہرا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔" وہ کھڑے ہوگئے۔

"کب آرہا ہے تمہارا کزن؟"

"آج پہنچ جائے گا۔" نوفل بھی کھڑا ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

وہ جب بس سے اترا تو ٹھنڈ اور دھند نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑے اور پھر انہیں جیکٹ کی جیبوں میں گھسالیا۔

"یار! کتنی سردی ہے۔" اس نے بجتے دانتوں کو سختی سے ایک دوسرے پر جمایا اور بیگ اٹھا کر ڈائیوو اسٹیشن سے باہر آگیا۔

اس نے ایک رکشے والے کو روکا اور اسے نوفل کا بھیجا ہوا پتا بتایا تو اس نے سرہلا کر اسے بٹھالیا۔ سڑکوں پر کافی دیر گھومنے کے بعد سبطین نے اکتا کر پوچھا۔

"بھائی کب پہنچیں گے۔"

"بھائی صاحب کالونی کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ آگے کا رستہ تمہیں معلوم ہوگا۔ تم بتاؤ اس سڑک پر جانا ہے یا اس سڑک پر۔" رکشہ ڈرائیور کے پوچھنے پر سبطین کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

"تمہیں پتا نہیں کدھر جانا ہے۔" اتنی سردی میں پچھلے پونے گھنٹے سے وہ اسے گھما رہا تھا اور اسے ایڈریس بھی پتا نہیں تھا' یہ سن کر سبطین کا غصہ سوا نیزہ پر پہنچ گیا تھا۔

"جب تمہیں پتا نہیں تھا تو مجھے بٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟" وہ غصے سے بولا۔

"اب مجھے کیا پتا کہ تمہیں اپنے گھر کا پتا نہیں معلوم" ڈرائیور نے ہنس کر جیسے اس کا مذاق اڑایا تو سبطین کا دل چاہا مکا مار کر اس کے اگلے دانت توڑ دے ڈرائیور نے شیشے سے سبطین کا چہرہ دیکھا تو دانت فوراً اندر کر لیے۔

"یہ مارکیٹ ہے' یہاں سے پوچھتا ہوں شاید پتا چل جائے۔"

یہ کہہ کر وہ رکشہ سے اتر گیا۔

وہ مارکیٹ سے اپنا مطلوبہ سامان لے کر نکلی تو دروازے میں ہی جم کر رہ گئی۔ اس کی گاڑی کے پیچھے رکشہ اور سائیڈ پر گاڑی کھڑی تھی حالانکہ اس نے اپنی گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی تھی کہ واپس نکلنے میں آسانی ہو اس نے گہرا سانس لے کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور کار کی طرف بڑھ گئی۔ شاپرز اندر رکھ کر پہلے وہ دوسری کار کی طرف آئی اندر کوئی نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر رکشے کی طرف آئی جہاں پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ایکسکیوزمی! کیا آپ یہ رکشہ پیچھے کر سکتے ہیں' مجھے اپنی کار نکالنی ہے۔" وہ سبطین سے مخاطب ہوئی۔

"وہ رکشہ ڈرائیور اندر گیا ہے۔ آپ کی کار کون سی ہے۔" سبطین نے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ آگے جو سفید مہران ہے۔" وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتانے لگی سبطین نے اس کے اشارے کی طرف دیکھا۔

"ویسے آپ کار کو تھوڑا آگے کر کے رائٹ سائیڈ پر وہیل گھما کر ریورس کریں تو کار نکل سکتی ہے۔" فاریہ نے ایک نظر غور سے اس نوجوان کو دیکھا جو سنجیدہ لگ رہا تھا۔ سبطین کو ایک دم اپنا کام یاد آیا تو وہ موبائل نکال کر بولا۔

"کیا آپ یہ ایڈریس بتا سکتی ہیں۔" فاریہ نے پتا دیکھ کر سبطین کی شکل دیکھی' وہ یہ پتا جانتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس نے سر نفی میں ہلایا اور واپس آکر اپنی کار میں بیٹھ گئی اور بوکھلاہٹ میں اس نے کار دائیں کی جگہ بائیں میں گھما کر ریورس کی تو کار الٹی سمت میں جانے لگی اس نے جلدی سے بریک لگائی اور مڑ کر رکشے کی طرف دیکھا' سبطین کا چہرہ دیکھ کر اسے بے حد غصہ آیا تھا جو ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں ہونٹ بھینچ رہا تھا۔ اس نے گاڑی بند کی اور باہر نکل آئی۔

"کس خوشی میں آپ کو ہنسی آرہی ہے؟" وہ ایک دم اس کے سر پر پہنچ کر غصے سے پوچھنے لگی۔ سبطین پہلے تو حیران ہوا پھر اسے اس لڑکی کا انداز دیکھ کر غصہ آ گیا۔

"کیوں ہنسنے پر پابندی ہے۔" وہ بھی الٹا بولا۔

"اتنی ہی ہنسی آرہی ہے تو گاڑی یہاں سے نکال کر بتائیں۔" سامنے کھڑی لڑکی کا چیلنج کرتا انداز سبطین کو تپانے کے لیے کافی تھا۔ وہ تیزی سے رکشے سے اترا۔

"چابی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی مانگی جو بڑی بے نیازی سے فاریہ نے اسے تھما دی۔ سبطین نے دو منٹ میں کار پارکنگ سے نکال کر سڑک پر کھڑی کر دی۔ فاریہ نے دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اس سے چابی لی اور اس کا شکریہ ادا کیے بغیر گاڑی بھگا لے گئی۔ وہ رکشے والے کو دیکھ رہا تھا جو ایک دکان سے دوسری دکان میں جا رہا تھا۔ تبھی اس کا موبائل بجا۔ نوفل کی کال تھی۔

"کہاں ہو یار! کب سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"یہیں ہوں' پتا نہیں کون سے کوہ قاف میں رہ رہے ہو۔ مل ہی نہیں رہا۔" وہ تپا ہوا بولا۔

"تم ہو کہاں؟" سبطین نے سر اٹھا کر اس مارکیٹ کا نام پڑھا اور نوفل کو بتایا۔

"تم قریب ہی ہو' وہیں ٹھہرو میں آرہا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد نوفل اس کے سامنے تھا۔

"یہ قریب تھا اور تمہیں مل نہیں رہا تھا؟" رکشے والے کو فارغ کر کے اس نے بیگ اٹھایا تو نوفل نے کہا۔

"یار! یہاں کے لوگ بہت عجیب ہیں۔ احسان

فراموش اور جھوٹے‘ ابھی ایک لڑکی سے پوچھا۔ اس نے کہا یہ ایڈریس یہاں ہے ہی نہیں۔" سبطین کو اب رہ رہ کر اس لڑکی پر غصہ آرہا تھا جو نہ شکریہ ادا کر کے گئی تھی اور نہ پتا بتا کے گئی تھی۔

"چھوڑو یار اب پہنچ گئے نا۔"

"تم نے اپنے انکل سے بات کرلی نا میرے بارے میں۔" سبطین نے احتیاطاً پوچھا۔

"ہاں کرلی تھی انہیں اعتراض تو ہوا تھا پر مان گئے پھر۔"

"اعتراض کیوں تھا انہیں۔" سبطین کو آج چھوٹی چھوٹی باتیں محسوس ہو رہی تھیں۔

"یار تم پر ہی نہیں انہیں ہر بات پر اعتراض ہے۔ دیر سے کیوں آئے‘ یہاں لڑکے نہ آئیں‘ باہر لان میں ہر وقت نہیں جاسکتے‘ چھت پر کھڑے نہیں ہوسکتے۔"

"اچھا۔" سبطین نے اچھا کو لمبا کر کے کھینچا۔

"اور اس کی وجہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔" نوفل نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا اچھی نہیں ہے۔"

"مجھے کیا پتا میں نے کون سا دیکھی ہے۔"

"تو تم اتنا منہ بنا کر اس کا ذکر کیوں کر رہے ہو۔" سبطین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"عجیب ہے یار‘ اس دن میں واپس آیا تو بجائے گیٹ کھولنے کے اتنی سردی میں کھڑا کر کے اندر چلی گئی۔ زہر لگتی ہیں مجھے ایسی لڑکیاں جو فضول میں پردہ کرنے کی ایکٹنگ کرتی ہیں۔"

"کیا پتا وہ سچ میں ایسی ہو‘ ایکٹنگ نہ کرتی ہو۔"

"جو بھی ہے یار! بہرحال اس گھر میں کرفیو سسٹم ہے۔"

"چھوڑ نا یار‘ ہمیں کیا لینا دینا اس لڑکی سے۔" سبطین نے جیسے بات ختم کی تو نوفل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اب اسے کیا بتاتا اس کے ابو کیا سوچ کر بیٹھے ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر میں داخل ہوئی تو بھابھی کے ساتھ بیٹھے ان کے بھائی کو دیکھ کر اس کے منہ پر بارہ بج گئے۔

"لو فاریہ بھی آگئی۔" اسے دیکھ کر بھابھی نے کہا تو ناصر بتیسی نکال کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ منہ بنا کر اندر کی طرف بڑھنے لگی۔

"فاریہ! تمیز بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کوئی مہمان بیٹھا ہے‘ اسے سلام کر لو۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر ثمرہ بھابھی کو دیکھنے لگی۔

"کون مہمان؟" اس نے حیران ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے اردگرد دیکھا۔

"میں ناصر کی بات کر رہی ہوں۔" اپنے بھائی کو اگنور کیا جانا بھابھی کو زیادہ ہی برا لگا تھا۔

"یہ مہمان ہیں۔" فاریہ نے انگلی سے ناصر کی طرف اشارہ کیا۔

"معاف کیجیے گا بھابھی‘ ہر روز آنے والے کو مہمان نہیں کہتے۔" وہ بے نیازی سے بولی تو ثمرہ کے غصے کے مارے نتھنے پھولنا شروع ہوگئے۔

"چھوڑو ثمو‘ تم بھی کیا بحث لے کر بیٹھ گئی ہو۔" ناصر نے حالات دیکھ کر بہن کو ٹوکا۔

"تم بتاؤ فاریہ‘ کیسی ہو۔"

"آپ کے سامنے ہوں۔ اپنے پاؤں سے چل کر آئی ہوں تو ٹھیک ہی ہوں گی نا۔" کہہ کر وہ رکی نہیں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"اس کا تو ہر وقت دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا ہے۔ تم اس کی خوشامد کر کے مزید تاڑ کے جھاڑ پر چڑھا دیتے ہو۔" ثمرہ نے ناراضی سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

"تم بھی ثمو! چھوٹی چھوٹی بات پر ٹمپر لوز کر جاتی ہو۔" ناصر کے کہنے پر وہ بھڑک اٹھی اور اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتی اطلاعی گھنٹی کے بجنے پر ثمو منہ بناتی اٹھ گئی۔

"اتنی دیر لگادی‘ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔"

"سوری امی مارکیٹ میں دیر ہوگئی آپ کی دوا نہیں مل رہی تھی۔" وہ شاپر بیڈ پر رکھ کر خود بھی ان کے

قریب لیٹ گئی۔ تبھی بھابھی کی چیختی چنگھاڑتی آواز پر جہاں فاریہ نے بُرا سا منہ بنایا وہیں نصرت نے گھبرا کر دروازے کو دیکھا۔

"یہ ثمو کیوں چیخ رہی ہے۔ اس کو کیا ہوا ہے۔" نصرت نے پریشانی سے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو دیکھا۔

"پھر تم نے تو کچھ نہیں کر دیا۔"

"مجھے تو کبھی بھی پتا نہیں چلتا میں نے کچھ کیا ہے۔ یہ تو بھابھی آکر بتائیں گی کہ میں نے کیا کیا ہے۔" وہ کہہ کر منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

"فاریہ! ساتھ والے آئے ہیں۔ تمہاری بلی ان کے طوطے کھا گئی ہے۔" ان کی بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی جس پر ثمو مزید غضبناک ہو کر بولی۔

"اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔"

"تو اس میں رونے والی بھی کوئی بات نہیں اور آپ غصہ ایسے کر رہی ہیں جیسے طوطے 'بی بی' نے نہیں میں نے کھائے ہوں۔"

"بلی تو تمہاری ہے نا وہ منہ چڑھی' جب دیکھو کوئی نہ کوئی نقصان کر کے اندر آتی ہے۔"

"اور تم بچی نہیں ہو فاریہ کہ ہر وقت تمہارے تماشے لگے ہوں اتنا ان میچورلی بیہیو ہوتا ہے تمہارا' نقصان تم کرتی ہو اور برداشت ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں نے باہر سے طوطے منگوائے تھے۔ پتا ہے کتنے مہنگے تھے' وہ ہرجانہ بھی ہمیں بھرنا پڑے گا۔ اس دن اپنے بھائی کی گاڑی تم نے خراب کر دی وہ بھی نوید کو صحیح کروانی پڑی۔" بھابھی کو موقع ملا تو وہ پچھلے کھاتے بھی کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔

"آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کسی بھی چیز کی وجہ سے جہاں تک گاڑی کی بات ہے' خراب ہونے والی چیز تھی' خراب ہو گئی پھر ٹھیک بھی ہو گئی۔ بھائی کو پرابلم ہونی چاہیے تھی' انہیں تو نہیں ہوئی پھر آپ کو کیوں دکھ ہو رہا ہے۔"

"تم فاریہ۔"

"فاریہ! بہو ٹھیک کہہ رہی ہے' تم خاموش ہو جاؤ۔" بہو کو مزید منہ کھولتا دیکھ کر نصرت کو فاریہ کو ٹوکنا پڑا' ماں کو غصے میں دیکھ کر فاریہ نے مزید بحث کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"جہاں تک ان طوطوں کی بات ہے انکل خورشید سے میں خود بات کر لوں گی اگر پیسے مانگیں گے تو وہ بھی میں خود دے دوں گی' آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ کہہ کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"ناصر آیا ہوا ہے' تمہیں اتنی توفیق تو نہیں ہوئی سلام کر لو۔ اب کم از کم چائے بنانے کی زحمت کر لو۔"

"جاؤ فاریہ' چائے بنا دو۔" اس کا انکار کرنے کا موڈ دیکھ کر پھر نصرت کو ٹوکنا پڑا تو وہ ماں کا منہ دیکھ کر رہ گئی پھر منہ بناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آنٹی! آپ سمجھائیں فاریہ کو' بچی نہیں ہے جو ہر وقت ادھم مچائے رکھتی ہے۔"

"میں سمجھاؤں گی اسے۔" نصرت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی تھیں۔

نصرت بیگم کے دو ہی بچے تھے نوید اور فاریہ' فاریہ نوید سے سات سال چھوٹی تھی۔ فاریہ جب بارہ سال کی تھی تو اس کے ابو کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹی سی عمر میں بچے یتیم ہو گئے تب نوید نے ہی گھر کی اور ماں بہن کی ذمہ داری اٹھائی۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ بھائی کی لاڈلی بھی تھی۔ نوید کی شادی ہو گئی تو نصرت کا خیال تھا نوید کی محبت میں کمی آجائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ فاریہ لاابالی تھی لیکن لاپروا اور بے حس نہیں تھی۔ لیکن ثمو کو نوید کی فاریہ سے محبت گوارا نہیں تھی وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر نوید کے کان بھرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا نوید فاریہ کے لاڈ اٹھانا بند کر دے لیکن بھائی بہن کی محبت ہنوز قائم تھی۔ ثمو کا بھائی ناصر' جو ہر وقت ادھر ہی پایا جاتا تھا' اس کا رجحان فاریہ کی طرف تھا اور ثمو کو فاریہ اس وجہ سے بھی ناپسند تھی۔ جبکہ دوسری طرف معاملہ بالکل الٹ تھا۔ فاریہ کو نہ ثمو پسند تھی اور نہ ناصر بلکہ اسے ناصر سخت ناپسند تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گہری نیند میں تھا جب اسے لگا کوئی زور زور سے اس کا کندھا ہلا رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور سبطین کو دیکھ کر اس کا دل چاہا اس کا منہ توڑ دے۔

"کیا آفت نازل ہو گئی تم پر جو یوں مجھے ہلا رہے ہو۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" جواباً" وہ منہ لٹکا کر بولا تو نوفل کو بیٹھے بیٹھے جھٹکا لگا۔

"میں کیا تمہیں تمہاری امی لگ رہا ہوں۔"

"میری امی اتنی خوفناک نہیں اور نہ اتنی بدلحاظ ہیں۔" سبطین نے منہ بنا کر کہا۔

"بات ایسی ہے میاں نازک! میں روز اپنا ناشتہ خود بناتا ہوں۔ اب تم آئے ہو تو اپنا ناشتہ خود بناؤ بلکہ ایسا کرو' اپنا بناؤ گے تو میرا بھی بنا دینا۔" کہہ کر وہ خود اطمینان سے لیٹ گیا۔

"اٹھ جاؤ نا یار! کچھ بنا دو' سچ بڑی بھوک لگی ہے۔" سبطین نے ایک دفعہ پھر اسے جھنجوڑ ڈالا جواباً" اس نے زور سے ٹانگ ماری تھی۔

"سنا نہیں' خود بناؤ۔"

"میں نے کبھی چائے بھی نہیں بنائی' ناشتہ تو بڑی دور کی بات ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"میں نے ٹھیک تمہارا نام سوچا ہے مسٹر نازک' تمہارا حساب تو اس پھوہڑ لڑکی والا ہے جو منہ ٹیڑھا کر کے کہتی ہے مجھے تو انڈہ بھی ابالنا نہیں آتا۔" اتنی زنانہ مثال پر سبطین نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"کر لو باتیں جتنی کرنی ہیں' میرا وقت بھی آئے گا۔"

"جب آئے گا تب دیکھا جائے گا فی الحال جا کر ناشتا بناؤ اور ایک بات گھر سے باہر رہنے کا اتنا شوق تھا تو کچھ سیکھ کر نکلنا تھا۔ یہاں تمہاری امی اور بہن نہیں ہیں بیٹا جی لاڈ اٹھانے کے لیے۔" "چلو شاباش۔" آخر میں اس نے پچکارا تو سبطین نے غصے سے اس کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر اس کے منہ پر دے مارا۔

"تم سے منہ ماری کرنے سے بہتر ہے میں کچن میں جا کر چیزوں سے سر پھوڑ لوں۔" وہ غصے سے کہتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ فریج سے بریڈ نکال کر اس نے چولہا جلا کر توا اوپر رکھا اور اس پر آئل ڈالا۔ بریڈ اوپر ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ گرم توے کے کنارے کو چھو گیا جواباً" اس نے زوردار چیخ ماری۔

اس کے چیخنے پر جہاں نوفل چھلانگ مار کر بیڈ سے اٹھا تھا' وہیں انیکسی کے کچن سے منسلک شرمین کا کچن تھا۔ چیخ کی آواز پر ساس پین اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا تھا۔ اس نے گھبرا کر دیوار کے پار یوں دیکھا جیسے سب نظر آ ہی جائے گا۔ دوسری طرف سے مردانہ آواز میں دہائیاں جاری تھیں۔

"ایک کام کہا تھا تم سے پھوہڑ آدمی! وہ بھی تم سے نہیں ہوا۔"

"تمہیں کھانے کی پڑی ہے ذلیل آدمی' میرا ہاتھ جل گیا ہے۔" سبطین نے اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے سے نوفل کو دیکھا۔

"تو دھیان سے کام کرنا تھا نا۔" نوفل نے منہ بناتے ہوئے اس کا ہاتھ دیکھا جو اچھا خاصا سرخ ہو رہا تھا۔

"رکو' ٹوتھ پیسٹ لاتا ہوں۔ برنال تو اس وقت گھر میں نہیں ہو گی۔" کہہ کر وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف بڑھا جبکہ سبطین نے بڑی خود ترسی سے اپنی سرخ ہتھیلی کو دیکھا۔

"کیا گرا ہے' بٹیا۔" برتن گرنے کی آواز سن کر خاور صاحب کچن میں آئے تھے۔

"کچھ نہیں ابو' ساس پین گر گیا تھا۔" وہ چائے کا پانی رکھتے ہوئے بولی۔

"ابو ساتھ والے کچن سے آدمیوں کے بولنے کی آواز آ رہی ہے۔" اس نے چینی ڈال کر انہیں دیکھا۔

"ہاں میں تمہیں بتانا بھول گیا نوفل کے ساتھ اس کا کزن بھی رہے گا۔"

"ابو!!" وہ حیران ہوئی۔ "آپ نے اجازت دے

دی۔"
"تو بیٹا اور کیا کرتا۔" وہ لاچاری سے بولے۔
"ایسی بھی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہ تو انہیں خود سوچنا چاہیے تھا کہ انہیں جگہ دی ہے اسی پر اکتفا کرتے کزن کو بھی بلالیا۔"
"چھوڑو بیٹا میں ملا ہوں نوفل کے کزن سے شریف لڑکا لگتا ہے۔"
"ابو جی! کسی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا۔" وہ ناراضی سے بولی اور مڑ کر پتی ڈالنے لگی۔ خاور صاحب نے بغور اس کا روٹھا انداز دیکھا۔
"تم ناراض نہ ہو میری گڑیا! کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں نے سوچ سمجھ کر اجازت دی ہے۔" خاور صاحب کے کہنے پر وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی تو وہ مسکرا کر باہر نکل گئے۔
نوفل جب ٹوتھ پیسٹ لے کر آیا سبطین دیوار سے کان لگائے باتیں سن رہا تھا۔ کان نہ بھی لگاتا تو بھی آواز کھڑکی اور دروازے کے راستے صاف آرہی تھی۔ خاور صاحب کی بیٹی یقیناً "ان کے بارے میں رائے زنی کررہی تھی" نوفل نے غصے سے سبطین کو دیکھا۔
"سنا تم نے کیا فرما رہی ہیں محترمہ۔"
"ششش۔" سبطین اپنا درد نظر انداز کرتا ہوا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن سے باہر لے آیا۔
"تم کیوں اتنا غصہ کررہے ہو۔"
"غصہ کرنے والی بات نہیں ہے کیا؟ ہم کیا لفنگے آوارہ غنڈے ہیں جوان کے گھر میں رہنے سے ان کے گھر کا امن وسکون برباد ہو جائے گا۔" غصے میں نوفل نے ______ پیسٹ سبطین کے ہاتھ پر ڈال دی تھی۔
"یار اس لڑکی نے اتنا برا بھی نہیں کہا۔ احتیاط اچھی ہوتی ہے۔" سبطین نے نوفل کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔
"احتیاط اچھی چیز ہے مجھے بھی پتا ہے لیکن جانے بغیر وہ اعتراض کیسے کرسکتی ہے۔ مجھے تو پہلے ہی اس لڑکی کا انداز پسند نہیں آیا۔ پہلے مجھے مغرور لگی تھی لیکن مغرور ہونے کے ساتھ بدتمیز بھی ہے۔" نوفل نے اپنی رائے بیان کی تو سبطین نے گہرا سانس لیا۔
"چھوڑو نا یار' زیادہ اعتراض اس نے مجھ پر کیا ہے۔ مجھے تو برا نہیں لگا تمہیں کیوں لگ رہا ہے۔"
"مجھے اس لیے برا لگ رہا ہے کہ ایک لڑکی مجھے پسند ہی نہیں اور آنے سے پہلے ابو مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اس لڑکی کو میرے لیے پسند کیا ہے' میں اسے دیکھ لوں۔"
"واقعی؟" سبطین اچھل کر بولا۔
"تمہیں بڑی خوشی ہو رہی ہے۔" نوفل نے ناگواری سے اس کو دیکھا۔
"یار! خوشی کی ہی تو بات ہے۔ اگر انکل آنٹی نے اس لڑکی کو تمہارے لیے پسند کیا ہے تو یقیناً "اس میں کوئی بات ہوگی۔"
"میں نے تمہیں بتایا نا مجھے وہ پسند نہیں۔"
"دیکھے بغیر تم کیسے فیصلہ کرسکتے ہو۔" سبطین نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ نوفل کی خاموشی پر اس نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔
"کہیں تم کسی اور کو تو پسند نہیں کرتے۔" نوفل نے چونک کر سبطین کو دیکھا جو اسے گھور رہا تھا۔
"پسند تو نہیں کہہ سکتے لیکن سائرہ مجھے اچھی لگتی ہے' بولڈ ہے' ماڈرن ہے' پردے کی ہوبو نہیں' شرمانے کی ایکٹنگ بھی نہیں کرتی۔" سبطین نے افسوس سے سر ہلایا۔
"تمہیں یہ اس کی خوبیاں لگتی ہیں۔"
"مجھے اس کی یہ عادتیں پسند ہیں۔" نوفل نے اسے دیکھ کر کہا۔
"عورت کی حیا اس کی خوب صورتی ہوتی ہے۔ بظاہر سائرہ کی جو باتیں تمہیں خوبیاں لگ رہی ہیں' بیوی بننے کے بعد وہ تمہیں خرابیاں لگنے لگیں گی۔ ہم مشرقی مرد ہیں' ماں بہن بیوی کے لیے ہمارے معیار کچھ اور ہوتے ہیں۔ سائرہ کی صرف تم سے ہی دوستی نہیں' تم جیسے اس کے اور بھی دوست ہیں۔ کیا تم یہ برداشت کرلوگے۔"
"وہ صرف اس کے دوست ہیں' شادی سے پہلے

میں اس کو کلیئر کردوں گا اور مجھے یقین ہے وہ میری خاطر خود کو بدل لے گی۔" سبطین بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ نہا کر باہر آیا تو نوفل کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"یہ تم اتنا بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو۔" سبطین نے دونوں ابرو اچکا کر پوچھا جو خود پر بے دریغ پرفیوم کا استعمال کر رہا تھا۔

"آج میری ایڈ شوٹ ہے۔"

"واقعی۔" سبطین حیران ہوا۔

"پر انکل سے تو تم نے کہا تھا تم ماڈلنگ نہیں کرو گے۔"

"ماڈلنگ کا کہا تھا ایکٹنگ کا نہیں۔" وہ ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"خبیث۔" سبطین زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم چلو گے۔" نوفل نے اسے آفر کی۔

"ایڈ کس چیز کا ہے۔"

"بے بی ڈائپرز کا۔"

"کیا؟" شرٹ کی طرف بڑھتا سبطین کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"تم بے بی ڈائپر کا ایڈ کر رہے ہو۔" سبطین کا کھلا منہ دیکھ کر نوفل نے قہقہہ لگایا تھا۔

"تمہاری ہونق شکل دیکھنے کے لیے ایسا کہا ہے۔ منہ بند کر لو، مکھی چلی جائے گی۔" کہہ کر وہ بالوں میں برش کرنے لگا۔

"تو سچ پھوٹو منہ سے، کس چیز کا ایڈ کر رہے ہو۔"

"چائے کا ایڈ ہے اب جلدی سے تیار ہو جاؤ گیارہ بجے وہاں پہنچنا ہے۔"

انہیں پندرہ منٹ ہو گئے تھے ٹیکسی کا انتظار کرتے ہوئے اور اب تو دونوں کوفت کا شکار ہو گئے تھے۔

"روز کی خواری سے میں تنگ آ گیا ہوں۔" نوفل نے بے ساختہ انداز میں ٹشو کو اپنے چہرے پر پھیر کر نادیدہ گرد کو صاف کیا۔

"وہ ٹیکسی آ رہی ہے۔" سبطین نے کہہ کر اور نوفل نے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

دوسرے ٹیک میں شارٹ مکمل ہو گیا تھا۔ نوفل اپنی کامیابی پر بڑا خوش تھا۔ سبطین اسے خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی اسے حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

"یہ جو تم اتنا خوش ہو رہے ہو، سوچا ہے ایڈ تو تم نے چھپ کے کیا ہے لیکن جب ٹی وی پر آئے گا تو پوری دنیا دیکھے گی اور اس دنیا میں تمہارے امی ابو بھی ہیں ان کو کیا جواب دو گے۔" ایک پل کے لیے نوفل کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔ اپنی خوشی میں وہ یہ بات بھول گیا تھا۔

"چھوڑو یار! ابھی میں یہ بات سوچ کر اپنی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

"مسٹر نوفل! کانگریچولیشن، بہت اچھا شوٹ کروایا آپ نے۔" ان دونوں کے پاس کھڑی لڑکی نے کہا تو وہ دونوں مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

"تھینکس۔" نوفل نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

"میں نوشین خان ہوں۔"

"جی میں آپ کو جانتا ہوں۔ آج کل آپ کا ڈرامہ آن ایئر آ رہا ہے۔"

"جی ٹھیک پہچانا، پچھلے سیٹ پر میرے ڈرامے کی شوٹ ہے۔ ادھر سے گزر رہی تھی، آپ کی شوٹ دیکھی، اچھی لگی۔ سوچا آپ کو مبارک باد دے دوں۔ ہماری انڈسٹری کو آپ جیسے ٹیلنٹڈ اور ہینڈسم لوگوں کی ضرورت ہے۔" نوفل نے جتاتی نظروں سے سبطین کو دیکھا جو بمشکل ہنسی کنٹرول کر کے کھڑا تھا۔

"تھینک یو فار یور کمپلیمنٹ۔" نوفل عاجزی سے بولا۔

"اگر آپ ڈرامے میں ایکٹنگ کے خواہش مند ہیں تو بتایئے گا۔ ہمارے اگلے پلے میں ہمیں نئے فیس

کی ضرورت ہے۔ اگر آپ انٹرسٹڈ ہیں تو میں ڈائریکٹر صاحب سے بات کر سکتی ہوں۔ مجھے امید ہے ان کو آپ کا کام پسند آئے گا۔"

نوفل کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ "ضرور۔"

"تو پھر اپنا نمبر دے دیں۔ بات بنتے ہی میں آپ کو کال کر دوں گی' میرا نمبر بھی رکھ لیں۔" نوفل اپنا نمبر لکھوا رہا تھا اور سبطین ارد گرد پھیلے گلابی چہروں کو دیکھ رہا تھا۔

نوفل کا ایڈ ٹی وی پر چل گیا تھا اور اس کو اتنا پسند کیا گیا تھا کہ اسے ایڈز کے علاوہ ڈراموں کی آفر بھی آنے لگی تھیں۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا لیکن اس کی خوشی کو بریک تب لگی جب ابو کا فون آیا۔ فون پر گالیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔

"تمہیں کہا بھی تھا چھوڑ دو یہ فضول شوق لیکن نہیں' ہم ہی پاگل ہیں جو تم پر بھروسا کر کے تمہیں لاہور بھیجا اور تم جاب کرنے کے بجائے یہ بھانڈوں والے کام کر رہے ہو۔"

"ابو جی' میں جاب کر تو رہا ہوں۔ یہ تو میں نے شوقیہ ایڈ کیا ہے۔"

"مجھے تمہارا یہ شوق ہی نہیں پسند۔" اب کی بار نوفل خاموش رہا تھا۔

"بہر حال جو تم نے کرنا تھا وہ کر لیا' اب مجھے یہ بتاؤ' خاور کی بیٹی سے ملے ہو۔" نوفل نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔

"نہیں ابو' میری ملاقات نہیں ہوئی۔" پہلے اس نے سوچا کہ انہیں بتا دے کہ اسے وہ لڑکی پسند نہیں لیکن ان کے خراب موڈ کا سوچ کر چپ رہ گیا۔

"چلو کوئی بات نہیں میں اور تمہاری ماں اگلے ہفتے لاہور آ رہے ہیں۔ ہم کو بھی بچی سے ملنا ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ جا کر دیکھ لینا۔" وہ پہلے سے سب طے کیے بیٹھے تھے نوفل نے بے ساختہ پہلو بدلا۔

"ابو جب آپ لاہور آئیں تو میری کار میں آئیں' یہاں کنوینس کی بہت پرابلم ہے۔"

"ٹھیک ہے لے آؤں گا اور تم بھی اب یہ فضول شوق چھوڑ دو۔"

"جی ابو۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں جلدی سے بولا اور فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں جا رہی ہو۔" وہ باہر کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی جب ثمو کی آواز سن کر رک گئی۔

"شرمین کی طرف جا رہی ہوں۔" اس نے رک کر بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"کبھی سکون سے گھر میں بھی بیٹھ جایا کرو۔" ثمو کے طنزیہ انداز پر اس نے اسی تحمل سے جواب دیا۔

"آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے۔"

"ضروری ہے کوئی کام ہی ہو۔" اس سے پہلے ثمو کوئی مزید بات کرتی نوید لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

"کیا بات ہے' کیوں اتنا شور کر رہی ہو۔"

"میری آواز تو آپ کو ہمیشہ شور ہی لگتی ہے۔" ثمو نے برا مان کر اپنے شوہر کو دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں فاریہ کو کہہ رہی تھی' کبھی سکون سے گھر بھی بیٹھ جایا کرے۔ جب دیکھو باہر پھرتی رہتی ہے۔"

"کیوں فاریہ' کہاں جا رہی ہو۔" نوید نے اب براہ راست اس سے پوچھا تو وہ چلتی ہوئی نوید کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"کافی عرصہ ہو گیا ہے' میں شرمین کی طرف نہیں گئی۔ کل اس کا فون بھی آیا تھا تو اس سے ہی ملنے جا رہی تھی۔ یہ پاس ہی اس کا گھر ہے' ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا تو وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بجائے اس کے اس کو منع کرتے' خود اسے اجازت دے دی جانے کی۔"

نوید نے سنجیدگی سے ثمو کو دیکھا۔ "وہ بچی نہیں ہے کہ اس کے آنے جانے پر یا ہر بات پر پابندی لگائی جائے۔ سمجھ دار ہے۔ دوسرا وہ جاتی کہاں ہے' ایک ہی

اس کی دوست ہے اور شرمین کو میں بچپن سے جانتا ہوں، بچپن سے آنا جانا ہے دونوں کا اور شرمین کے گھر میں ہے کون جس کی وجہ سے میں اس پر پابندی لگاؤں۔" نوید نے سوالیہ انداز اختیار کیا۔

"کیا آپ کو پتا نہیں شرمین کے ابو نے دو لڑکے گھر میں کرائے دار رکھ لیے ہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فاریہ، شرمین سے ملنے گئی ہے ان لڑکوں سے نہیں۔" اب کے نوید نے برا مان کر کہا۔

"میں تو آپ لوگوں کی بھلائی کی بات کروں تو بھی آپ کو بُری لگتی ہے، پڑھائی سے فارغ ہوئی تو آپ اسے جاب کرنے نہیں دیتے۔ اس کی شادی کی بات کروں تو بھی آپ کو بری لگتی ہے، کیا آپ کو اس کی شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں نہیں کرنی پر کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی ملے نا۔ کیوں، تمہاری نظر میں ہے کوئی رشتہ۔"

"ہے تو سہی پر پتا نہیں آپ کو پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔"

"کون ہے۔" نوید نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"ناصر میرا بھائی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" نوید بے ساختہ بولا۔

"اس بات سے کیا مطلب ہے آپ کا۔" ثمو کو برا لگا تھا۔

"کیا کمی ہے میرے بھائی میں۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

"کیا خوبی ہے تمہارے بھائی میں۔" جواباً نوید نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"یہ خوبی کیا کم ہے کہ وہ میرا بھائی ہے۔ آپ سب کا دیکھا بھالا ہے۔ دوسرا وہ فاریہ کو پسند کرتا ہے اور سچ پوچھیں تو آپ کی بہن کی جو عادتیں ہیں، کوئی سمجھ دار آدمی تو اس سے شادی نہیں کر سکتا اور اگر مجھے اختیار کا موقع دیا جاتا تو فاریہ کبھی بھی میری چوائس نہیں ہوتی۔ یہ تو ناصر ہے، جو بار بار کہتا ہے تو میں نے آپ سے بات کرلی۔"

"تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" نوید کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں، مجھے جواب تو دے کر جائیں۔"

"جواب ہی سمجھو میری طرف سے۔" باہر نکلتے ہوئے نوید نے بانک لگائی۔

"دونوں بہن بھائی ایک جیسے ہیں، عقل سے پیدل۔" پیچھے سے ثمو کڑھ کر بڑبڑانے لگی۔

"تمہیں کہاں سے میری یاد آگئی۔" فاریہ سے گلے ملتے ہوئے شرمین نے بے ساختہ گلہ کیا تھا۔

"مجھے تو پھر بھی یاد آگئی، تمہیں تو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ مجھ سے ملنے ہی آجاؤ۔ یہ تین گھر چھوڑ کر ہمارا گھر ہے۔"

"کیسے آتی یار! تمہیں پتا ہے میں باہر کم ہی جاتی ہوں پھر پچھلے دنوں ابو کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی تو بالکل بھی ٹائم نہیں ملا۔"

"اچھا، مجھے بتا دیتیں میں تمہاری ہیلپ کے لیے آجاتی۔"

"بس یار دھیان ہی نہیں رہا۔ تم سناؤ آج کل کیا ہو رہا ہے۔"

"کچھ خاص نہیں گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ کوکنگ کرلی ٹی وی دیکھ لیا۔ بھابھی کی باتیں سن لیں اور رنی فی کے ساتھ پارک میں واک کرلی۔"

"ارے، نی فی بھی آئی ہے۔" شرمین نے مسکرا کر باہر گھومتی بلی کو دیکھا۔

"انکل اب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں اب تو بہتر ہیں۔"

"کہاں ہیں۔" فاریہ نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"آج کل انیکسی میں ابو کے دوست کا بیٹا اور اس کا کزن رہ رہے ہیں، ابو ان سے ملنے گئے ہیں۔"

"ہوں۔" فاریہ نے ہنکارا بھرا۔

"کچھ کھاؤ گی۔" شرمین نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کیا بنایا ہے۔"

"کریلے گوشت۔"

"چلو کچن میں چلتے ہیں۔" وہ اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"یار میں یہاں جاب کرنے آیا تھا صفائی کرنے یا کھانا پکانے نہیں۔" سبطین نے جھاڑو دیتے ہوئے دہائی دی۔

"تمہیں شوق چڑھا ہوا تھا میرے ساتھ رہنے کا اب بھگتو۔" نوفل نے اپنی شرٹ استری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یار! ہم کوئی کام والی بھی تو رکھ سکتے ہیں؟" سبطین چمک کر بولا۔

"رکھ تو سکتے ہیں لیکن ملے گی کہاں۔" نوفل نے بھی اس کی خیال سے اتفاق کیا۔

"یار انکل سے بات کرتے ہیں۔ یقیناً" ان کے گھر کوئی کام والی آتی ہو گی۔"

"پتا نہیں، لیکن ضرورت کیا ہے، صبح ہم جاب پر چلے جاتے ہیں شام کو آتے ہیں۔"

"پتا ہے مجھے لیکن صفائی بھی تو کرنی پڑتی ہے۔ باہر کا کھانا کھانا پڑتا ہے، برتن دھونے پڑتے ہیں۔" سبطین زیادہ ہی اکتایا ہوا تھا۔ تب ہی باہر کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"دیکھو کون ہے۔" نوفل کے کہنے پر سبطین نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تمہارے پاؤں میں کیا مہندی لگی ہے، خود جا کر دیکھ لو۔ دیکھ نہیں رہے میں بزی ہوں۔" اس نے جھاڑو ہوا میں لہرا کر کہا تو نوفل مسکراتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر خاور انکل کھڑے تھے۔

"السلام علیکم انکل کیسے ہیں آپ۔"

"میں تو ٹھیک ہوں بیٹا تم لوگ سناؤ۔"

"ہم بھی ٹھیک ہیں انکل۔" وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا اندر آ گیا۔ سبطین نے جلدی سے جھاڑو ایک طرف پھینکی۔

"السلام علیکم انکل۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ مسکرا کر بولے۔ وہ اس کا جھاڑو پھینکنا دیکھ چکے تھے۔

"بیٹھیں انکل۔" سبطین شرمندگی مٹانے کے لیے جلدی جلدی بولا۔

"ابھی ہم آپ کو ہی یاد کر رہے تھے۔"

"خیریت تھی۔" وہ کچھ حیران ہو کر پوچھنے لگے۔

"جی خیریت تھی۔ انکل کوئی کام کرنے والا مل سکتا ہے ہمیں صفائی کے لیے، کھانا پکانے کے لیے برتن دھونے کے لیے کوئی کام والی چاہیے۔"

"اچھا۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ہمارے گھر کام کرنے والی ایک لڑکی آتی ہے اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں اور شاید ٹھیک ہے۔"

"جی، ابو سے کل میری بات ہوئی تھی۔ وہ اگلے ہفتے لاہور چکر لگائیں گے۔" خاور صاحب سن کر خوش ہو گئے۔

چلو پھر میں چلتا ہوں۔"

"ابھی تو آئے ہیں۔ انکل تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔" سبطین نے حق میزبانی نبھایا۔

"وہ کام والی آئی ہو گی۔ میں ابھی اس سے بات کر کے تم لوگوں کو بتاتا ہوں۔" سبطین نے خوشی سے نوفل کی طرف دیکھا جو خاور صاحب کو چھوڑنے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

"ارے فاریہ بیٹی آئی ہے۔"

"جی انکل، کیسی طبیعت ہے آپ کی۔" وہ انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب تو ٹھیک ہوں۔ بیٹا تم بتاؤ اتنے دن بعد چکر کیوں لگایا۔"

"بس انکل غلطی ہو گئی۔ اب جلدی چکر لگاؤں گی۔" وہ ہنس کر بولی تو خاور صاحب مسکرا کر شرمین کو دیکھنے لگے جو ان دونوں کو دیکھ اور سن کر مسکرا رہی تھی۔

"کنیز آئی ہے۔" انہوں نے کام والی کا پوچھا۔ تب ہی گیٹ بجا کر کنیز اندر داخل ہوئی۔

"بڑی عمر ہے بھئی کنیز تمہاری، ابھی میں تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔"

"خیر تھی انکل جی۔" کنیز چادر صحیح کرتے ہوئے بولی۔
"ہاں مجھے پوچھنا تھا کہ انیکسی میں ہمارے دو مہمان ٹھہرے ہیں ان کو صفائی کے لیے اور کھانا پکانے کے لیے کسی ہیلپر کی ضرورت ہے تو کیا تم ان کا کام کردو گی۔"
"پیسے کتنے دیں گے؟" وہ مطلب کی بات پر آئی۔
"ان سے تو میں نے پوچھا نہیں لیکن تم بتادو' کتنا لو گی۔"
"میں۔" وہ سوچنے کے انداز میں بولی۔
"چار ہزار لوں گی اور اس سے ایک پیسہ بھی کم نہیں کروں گی۔ صاف بتارہی ہوں۔"
"تو ایسا کرو تم خود ان سے بات کرلو' وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔"
"چلیں کرلیتے ہیں بات بھی۔" وہ فوراً ہی باہر جانے کو تیار ہوئی۔
"کافی دیر ہوگئی ہے' اب میں چلتی ہوں۔" کنیز کے جاتے ہی فاریہ بھی کھڑی ہوگئی۔
"ارے بیٹھو نا' ابھی تو آئی ہو۔"
"تین گھنٹے ہونے والے ہیں آئے ہوئے' پہلے ہی بھابھی اتنی باتیں کرتی ہیں کہ میں زیادہ تر پھرتی رہتی ہوں۔ مزید بیٹھی نا تو انہیں اور موقع مل جائے گا۔" اس نے جھک کر فائی کو اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن گیٹ کے پاس جاکر اس کے قدم رک گئے۔ وہ غور سے انیکسی کے دروازے میں کھڑے لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور پھر جب یقین آگیا تو الٹے قدم اندر کی طرف بڑھی۔
"کیا ہوا خیریت اتنی حواس باختہ کیوں ہو۔" شرمین نے اسے دوبارہ آتا دیکھ کر پوچھا۔
"تمہاری انیکسی میں جو لڑکے ٹھہرے ہیں' تم نے ان کو دیکھا ہے۔" شرمین نے حیران ہوکر سر نفی میں ہلایا۔
"نہیں میں نے نہیں دیکھا لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"
"میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا ہے۔ وہ ٹی وی میں کام کرتا ہے۔ ماڈلنگ کرتا ہے۔"
"لیکن وہ دونوں تو جاب کرتے ہیں۔" شرمین نے تعجب کا اظہار کیا۔
"لیکن میں نے جس کو دیکھا' وہ وہی ہے۔ چائے کا جو نیا اشتہار آیا ہے اس میں وہ آرہا ہے اور پچھلے دنوں جو دیپک پروانی کا شو تھا اس میں بھی اس نے ایز اے ماڈل پرفارم کیا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔" فاریہ یقین دلانے والے انداز میں بولی۔
"اچھا۔" شرمین نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔
"کیا ہوا تمہیں حیرت یا خوشی کچھ نہیں ہوا۔"
"اس میں خوشی والی کون سی بات ہے۔" شرمین نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
"خوشی کی بات تو ہے ایک سلیبرٹی ہمارا جاننے والا نکل آیا ہے۔ لیکن تمہارے افسوس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔"
"افسوس تو نہیں ہے بس مجھے یہ کام پسند نہیں۔"
"تمہیں کون کہہ رہا ہے کہ تم ماڈلنگ کرو۔ جسے پسند ہے وہ تو کررہا ہے نا۔"
"یہی تو افسوس ہے کہ اسے کیوں پسند ہے۔" وہ دھیرے سے بولی لیکن فاریہ کے کان کھڑے ہوگئے۔
"اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے۔"
"کچھ نہیں۔" شرمین نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔
"اتنی جلدی تمہاری جان نہیں چھوٹنی میں نے' سچ بتاؤ کیا بات ہے۔" شرمین نے بے بسی سے اپنی اکلوتی ضدی سہیلی کو دیکھا۔
"وہ ابو کے دوست کا بیٹا ہے اور کچھ سال پہلے انہوں نے ابو سے میرا رشتہ مانگا تھا اور اب یہ موصوف شاید اسی سلسلے میں آئے ہیں۔"
"واقعی۔" فاریہ خوش ہوکر بولی۔
"ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ نہ ہو اس کا دوست ماڈلنگ کرتا ـــــ تم اشتہار دیکھ لو۔ چائے کا جس میں

تمہارا ہیرو خود چائے بنا رہا ہے، وہ بھی مزے کی۔"
"تمہیں کیسے پتا مزے کی تھی۔"
"ایڈ کے اینڈ پر وہ خود کہتا ہے مزے کی ہے۔ انکل سے پوچھ لینا انہوں نے تو دیکھا ہوا ہے اسے۔" فاریہ کے مشورے پر اس نے منہ بنایا۔
"مجھے کوئی شوق نہیں اسے دیکھنے کا۔" کہہ کر وہ برتن اٹھانے لگی تو فاریہ بھی کھڑی ہو گئی۔
"چلو چلتی ہوں، پھر آؤں گی۔ تم بھی ذرا اسے دیکھ لو ویسے کافی ہینڈسم ہے۔"
"نکلو اب تم۔" شرمین مصنوعی غصے سے بولی تو وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔
شام کو خاور صاحب آئے تو شرمین ٹی وی لگا کر بیٹھی تھی۔ ابھی تک اس کی نظر سے چائے کا اشتہار نہیں گزرا تھا۔
"چائے لاؤں آپ کے لیے۔"
"لے آؤ۔"
وہ چائے لے کر آئی تو خاور صاحب بڑے غور سے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔
"ابو چائے۔"
"میں نے ابھی ٹی وی پہ نوفل کو دیکھا ہے۔" فاریہ کے شک کی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ نوفل ہی تھا۔
"یہ دیکھو یہ نوفل ہے۔" ان کے کہنے پر فاریہ نے تیزی سے اسکرین کی طرف دیکھا جہاں خوش شکل لڑکا چائے بنا رہا تھا۔
"لیکن یہ تو بینک میں جاب کرتا ہے پھر یہ۔" خاور صاحب کچھ کشمکش کا شکار نظر آرہے تھے۔
"پوچھوں گا نوفل سے۔" وہ کچھ سوچ کر بولے۔
"کیا ضرورت ہے ابو پوچھنے سے کیا ہو گا۔ جو ہے وہ نظر آتو رہا ہے۔" اس نے ایک نظر اسکرین کی طرف دیکھا جہاں وہ پھر نظر آرہا تھا۔
"اگلے ہفتے شاہد اور اس کی بیگم آرہے ہیں۔ امید ہے اچھا ہی ہو گا۔ میں شاہد سے بات کروں گا۔ مجھے نوفل کا یہ کام پسند نہیں، مجھے امید ہے جب نوفل کو پتا چلے گا تو وہ یہ چھوڑ دے گا۔" انہوں نے پتا نہیں خود کو تسلی دی تھی یا اسے۔
"تم تیاری کر لینا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ میں بازار سے لے آؤں گا۔"
"جی ابو۔" وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"تم لوگ ایسا کھانا کھاتے ہو۔" ثریا نے افسوس اور حیرت کے ملے جلے تاثر کے ساتھ میز پر رکھے ڈونگے کو دیکھا۔
"بس آنٹی دیکھ لیں۔ صبر و شکر کر کے جو مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں۔" سبطین نے بے چارگی سے جواب دیا۔
"اتنا برا بھی نہیں ہے۔" شاہد صاحب نے لمبے شوربے کے ساتھ چکن کی ایک بوٹی پلیٹ میں ڈالی۔
"شکر کرو اتنا بھی مل رہا ہے۔" نوفل نے گھور کر سبطین کو دیکھا۔
"پتا ہے کتنی مشکل سے کنیز بی بی راضی ہوئی ہیں اور اب اگر انہیں پتا چلا کہ تم نے ان کی شان میں گستاخی کی ہے تو یہ لمبا شوربہ بھی نہیں ملے گا۔" نوفل نے اسے ڈرایا۔
"تو کوئی بات نہیں 'آنٹی زندہ باد۔'" اس نے ثریا کو دیکھ کر کہا۔
"امی ایک دو دنوں کے لیے یہاں آئی ہیں۔ بعد میں کنیز صاحبہ ہی زندہ باد ہونے والی ہیں۔" سبطین نے برا سا منہ بنایا۔
"میں سوچ رہا ہوں خاور سے بھی مل آؤں۔" کھانا کھانے کے بعد شاہد صاحب نے نوفل سے کہا تو وہ سر ہلا کر ٹی وی دیکھنے لگا۔
"اس کا شکریہ بھی ادا کر دوں کہ اس نے اتنی مہربانی کی 'اپنے گھر میں جگہ دی اور پھر ہر سہولت بھی۔'" ان کا اشارہ ٹی وی فریج اور صاف ستھرے گدے کی طرف تھا۔ "اور اس کی بیٹی سے بھی مل آئیں گے۔ تم ملے

ہو یا نہیں" نوفل نے ایک نظر سبطین کو دیکھ کر دوبارہ باپ کو دیکھا۔

"ابو جی' مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔"

"ہاں کہو۔" وہ سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"خاور انکل آپ کے دوست ہیں" آپ ضرور ملیں ان کا شکریہ بھی ادا کریں لیکن ان کی بیٹی سے متعلق کوئی بات نہ کیجیے گا۔"

"کیوں۔"

"کیونکہ ابو مجھے وہ لڑکی پسند نہیں۔" شاہد صاحب کچھ دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے تم اس سے ملے نہیں پھر وہ تمہیں ناپسند کیسے ہو گئی۔"

"شادی کے لیے میرے ذہن میں جیسی لڑکی کا تصور ہے وہ ویسی نہیں۔"

"میرا سوال ابھی بھی اپنی جگہ پر ہے۔ جب تم اس سے ملے نہیں، دیکھا نہیں تو تم کیسے کہہ سکتے ہو وہ تمہارے آئیڈیل جیسی نہیں اور ویسے بھی میرے نزدیک یہ آئیڈیل ـــــ نری حماقت ہے۔"

"لیکن ابو جی وہ مجھے پسند نہیں۔" وہ آخر میں جیسے چڑ کر بولا۔

"تو برخوردار جو پسند ہے اس کا بتا دو۔" شاہد صاحب کے طنزیہ انداز پر اس نے سٹپٹا کر ماں کو اور پھر سبطین کو دیکھا جو ہنسی چھپانے کے چکر میں دہرا ہو رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں ابو۔"

"ایسی بات نہ ہوتی تو تم دیکھے بغیر منع نہ کرتے۔"

"آپ بھی کیا بحث لے بیٹھے ہیں۔ جب وہ کہہ رہا ہے اسے نہیں پسند تو رہنے دیں۔ زندگی اسے گزارنی ہے اسی کی پسند کی لڑکی ہونی چاہیے۔"

"مرضی ہے تم لوگوں کی۔" شاہد صاحب ناراضی سے کھڑے ہو گئے۔ "میں خاور کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہیں چلنا ہے یا نہیں۔" انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا تو وہ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔

"میں روزانہ پوچھتا تھا نوفل سے تمہارے بارے میں۔" خاور صاحب کے کہنے پر شاہد صاحب مسکرا کر بولے۔

"ہاں نوفل مجھے بتاتا تھا اسی لیے سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں ایک تو تم سے ملنا تھا دوسرا تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔ تم نے بچوں کو رہنے کی جگہ دی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو شاہد! جیسے تمہارا بیٹا ویسے ہی میرا بیٹا ہے اور بھابھی آپ سنائیں کیسی ہیں۔" وہ بات بدل کر ثریا سے بات کرنے لگے تبھی ٹرالی لے کر شرمین اندر داخل ہوئی۔

"یہ شرمین ہے۔" خاور صاحب کے تعارف کروانے پر دونوں میاں بیوی اسے دیکھنے لگے۔

"اور بیٹا کیسی ہو۔" سب سے پہلے شاہد صاحب نے اٹھ کر اسے پیار کیا۔

"ماشاء اللہ خاور! تمہاری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔ چھوٹی سی تھی جب اسے دیکھا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہے۔" خاور صاحب نے مسکرا کر اپنی بیٹی کو دیکھا جو ٹرالی میں سے چیزیں نکال کر انہیں پیش کر رہی تھی۔

"اور شرمین بیٹا کیا کرتی ہو آپ۔"

"کچھ نہیں آنٹی گھر پر ہی ہوتی ہوں۔"

"پڑھتی نہیں ہو۔"

"میں نے ماسٹرز کیا ہے انگلش لٹریچر میں۔"

"ویری گڈ۔" شاہد صاحب متاثر ہو کر بولے۔

"تو بیٹا جاب کیوں نہیں کرتیں۔" ثریا نے پوچھا۔

"آنٹی' ابو سارا دن گھر میں اکیلے ہوتے ہیں' اس خیال سے میں بھی کہیں باہر نہیں جاتی۔"

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر رہ گئیں۔

"اچھا خاور' بہت شکریہ۔ تم نے اتنا تکلف کیا۔" شاہد صاحب اور ثریا کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

"تکلف کی کیا بات ہے تمہارا اپنا گھر ہے۔ ابھی کچھ دن رکو گے کیا۔"

"نہیں کل چلا جاؤں گا' پرسوں آفس بھی جانا

ہے۔"

خاور صاحب انہیں چھوڑنے دروازے تک آئے اور منتظر نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔ لیکن وہ کوئی بات کیے بغیر واپس چلے گئے۔ خاور صاحب کا دل بہت برا ہوا تھا۔۔۔۔ وہ شرمین پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن شرمین ان کی خاموشی کو کب سے نوٹ کر رہی تھی۔ رات کو وہ ان کے لیے چائے بنا کر لائی تو وہ نظریں ٹی وی پر جمائے بیٹھے تھے لیکن وہ جانتی تھی وہ ٹی وی نہیں دیکھ رہے۔

"ابو چائے۔"

"ہاں۔" انہوں نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا اور کپ تھام لیا۔

"کیا بات ہے ابو آپ کیا سوچ رہے ہیں۔"

"نہیں کچھ خاص نہیں، شاہد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ آیا۔ اس کی بیگم بھی ساتھ تھی لیکن ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔" شرمین خاموشی سے ان کا پریشان چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔

"ابو یہ بھی تو سوچیں، یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اب ہو سکتا ہے ان کی سوچ بدل گئی ہو۔"

"سوچ بدلنے کی وجہ بھی کوئی ہو۔"

"ابو ان کا بیٹا شوبز میں ہے، شوبز کی لائف آپ جانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی اور لڑکی پسند ہو۔"

"لیکن شاہد کو کچھ تو کہنا چاہیے تھا۔" وہ دھیمی آواز میں بولے۔

"میں پوچھوں گا اس سے۔"

"کیا پوچھیں گے ابو کہ انہوں نے بات کیوں نہیں کی۔" وہ سنجیدگی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"اگر آگے سے وہ کہہ دیں کہ ہمیں آپ کی بیٹی پسند نہیں آئی یا کچھ ایسا جو ان کے نزدیک انکار کی وجہ ہے تو اس میں ہماری بے عزتی ہے۔ اچھا ہے انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔" اب کی بار خاور صاحب کچھ بولے نہیں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"آپ پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔" وہ انہیں تسلی دے کر کھڑی ہو گی۔ لیکن خاور صاحب کی پریشانی دور نہیں ہوئی۔ آج کل رشتوں کا حصول کتنا مشکل تھا انہیں اندازہ تھا اور نوفل کی صورت میں انہیں تسلی تھی جو اب ایک خواب محسوس ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ابو نے انہیں منع کر دیا ہو گا یا نہیں۔" نوفل نے سبطین سے پوچھا جو بڑے مگن انداز میں سوپ پی رہا تھا۔

"تمہیں اتنی فکر ہو رہی ہے تو انکل سے پوچھ لیتے۔"

"کیا خاک پوچھ لیتے۔ ان کا موڈ اتنا آف تھا کہ میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔"

"ویسے مجھے لگتا ہے اگر انکل انکار کر کے گئے ہوتے تو خاور انکل اب تک ہمیں نکال چکے ہوتے۔" سبطین نے پیالہ خالی کر کے اپنی رائے بیان کی۔

"اور اگر پتا ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیں نہیں نکالا تو بہت بامروت ہیں انکل۔" سبطین کے کہنے پر نوفل نے سر اثبات میں ہلایا۔

"ویسے موقع اچھا تھا تم انکل سے سائرہ کی بات کر لیتے۔" نوفل نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ابو کو کیا بتاتا ابھی مجھے خود یقین نہیں دوسرا سائرہ سے بھی تو اس کی رائے لینا ضروری ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے، سائرہ کو پتا ہی نہیں کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔"

"بتایا تو ہے مجھے اپنے بارے میں پتا نہیں کہ میں واقعی اسے اتنا پسند کرتا ہوں کہ شادی کر لوں۔"

"چلو اب یہاں بھی تم کنفیوژ ہو۔" سبطین نے سر پیٹ کر کہا۔

"چلو چھوڑو سائرہ کو، باہر چلتے ہیں۔" سبطین سوپ پی کر فارغ ہو گیا تھا اس لیے کھڑا ہو گیا۔

"کنیز تم فارغ ہو گئی ہو۔" فاریہ نے کچن میں آ کر

پوچھا جو دھلے ہوئے برتن ریک میں رکھ رہی تھی۔
"تقریباً" فارغ ہو گئی ہوں۔ آپ کو کوئی کام تھا۔"
"ہاں۔ پارک تک جانا تھا سوچا تمہیں ساتھ لے چلوں۔" اور کنیز فوراً" تیار ہو گئی۔
"باجی وہ چکر تو لگا لیے اب تو میری ٹانگیں بھی دکھنے لگی ہیں۔" کنیز نے دہائی دی۔
"یہ موٹاپے کی پہلی نشانی ہے۔" فاریہ نے چلتے ہوئے کہا۔
"ارے یہ تو نوفل بھائی اور سبطین بھائی ہیں۔" کنیز کی چہکتی ہوئی آواز پر اس نے گردن گھما کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ جہاں وہ دو لڑکے سوسائٹی کے بچوں کو اکٹھا کر کے کرکٹ کے نام پر شور مچا رہے تھے۔
"تم جانتی ہو انہیں۔"
"ارے باجی! یہ وہی ہیں جو شرمین باجی کے گھر رہتے ہیں اس دن آپ کے سامنے ہی تو انکل جی نے مجھے ان کا کام کرنے کو کہا تھا۔" اس کے یاد دلانے پر فاریہ کو یاد آیا۔ اس نے غور سے نوفل کو دیکھا۔
"کیسے ہیں یہ دونوں۔" فاریہ نے انٹرویو کا آغاز کیا۔
"اچھے ہیں۔ دونوں شریف لڑکے ہیں۔ پہلے تو میں ڈر رہی تھی چھڑے چھانٹ ہیں نہ' جانے کیسے مزاج کے ہوں پر انکل نے تسلی کروائی تو میں ان کا کام کرنے لگی لیکن دونوں ہی بہت اچھے ہیں اور نوفل بھائی تو ٹی وی پر کام کرتے ہیں۔ اس دن میں نے انہیں ٹی وی پر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ میں بتا نہیں سکتی مجھے اتنی خوشی ہوئی میں ایک ٹی وی اسٹار کے گھر کام کرتی ہوں۔ میں نے تو ان کا آٹوگراف بھی لے لیا۔ وہ بتا رہے تھے وہ کوئی ڈرامہ بھی کرنے والے ہیں۔"
"اور وہ جو دوسرا لڑکا ہے۔" اس سے پہلے وہ اس کے بارے میں پوچھتی ربڑ کی گیند پوری طاقت سے اس کی ٹانگ پر لگی تھی۔ درد کی شدت سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ گیند اسے کسی گولی کی طرح لگی تھی وہ جھک کر ٹانگ دبانے لگی۔

"کیا ہوا باجی! زیادہ زور سے لگی ہے کیا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کنیز بھی پریشان ہو گئی۔ تب ہی وہ دونوں بھاگتے ہوئے ان کے پاس پہنچے تھے۔
"آئی ایم ویری سوری گیند غلطی سے آپ کو لگ گئی۔" بیٹ سبطین کے ہاتھ میں تھا اور وہ جھک کر فاریہ سے معذرت کر رہا تھا۔ فاریہ نے دوسرے ہاتھ سے آنسو صاف کیے اور سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"آپ کیا اندھے ہیں یا خود کو شاہد آفریدی سمجھ لیا ہے آپ نے۔" سبطین کو اس کا چہرہ جانا پہچانا لگا تھا۔
"اب اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں۔" اس کے یوں غور سے دیکھنے پر فاریہ ناگواری سے بولی۔
"میں گھور نہیں رہا' سوچ رہا ہوں آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" اب کی بار فاریہ نے بھی غور سے اسے دیکھا۔
"میرے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔"
"دیکھیں محترمہ! میں آپ کے ساتھ تمیز سے بات کر رہا ہوں اور آپ روڈ ہو رہی ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر آپ کو گیند نہیں ماری' غلطی سے لگی ہے۔"
"آپ نے جان بوجھ کر مجھے گیند ماری ہے۔ اس کونے سے اس کونے میں گیند مارنے کی کیا تک بنتی ہے۔" فاریہ باقاعدہ جرح پر اتر آئی۔ سبطین نے بھنا کر اسے دیکھا اس سے پہلے کہ وہ بولتا' کب سے خاموش کھڑا نوفل بول پڑا۔
"چھوڑو یار۔" اس نے پہلے سبطین کو چپ کروایا پھر فاریہ کو دیکھا۔
"ہاں واقعی غلطی سے لگی ہے لیکن آپ کو تکلیف پہنچی' اس کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔" نوفل نے سلیقے سے معذرت کی۔ تو وہ تھوڑی نرم پڑی۔
"اٹس اوکے۔"
"بھائی جی! آپ لوگ جاؤ۔" کنیز کے کہنے پر سبطین نے ایک غصیلی نظر فاریہ پر ڈالی جبکہ نوفل اس کا بازو کھینچ کر اسے وہاں سے لے گیا۔

"تمہیں بڑا دکھ ہو رہا تھا اپنے سگے بھائی کی بے عزتی کا، میری چوٹ تمہیں نظر نہیں آئی، ابھی بھی اتنا درد ہو رہا ہے۔"

"باجی مجھے پتا ہے آپ کو گیند لگی ہے پر آپ سبطین بھائی کو ایسے ہی سنا رہی تھیں۔ گیند واقعی غلطی سے لگی تھی۔"

"ہنہ! تمہیں الہام ہوا ہے نا۔" فاریہ غصے سے سر جھٹک کر بولی۔

"یہ تمہیں کیا ہوا تھا لڑاکا ملّے کی طرح کیوں لڑ رہے تھے۔" نوفل نے منہ بنا کر سبطین کو دیکھا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا، میں لڑ رہا تھا یا وہ لڑ رہی تھی وہ بھی بغیر وجہ کے۔"

"غلطی تمہاری تھی گیند تم نے ماری تھی۔"

"جان بوجھ کر تو نہیں ماری تھی۔ تم بھی اس کی طرح بحث کر رہے ہو۔" سبطین ناراضی سے بولا۔

"بحث نہیں کر رہا، تمہیں یاد دلا رہا ہوں وہ لڑکی تھی جس سے تم مرد ہو کر لڑ رہے تھے۔"

"چھوڑو بھی یار! لڑکی کے نام پر آفت ہے۔ یاد ہے، جب میں پہلی بار تمہارے پاس آ رہا تھا تو اس لڑکی نے مجھے مس گائیڈ کیا تھا۔ آج تک اس کی شکل بھولی نہیں مجھے۔" سبطین کے کہنے پر نوفل نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"اچھا۔" نوفل نے اچھا کو لمبا کھینچا۔ "میں سمجھا یہ کوئی دل ول کا چکر ہے۔"

سبطین نے تیزی سے سر اس کی طرف گھمایا۔

"میرا کیا ذہنی توازن خراب ہے جو میں اس پاگل لڑکی کو دل دوں گا۔ سبطین مراد جسے دل دے گا وہ لڑکی بڑی خاص ہو گی۔" سبطین نے فرضی کالر جھاڑے تو نوفل نے مصنوعی پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

"دیکھیں گے دیکھیں گے۔"

"مجھے بعد میں دیکھ لینا پہلے اپنا معاملہ تو ٹھیک کر لو۔"

"مطلب۔" نوفل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"مطلب یہ کہ سائرہ سے کب بات کرو گے۔ یہ نہ ہو انکل پھر تمہارے لیے کوئی لڑکی پسند کر لیں۔"

"یار۔" نوفل بے چارگی سے بولا۔ "تم بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"میرے خیال میں تمہیں سائرہ کو فون کر کے بتانا چاہیے۔"

"ہوں۔" نوفل نے ہنکارا بھر کر جیب سے فون نکالا اور سائرہ کا نمبر ملایا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا تھا۔

"تمہیں کیسے میری یاد آ گئی۔" چھوٹتے ہی سائرہ نے سوال کیا تو نوفل سبطین کی شکل دیکھنے لگا جو اسے پتا نہیں کیا اشارے کر رہا تھا۔

"یاد آئی ہے تو فون کیا ہے۔" جواباً وہ مسکرا کر بولا۔

"کیسی جا رہی ہے تمہاری جاب۔"

"اچھی جا رہی ہے۔"

"اور ماڈلنگ۔"

"وہ بھی ٹھیک ہے۔"

"میں نے ایڈ دیکھا تھا تمہارا بہت اچھا تھا۔"

"تھینک یو۔" نوفل مسکرا کر بولا۔

"ایک ڈرامے کی بھی آفر ہوئی ہے۔"

"گڈ نیوز۔" جواباً وہ بولی۔

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھر کر سبطین کو دیکھا جو اسے مکا دکھا رہا تھا۔

"سائرہ مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔"

"ہاں بولو۔" وہ مصروف انداز میں بولی جسے نوفل نے بھی محسوس کیا۔

"کیا تم بزی ہو۔"

"ہاں، نہیں تم بتاؤ۔"

"نہیں تم بزی ہو تو پھر بات کر لیں گے۔" نوفل نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"جمال میرا کولیگ ہے' اس کا فون بار بار آ رہا ہے۔"

"یہ جمال کون ہے۔" نوفل نے چونک کر پوچھا۔

"بتایا تو ہے میرا کولیگ ہے اور دوست ہے۔ دراصل ہم چند دوستوں کا دبئی جانے کا پروگرام بنا ہے تو اس سلسلے میں وہ بات کرنا چاہ رہا ہوگا۔"

"تم دبئی جا رہی ہو۔" وہ حیران ہو کر بولا۔ "اور تم نے بتایا بھی نہیں۔"

"تو تم کون سے رابطے میں تھے اور ویسے بھی میں ہر بات ہر کسی کو بتا کر نہیں کرتی۔" اس کا کسی کہنا نوفل کو برا کھٹکا تھا۔

"تمہارے دوستوں میں کون کون ہے۔"

"شہلا ہے' عاصم' کامران اور جمال۔"

"تم لڑکوں کے ساتھ جا رہی ہو۔" وہ ایک بار پھر حیران ہوا۔

"تو اس میں حرج کیا ہے۔" جواباً وہ حیران ہو کر بولی۔

"تمہارے پیرنٹس نے اجازت دے دی۔"

"پاپا تو نہیں مان رہے تھے پر میرا موڈ ہے جانے کا' میں خود کماتی ہوں مجھے کسی کی پرمیشن کی ضرورت نہیں۔" وہ خود سری سے بولی تو نوفل کو پہلی بار اس کی بے باکی بہت بری لگی۔

"مجھے تمہارا دبئی جانا پسند نہیں' اتنے میل فرینڈز کے ساتھ۔"

"واٹ ڈو یو مین نوفل؟" دوسری طرف سائرہ کی ناراض آواز سنائی دی۔

"میں میل فرینڈ کے ساتھ جاؤں یا فی میل فرینڈ کے ساتھ تمہیں کیا اعتراض ہے۔"

"اعتراض ہے۔ میں نے تمہاری وجہ سے اپنے پیرنٹس کی پسند کی ہوئی لڑکی کے لیے انکار کیا ہے اور تم اوروں کے ساتھ دبئی جا رہی ہو۔"

"اگر تم نے اپنے پیرنٹس کو انکار کیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو تم سے نہیں کہا تھا کہ تم مجھے پسند کرو اور ویسے بھی اتنے تنگ نظر آدمی کے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ نوفل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"کیا ہوا؟" سبطین کے پوچھنے پر اس نے سائرہ کی ساری بات اسے بتا دی۔ جواباً سبطین ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

"تمہیں تو اس کی بولڈنیس پسند تھی اب کیا ہوا۔" سبطین اس کا مذاق اڑانے لگا اور وہ اندر ہی اندر تلملانے لگا۔

"سو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تم میں انٹرسٹڈ ہی نہیں۔ تمہاری خاطر وہ ٹرپ کینسل نہیں کر سکتی تو اور کیا امید رکھتے ہو۔ بلکہ جو اپنے پیرنٹس کو اہمیت نہیں دیتی وہ تمہیں کیا دے گی اور تمہیں تو چھوڑو تمہارے امی ابو کو کیا سمجھے گی۔ اور کرو سائرہ سائرہ۔" کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا اور نوفل کو اسے دیکھ کر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ اس نے صوفے پر رکھے سارے کشن اسے مارنے شروع کر دیے۔

☆ ☆ ☆

"شرمین۔" خاور صاحب نے اندر داخل ہوتے ہی شرمین کو آواز دی تھی۔

"جی ابو۔" وہ کچن سے باہر نکلی۔

"ایک گلاس پانی تو پلاؤ۔"

"جی۔" وہ جلدی سے پانی کا گلاس لے کر آئی جسے انہوں نے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

"آج آپ نے بہت دیر کر دی۔"

"ہاں بس کام سے چلا گیا تھا۔" ان کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"کہاں گئے تھے ابو! تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔"

"ایک رشتہ کروانے والی عورت سے ملنے گیا تھا۔"

"ابو آپ دوسری شادی کر رہے ہیں۔" شرمین آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"پاگل جھلی نہ ہو تو۔" خاور صاحب کھل کر ہنسے تھے۔ "میری عمر ہے شادی کی' تمہاری بات کرنے گیا

تھا۔"
"کیا ضرورت ہے ابو۔" وہ بے زاری سے بولی۔
"ضرورت ہے نا بیٹا! پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے اور وہ بھی میری غلطی سے۔ میں شاہد کی بات پر بھروسا کر کے بیٹھ گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے۔"
"ابو تو ان کے بیٹے کو چلتا کریں پھر۔"
"نہیں بیٹا' میں ایسی کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ ان کا فعل ان کے ساتھ۔" وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔
"وہ عورت تین چار دن تک ایک رشتہ لے کر آئے گی۔"
"ابو مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں چلی گئی تو آپ اکیلے ہو جائیں گے۔ میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔
"پاگل۔" انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا۔
"بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں۔ ماں باپ سدا ساتھ نہیں رہتے۔ بیٹیاں جتنی جلدی اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں' اتنا ہی ماں باپ کو سکون ملتا ہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ مجھے سکون ملے۔ میں اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کروں۔" وہ کچھ بولی نہیں' آنکھ بند کیے ان کے سینے سے لگی رہی۔

☆ ☆ ☆

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک پر وہ بمشکل اٹھا تھا۔ بھاری ہوتے اور چکراتے سر کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا۔ کنیز کھڑی تھی۔
"سلام نوفل بھائی! آج آپ گھر میں' خیریت تھی۔" اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں' کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔" جب وہ بولا تو اس کی آواز بھی بھاری تھی۔
"کیا ہوا آپ کو؟" کنیز اب رک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی جو بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔
"بخار ہے۔"

"تو سبطین بھائی کدھر ہیں۔"
"وہ آفس گیا ہے۔" کہہ کر وہ بیڈ پر جا کر لیٹ گیا تو کنیز صفائی میں مصروف ہو گئی۔ وہ نیند میں تھا جب کنیز دوبارہ اس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی۔
"بھائی جی! کھانے میں کیا پکاؤں۔"
"کچھ بھی پکا لو۔" وہ بیزاری سے بولا تو وہ سر ہلا کر کچن میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر نوفل کے سرہانے کھڑی تھی۔
"بھائی جی! کچن میں تو کچھ بھی نہیں۔ پیاز' لہسن' ٹماٹر سب ختم ہیں۔ چکن بھی نہیں ہے اور دالیں بھی ختم ہیں۔"
ایک دفعہ میں ہی سارا قحط پڑ گیا تھا۔ نوفل کا دل چاہا اپنا سر پھاڑ لے۔
"رہنے دو۔ سبطین آتے ہوئے کچھ لے آئے گا۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی! اس حالت میں بازاری کھانا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔"
"اب کچھ نہیں ہے تو میرا سر پکاؤ گی۔" نوفل چڑ کر بولا تو کنیز خاموش ہو گئی۔
"اچھا پھر میں چلتی ہوں۔ صفائی ہو گئی ہے۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔
اس نے فون ایک کان سے دوسرے کان میں منتقل کیا۔ مسلسل بیل جا رہی تھی لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

★ ★ ★

"آج تم جلدی آ گئیں کنیز۔" کنیز کو آتا دیکھ کر شرمین نے حیرت کا اظہار کیا۔
"جی باجی! نوفل بھائی کی صفائی کرنے گئی تھی تو وہ آج گھر پر ہی تھے۔ کھانا بنانے میں ٹائم لگتا ہے لیکن آج کچن میں کچھ تھا ہی نہیں تو کھانا بنائے بغیر آ گئی ہوں۔" شرمین ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئی۔ کام کے دوران بھی کنیز کو نوفل کی فکر ستاتی رہی۔
"کیا بتاؤں باجی! مجھے نوفل بھائی پر بڑا ترس آیا

بیچارے۔" اس نے مکمل افسوس کا اظہار کیا تو کب سے نظرانداز کرتی شرمین کو بولنا پڑا۔

"کیوں، ترس کیوں آرہا تھا تمہیں۔"

"بڑا سخت بخار چڑھا ہے نوفل بھائی کو، شکل سے ہی پتا چل رہا تھا، اوپر سے اکیلے نہ ماں نہ بہن کوئی پاس نہیں پوچھنے والا اور پتا نہیں صبح سے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ میں کچھ بنا کر دے آئی پر سارا کچن بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔" اس کی کیفیت سُن کر کچھ لمحوں کے لیے شرمین بھی سوچ میں پڑ گئی پھر اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ فریزر سے چکن نکال کر اس نے دیگچی میں یخنی بنانے کے لیے رکھ دی دوسرے چولہے پر کھچڑی کے لیے چاول رکھ دیے اور خود باہر آ گئی۔ کنیز ابھی بھی نوفل بھائی کی گردان کر رہی تھی۔

"کنیز۔" وہ جانے لگی جب شرمین نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

"یہ سوپ اور کھچڑی لے جاؤ اور اسے اپنے نوفل بھائی کو دے دو۔" اس نے رومال سے ڈھکی ٹرے اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"باجی! یہ تو آپ نے بڑا نیک کام کیا۔" ٹرے دیکھ کر کنیز خوش ہو گئی تھی۔

"میں ابھی دے کر آتی ہوں۔" وہ ٹرے تھام کر خوشی خوشی انیکسی کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پر ہونے والی دستک پر نوفل نے غصے سے رضائی ہٹائی، اس کا ارادہ آنے والے کو سخت سست سنانے کا تھا لیکن دروازے میں ٹرے تھامے کنیز کو دیکھ کر وہ خاموش رہ گیا۔

"نوفل بھائی! یہ شرمین باجی نے کھانا آپ کے لیے بھیجا ہے۔ سوپ بھی ساتھ ہے۔ بڑی اچھی ہیں ہماری شرمین باجی، جیسے ہی میں نے آپ کی بیماری کے بارے میں بتایا، انہوں نے اسی وقت آپ کے لیے پرہیزی کھانا بنا کر بھیج دیا۔" کنیز نے ٹرے کچن شیلف پر رکھ دی اور سوپ کا پیالہ لا کر اسے دیا۔

"یہ پی لیں۔" نوفل کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن کنیز کا خلوص دیکھ کر وہ انکار نہیں کر سکا۔ سوپ اتنے مزے کا تھا کہ وہ پورا پیالہ خالی کر گیا۔ سوپ پینے کے بعد اسے عجیب سا سکون ملا تھا۔

"کنیز، تمہارا بہت شکریہ۔"

"بھائی جی میرا کیسا شکریہ، شکریہ تو شرمین باجی کا ادا کریں جنہیں یہ خیال آیا۔" وہ منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن دل سے اس لڑکی کا ممنون تھا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ آپ کو بھوک لگے تو کھچڑی ہے، وہ کھا لینا۔"

☆ ☆ ☆

شام میں جب سبطین آیا تو بھرپور نیند لینے کے بعد نوفل کی طبیعت کافی بہتر تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے۔" اسے دیکھتے ہی سبطین نے پوچھا۔

"بہتر ہوں۔"

"دوائی لی تھی۔"

"ہاں۔"

"اور کچھ کھایا تھا۔" سبطین بازار سے لایا ہوا سامان میز پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہاں انکل خاور کی بیٹی نے سوپ اور کھچڑی بنا کر بھیجی تھی۔"

"او۔" سبطین رک کر اسے دیکھنے لگا۔ "واہ! کیا بات ہے۔ یہاں تو بڑی خاطر مدارت ہو رہی ہے، لگتا ہے اچھی لڑکی ہے۔ ایک وہ تمہاری سائرہ بیگم ہے، اس کو فون کیا تھا تمہارے بخار کا بتایا تو کہنے لگی بخار ہی ہے نا، اس کے نزدیک تمہاری یہ اہمیت ہے اور جسے تم پسند نہیں کرتے، وہ اتنی اچھی ہے کہ بغیر کسی واسطے کے صرف تمہاری بیماری کا سن کر کھانا بھیج دیا۔"

"سائرہ کا ذکر اب دوبارہ میرے ساتھ نہ کرنا اور تمہیں کیا ضرورت تھی اسے فون کرنے کی۔" نوفل غصے سے بولا۔

"تمہارے لیے کیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا وہ آگے سے اتنا روڈلی بولے گی۔"

"ختم کرو اب اس سائرہ کا قصہ اور مجھے یہ بتاؤ تم سے کل کہا تھا کچن کا سامان ختم ہے تو لے کر کیوں نہیں آئے۔ کچھ ہوتا تو کنیز بنا جاتی کم از کم احسان تو نہ لینا پڑتا۔" سبطین کچن سے کھچڑی والی پلیٹ اٹھا لایا تھا۔

"بڑے احسان فراموش ہو۔ ایک تو اس رحم دل لڑکی نے تم پر مہربانی کی' اتنے مزے کا کھانا ہے۔" وہ کھچڑی کھاتے ہوئے بولا۔

"یہی کھانا کنیز بناتی تو حلق سے نیچے ایک نوالہ نہیں اترنا تھا۔"

"اب یہ رحم دل شہزادی کے ذکر کو ختم کرو۔ یہ بتاؤ سامان کیوں نہیں لے کر آئے۔"

"یاد نہیں رہا یار!" سبطین کھاتے ہوئے مگن انداز میں بولا۔

"ابھی لے کر آتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

وہ کچن کا سامان لے کر آیا تو لان میں خاور صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ پھولوں کو پانی دے رہے تھے۔ وہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے رک گیا۔

"کیسے ہیں انکل۔" خاور صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور پائپ گملے میں ڈال دیا۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ انکل' آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔"

"کس بات کا۔" خاور صاحب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"نوفل کے لیے کھانا بھجوانے کا۔"

"کھانا!!" وہ مزید حیران ہوئے۔

"اچھا میرے علم میں یہ بات نہیں تھی۔"

"جی۔" وہ سر کھجاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کچن میں سامان رکھ رہا تھا کہ نوفل بھی اس کے پیچھے آ گیا۔

"کچھ چاہیے تھا؟"

"ہاں چائے پینے کا دل چاہ رہا تھا۔"

"بیٹھو بناتا ہوں۔" سبطین آستین چڑھائے ہوئے سگھڑ عورتوں کی طرح چکن دھوتے ہوئے بولا۔ تب ہی ساتھ والے کچن سے خاور صاحب کی آواز آئی۔

"ابھی باہر مجھے سبطین ملا تھا' وہ بتا رہا تھا تم نے نوفل کے لیے کھانا بھیجا تھا۔" سبطین نے بے ساختہ نوفل کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"جی ابو' کنیز بتا رہی تھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور کچن میں کھانا بنانے کے لیے بھی سامان نہیں تھا تو میں نے سوپ اور کھچڑی بنا کر بھیج دی۔" جواباً شرمین کی آواز سنائی دی۔

"کیا میں نے غلط کیا ابو؟" انہیں خاموش دیکھ کر شرمین نے مزید پوچھا۔

"نہیں بیٹا! تم نے تو نیکی کا کام کیا ہے۔ اب کیا کر رہی ہو۔"

"کچھ نہیں ابو' آپ کے لیے مچھلی فرائی کر رہی ہوں۔"

"میری بیٹی کو ہر وقت ابو کی فکر رہتی ہے۔ کبھی اپنی بھی فکر کر لیا کرو۔" ان کی بات سن کر وہ مسکرا کر بولی۔

"مجھے کیا ہوا ہے' ابو اچھی بھلی تو ہوں۔"

"اتنی زیادہ مچھلی فرائی کر لی۔ یہ کون کھائے گا۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

"ایسا کرتا ہوں' یہ تھوڑی سی نوفل کو دے آتا ہوں اور یہ تم فاریہ کو دے آؤ۔"

"ابو میں جاؤں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"تو کیا ہوا' یہ دو گھر چھوڑ کر تو اس کا گھر ہے۔ ساتھ اسے مل بھی آؤ گی وہ بہت شکوہ کرتی ہے کہ تم اس کے گھر نہیں جاتیں' چلو ایسا کرتا ہوں میں تمہیں گیٹ تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"جی میں کپڑے بدل لوں۔" اب دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی تو سبطین نے چائے کپوں میں ڈال کر ایک کپ نوفل کی طرف بڑھایا۔

"مچھلی آرہی ہے۔" سبطین چٹخارہ لے کر بولا تو نوفل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کتنے ندیدے ہو تم۔ کھانے کے ذکر پر یوں خوش ہوتے ہو جیسے کبھی کھانا کھایا ہی نہیں۔"

"کھانا تو کھاتا ہوں لیکن یہاں آکر اچھا کھانا کبھی کبھی ملتا ہے۔"

"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔" نوفل نے افسوس سے سرہلایا۔

"میں ذرا رحم دل شہزادی کو دیکھنے جارہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" نوفل سٹپٹایا۔

"یار سنا نہیں' وہ اپنی دوست کے گھر جارہی ہے تو ظاہر سی بات ہے' باہر نکلے گی۔ اسی بہانے میں اس کی شکل دیکھ لوں گا۔"

"سبطین یہ کیا پاگل پن ہے۔" نوفل غصے سے بولا۔

"لیکچر بعد میں دینا' ابھی میں جارہا ہوں۔" وہ بھاگ کر باہر گیا تھا لیکن کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود کوئی نظر نہیں آیا تو وہ مایوس ہو کر اندر آگیا۔

"دیکھ آئے رحم دل شہزادی کو۔" نوفل نے مسکرا کر اس کا اترا ہوا چہرہ تو وہ سر نفی میں ہلا کر رہ گیا۔

✡ ✡ ✡

"آج شرمین کہاں سے راستہ بھول گئی ہے۔" دروازہ ثمرہ بھابھی نے کھولا اور ـــــ اسے دیکھ کر حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"بس آپ لوگوں کی یاد آرہی تھی تو سوچا مل آؤں۔" وہ دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

"یہ کیا ہے۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو دیکھ کر پوچھا۔

"مچھلی فرائی کی تھی سوچا آپ لوگوں کے لیے لیتی جاؤں۔"

"او' یہ تو اچھا کیا۔" انہوں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی اور پلیٹ اٹھا کر مچھلی چکھنے لگیں۔

"بھابھی' فاریہ کدھر ہے۔"

"اس نے کہاں جانا ہے۔ یہیں ہو گی اپنی بلی کے ساتھ۔" فاریہ کے ذکر پر وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولیں شرمین منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگی جو مچھلی کھانے میں مصروف تھیں۔ ایک پیس کھانے کے بعد انہیں احساس ہوا وہ منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہی ہے۔

"کچن کی پچھلی طرف دیکھ لو' وہیں ہو گی۔"

"جی۔" وہ سرہلا کر کچن میں آگئی۔ پچھلا دروازہ کھول کر اس نے گلی میں جھانکا۔ گلی کے آخری کونے پر اسے فاریہ کی جھلک نظر آئی تو وہ اسی طرف چل پڑی۔

"ہاؤ۔" پاس جا کر اس نے زور سے آواز نکالی تو مگن انداز میں بی بی کو نہلاتی فاریہ ڈر کے مارے اچھل پڑی۔

"بدتمیز نہ ہو تو' ڈرا دیا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

"تمہیں دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔" وہ اسے مزید بھینچ کر بولی۔

"ہاں وہ تو مجھے اندازہ ہو رہا ہے' اب مجھے چھوڑ بھی دو۔" شرمین ہنستے ہوئے زبردستی اس سے الگ ہوئی۔

"یہ تم کیا اتنی سردی میں اس بے چاری بلی کو نہلا رہی ہو۔"

"کیا کروں' پتا نہیں کہاں سے کیچڑ میں منہ مار کر آگئی ہے۔ ساری کی ساری گندی ہو رہی تھی اور بھابھی کا تمہیں پتا ہے تو میں اسے لے کر یہاں آگئی۔ اب دیکھو کیسے چمک رہی ہے میری بی بی۔" اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا بلی کے لیے پیار دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

"تمہارے لیے مچھلی لے کر آئی تھی۔ راستے میں بھابھی مل گئیں تو انہیں دینا پڑی۔ جاؤ جا کر لے آؤ اس سے پہلے کہ ختم ہو جائے۔"

"او نو' تم نے ان کو کیوں دی۔" فاریہ کو شدید

افسوس ہوا۔
"تم امی کے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں پلیٹ لے کر ابھی آتی ہوں چلو فی فی۔" اس نے تیزی سے چلتے ہوئے بلی کو اشارہ کیا جو بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی تھی۔
"السلام علیکم آنٹی۔"
"ارے شرمین بیٹی آئی ہے۔" نصرت آنٹی اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھیں۔
"فاریہ سے نہیں ملیں۔"
"ملی ہوں آنٹی' وہ آرہی ہے۔" وہ کہہ کر ان کے قریب بیٹھ گئی تب ہی فاریہ پلیٹ لیے اندر داخل ہوئی۔
"امی دیکھیں شرمین فش لے کر آئی ہے۔"
"بیٹا تم نے کیوں زحمت کی۔" نصرت کے کہنے پر وہ مسکرا کر بولی۔
"آنٹی زحمت کی تو کوئی بات نہیں' مجھے پتا تھا فاریہ کو فش پسند ہے اس لیے لے کر آگئی۔"
"یہ ثمرہ کیوں بڑبڑا رہی ہے۔"
"کیونکہ میں ان کے منہ کا نوالہ چھین لائی ہوں۔"
"کیا مطلب؟" نصرت سمجھی نہیں۔
"یہ پلیٹ۔" فاریہ نے پلیٹ ہاتھ میں اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔
"ان کے پاس تھی اور شرمین یہ میرے لیے لائی ہے' اس لیے میں جا کر لے آئی۔" وہ مزے سے کھاتے ہوئے بولی۔
"حد کرتی ہو تم فاریہ!" نصرت نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
"بیٹا تم تو اس کی دوست ہو' تم سمجھاؤ اسے' کب چھوڑے گی یہ بچپنا۔ ثمرہ کو آگے موقع چاہیے ہوتا ہے اس کی شکایت کرنے کا اور یہ اسے مزید موقع دیتی ہے۔ وہ تنگ نظری کا مظاہرہ کرتی ہے تو اسے اگنور کرنا چاہیے لیکن یہ اگنور کرنے کے بجائے باقاعدہ مقابلے پر اتر آتی ہے۔"
"فاریہ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی۔"
"امی کو عادت ہو گئی ہے میری شکایت کرنے کی۔" وہ لاپروائی سے بولی۔
"تو تم ان کو موقع مت دیا کرو شکایت کرنے کا اگر بھابھی کچھ بولتی ہیں تو تم اگنور کر دیا کرو۔"
"کتنا اگنور کروں۔" اب کی بار فاریہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"جتنا ممکن ہو۔" شرمین کے کہنے پر اس نے سر جھٹکا۔
"چھوڑو یہ سب' چلو میں تمہیں برڈز دکھاؤں بھائی سے کہہ کر منگوائے ہیں۔"
"ارے اسے بیٹھنے تو دو۔" اس کا ہاتھ کھینچنے پر نصرت نے اسے ٹوکا لیکن اس نے شرمین کو اٹھا کر دم لیا۔
"کیسے لگے میرے برڈز۔" فاریہ کے پوچھنے پر شرمین نے پنجرے میں بند رنگ برنگے طوطوں کو

دیکھا۔

"پیارے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تمہیں جانوروں اور پرندوں سے اتنا پیار کیوں ہے۔"

"کیونکہ یہ انسانوں کی طرح اپنی زبان سے دوسروں کو تکلیف نہیں دیتے۔" شرمین نے ایک نظر اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا لیکن یہ ایک لمحے کے لیے تھا اگلے ہی پل وہ مسکرا رہی تھی۔

"تم سناؤ' تمہارے سپر اسٹار مسٹر نوفل کیسے ہیں۔"

"مجھے کیا پتا کیسے ہیں مسٹر سپر اسٹار۔"

"کیوں کیا ابھی تک بات نہیں ہوئی۔"

"نہیں اور نہ ہوگی۔"

"کیوں۔" فاریہ نے تعجب کا اظہار کیا۔

"ابو کے دوست یعنی سپر اسٹار کے والد آئے تھے ہمارے گھر لیکن انہوں نے کوئی بات نہیں کی جس کا مطلب ہے کوئی بات نہیں' ویسے بھی وہ میڈیا کا بندہ ہے' میری جیسی لڑکی کیسے اس کی چوائس ہو سکتی ہے۔" وہ کچھ آزردگی سے بولی۔

"ضروری نہیں میڈیا سے وابستہ ہر شخص فلرٹی ہو۔ تم کبھی اس سے ملی نہیں' اس نے تمہیں دیکھا نہیں' تو تم کیسے کہہ سکتی ہو تم اسے پسند نہیں آؤ گی۔ تم اتنی پیاری ہو کوئی تمہیں ریجیکٹ کر ہی نہیں سکتا۔"

"یہ تمہیں لگتا ہے کیونکہ میں تمہاری دوست ہوں۔" شرمین اس کی محبت پر مسکرا کر بولی۔

"ابو نے کسی رشتے والی کو بھی کہا ہے۔ پرسوں وہ بھی کوئی رشتہ لے کر آ رہی ہے۔"

"یعنی سیریسلی تم لوگوں نے وہاں سے بات ختم کر دی ہے۔"

"ہم نے ختم نہیں کی انہوں نے ہی بات نہیں کی۔" شرمین نے فاریہ کی تصحیح کی۔

"ہوں۔" فاریہ نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"ویسے انسان کو ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے اگر بات نبھا نہیں سکتے تو کرتے کیوں ہیں۔ لوگوں کی بیٹیاں مذاق ہیں کیا؟" فاریہ جذباتی ہو کر بولی تو شرمین مسکرا دی۔

"چھوڑو یار! یہ ایک بات تھی جو ختم ہو گئی۔"

"نہیں یار' کوئی بات ہے۔ پہلے اتنی دیر بات کیے رکھی پھر جب وقت آیا تو خاموشی اختیار کر لی تو اپنے بیٹے کو یہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ مفت میں آ کر رہ رہا ہے۔" اس کے جلے ہوئے انداز پر شرمین ہنس پڑی تھی۔

"ابو نے اسے اس وجہ سے انیکسی میں جگہ نہیں دی تھی بلکہ اس وجہ سے رہنے کی اجازت دی تھی کہ وہ ابو کے دوست کا بیٹا ہے اور تم غصہ کرنا بند کرو۔"

☼ ☼ ☼

آج چھٹی کا دن تھا اور وہ دونوں گھر پر تھے اور کافی دنوں بعد سورج نے اپنی شکل دکھائی تھی تو کنیز نے واشنگ مشین لگائی تھی۔ اب وہ کپڑے دھونے کے ساتھ سُر بھی بکھیر رہی تھی۔ سبطین لیپ ٹاپ پر اور نوفل کچن میں کام کرتے ہوئے کنیز کی موسیقی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"بھائی جی' میں نے کپڑے دھو دیے ہیں۔ اب ہنڈیا بنانے لگی ہوں۔" کنیز کی تفصیل پر سبطین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ کپڑے چھت پر ڈال آؤ۔" اس نے پوچھا نہیں سیدھا سیدھا حکم دیا تھا۔

"میں؟" سبطین کو جھٹکا لگا تھا پھر سنبھل کر بولا۔

"تم ایسا کرو نوفل سے کہو' میں آفس کا بڑا ضروری کام کر رہا ہوں۔"

"اچھا جی۔" وہ منہ بنا کر کچن کی طرف مڑ گئی جہاں نوفل کھڑا اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔

"نوفل بھائی' ذرا کپڑے اوپر ڈال آئیں۔ آج مجھے دیر ہو گئی ہے۔ ابھی مجھے ہنڈیا بھی بنانی ہے۔" کنیز نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ نوفل اسے انکار ہی نہیں کر سکا۔

چھت پر لگی رسی پر کپڑے پھیلا کر وہ وہیں دھوپ میں کھڑا ہو گیا۔ نرم گرم دھوپ جسم کو سکون دے رہی تھی۔ تب ہی قدموں کی آہٹ پر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ آسمانی قمیص اور سفید شال میں وہ جو بھی تھی اس خوب صورت صبح کا حصہ لگ رہی تھی۔ وہ نظریں ہٹائے بغیر اسے دیکھتا رہا اس لڑکی کی نظر اب تک اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنے دھیان میں چلتی ہوئی اس کے قریب آ رہی تھی تب ہی اس نے سامنے دیکھا اور چونک کر رک گئی۔ اس کی آنکھوں کا پہلا تاثر حیرت تھا لیکن اگلے ہی پل وہ رخ موڑ گئی تھی نوفل کو ایک دم ہوش آیا تھا۔

"سنیں۔" وہ رخ موڑے بغیر رک گئی تھی۔

"آپ خاور انکل کی بیٹی ہیں نا۔"

"جی۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"میں نوفل ہوں' انیکسی میں رہتا ہوں۔"

"جی۔" وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

"مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا' اس دن آپ نے میرے لیے کھانا بھجوایا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی جبکہ نوفل کو لگا صبح کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" وہ نیچے آیا تو سبطین نے اس کی شکل دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"تو منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔" نوفل نے کوئی جواب نہیں دیا تو سبطین بھی خاموش ہو گیا۔

"آج میں نے اس کو دیکھا۔" تب ہی نوفل پھر سے بولا۔

"کسے؟" سبطین لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔

"رحم دل شہزادی کو۔"

"اچھا واقعی' کہاں؟" سبطین کام چھوڑ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"چھت پر۔"

"پھر کیسی ہے۔"

"خوب صورت' اجلی صبح کی طرح۔" نوفل کا انداز کھویا کھویا تھا جس پر سبطین ابرو اچکا کر رہ گیا۔

"بڑی شاعرانہ اصطلاح استعمال کی ہے' اجلی صبح کی طرح۔" وہ نوفل کے الفاظ دہراتا ہوا بولا۔

"یار! لگتا ہے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے ابو کو منع نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"واہ بھئی' ایک جھلک میں اتنی کایا پلٹ۔" سبطین نے اس کا مذاق اڑایا جس کا نوفل نے برا مانا تھا۔

"میں تمہیں دل کی بات بتا رہا ہوں اور تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"اور سائرہ بی بی کا کیا ہو گا۔"

"اس کا یہاں کیا ذکر؟" نوفل بھنا کر بولا۔

"اسی کا تو ذکر ہے۔ اسی کی وجہ سے تم نے انکل کو انکار کیا اور ویسے بائے دا وے وہ جو تم نے رحم دل شہزادی میں اتنی خامیاں نکالی تھیں' وہ بھول گئے تم۔"

"یاد ہے مجھے سب۔" نوفل جل کر بولا۔

"تم سے بات کرنا فضول ہے۔" وہ اٹھ کر کچن میں آ گیا جہاں کنیز کام کر رہی تھی۔

"کنیز' اس دن جس نے میرے لیے کھانا بھیجا تھا کیا نام بتایا تھا تم نے۔"

"شرمین باجی نے کھانا بھجوایا تھا۔"

"اچھا وہ کرتی کیا ہیں۔"

"کچھ نہیں' باجی گھر پر ہوتی ہیں۔"

"ہوں۔" اس نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

وہ دونوں اکٹھے آفس سے گھر پہنچے تھے گاڑی پارک کر کے گیٹ کی طرف بڑھے تب ہی خاور انکل گیٹ سے نکلے تھے وہ دونوں رک گئے۔

"کیسے ہیں انکل۔" نوفل نے سب سے پہلے بتیسی کی نمائش کی تھی۔

"ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو میاں۔"

"ہم بھی ٹھیک ہیں انکل! آپ کہیں جا رہے

ہیں۔" اب کی بار سبطین نے پوچھا تھا۔

"ہاں کچھ سامان لانا تھا تو مارکیٹ جا رہا تھا۔"

"لائیں انکل! ہم لے آتے ہیں۔" نوفل نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"تم لوگوں کو زحمت ہوگی۔"

"زحمت کیسی انکل! گاڑی میں جانا ہے۔"

خاور صاحب تھوڑی پس و پیش کے بعد مان گئے تھے۔

"اتنا زیادہ بیکری کا سامان! لگتا ہے' کوئی خاص مہمان آ رہا ہے۔" وہ بیکری سے سامان لے کر نکلے تو سبطین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"خاص سے تمہارا کیا مطلب ہے۔" نوفل نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کوئی رشتہ دیکھنے بھی آ سکتا ہے۔"

"تمہیں کیا الہام ہوا ہے۔" نوفل نے برا مان کر کہا۔

"آثار بتا رہے ہیں مائی ڈیئر! ویسے بھی جہاں بیری ہو' وہاں پتھر تو آتے ہیں۔"

"ان کے گھر کون سی بیری ہے۔" نوفل نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"کند دماغ! محاورہ بول رہا ہوں۔ اب تم نے منع کر دیا تو انہوں نے کسی سے تو رشتہ کرنا ہے اپنی بیٹی کا۔"

نوفل نے اب کی بار کوئی جواب نہیں دیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ جب وہ گھر پہنچے تب ہی ایک دوسری گاڑی بھی آ کر رکی تھی جس میں دو عورتیں اور دو مرد نکلے تھے۔ ان کے اندر جانے کے بعد نوفل نے بیل دی تو کنیز باہر آئی تھی۔

"یہ کون لوگ ہیں۔" شاپرز پکڑاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"شرمین باجی کے رشتے کے لیے آئے ہیں۔" کنیز کے کہنے پر نوفل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ سبطین کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

"دیکھ لو' میں نے کہا تھا نا۔" سبطین نے دانت نکال کر کہا تو نوفل کا دل چاہا اس کے دانت توڑ دے۔

اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اسے اتنا برا کیوں لگ رہا تھا۔ اندر آ کر نوفل بے چینی سے ادھر سے ادھر پھرتا رہا۔ سبطین صوفے پر نیم دراز کب سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا جو کبھی کچن میں جا رہا تھا' کبھی کمرے میں۔

"نوفل! تمہیں آخر پریشانی کس بات کی ہے۔" آخر اس نے پوچھ لیا۔

"یار! وہ رشتے والے کیوں آئے ہیں' اس کا رشتہ طے نہ ہو جائے۔" وہ پریشانی سے بولا تو سبطین حیران رہ گیا۔

"تو واقعی سیریس ہے اس کے بارے میں۔"

"تو تجھے کیا لگتا ہے' مجھے پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے جو میں سارے گھر میں چکراتا پھر رہا ہوں۔"

"پاگل ہو تم بھی یار! کہاں وہ تمہیں پسند نہیں تھی اور کہاں ایک جھلک کے بعد تم اسے کھونے سے ڈر رہے ہو۔"

"تمہارے پاس کوئی حل ہے تو منہ کھولو ورنہ منہ بند کر لو۔" وہ جل کر بولا تو سبطین شرارتی انداز میں مسکرا دیا۔

"اس بات کا بہترین حل انکل کے پاس ہے' وہی ہیں جو تمہاری نیا پار لگا سکتے ہیں۔"

"اب کس منہ سے ان سے بات کروں۔"

"اسی تھوبڑے کے ساتھ بات کر جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گردن کے اوپر فٹ کیا ہے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے شاہد صاحب کا نمبر ملایا تھا۔

"ہاں برخوردار! تمہیں کہاں سے باپ کی یاد آ گئی۔" ان کے طنزیہ انداز پر نوفل نے بے چارگی سے سبطین کا منہ دیکھا۔

"ابو! یاد تو آپ کو روز کرتا ہوں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے شروع کرے پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"ابو! خاور انکل آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔"

"یاد تو میں بھی اسے کرتا ہوں لیکن سوچتا ہوں' کس منہ سے اس سے بات کروں' تم نے مجھے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔" ان کی بات سے

نوفل کو بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔
"ابو! اسی لیے فون کیا ہے آپ نے ان کی بیٹی کی بات کی تھی۔ مجھے منظور ہے آپ ان سے بات کر لیں۔" وہ جلدی سے بولا مبادا وہ کوئی اور بات نہ کر دیں۔
"اب کیا بات کروں جس وقت کرنا تھی' اس وقت تم نے منع کر دیا۔" وہ بھی اس کے باپ تھے۔
"ابو اب کر لیں نا پلیز۔" کہہ کر اس نے جلدی سے فون بند کر دیا اور گہرا سانس لیا۔ جیسے کوئی بڑا بوجھ اترا ہو۔ جبکہ صوفے پر لیٹا سبطین اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ظہر کی نماز کے بعد وہ ستانے لیٹ گئی تھیں تب ہی دروازے پر دستک دے کر نوید اندر داخل ہوا۔
"امی! آپ سو تو نہیں رہی تھیں۔" انہیں لیٹا دیکھ کر وہ وہی رک گیا۔
"نہیں' ویسے ہی لیٹی تھی تم آؤ۔" وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔ وہ آکر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ نصرت غور سے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگیں جو یقیناً ان سے کوئی بات کرنے آیا تھا۔ لیکن کیا بات۔ یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔
"امی! فاریہ کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے۔"
"فاریہ کے بارے میں کیا سوچنا ہے۔" وہ حیران ہو کر بولیں۔
"میرا مطلب ہے' اس کی شادی کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟ کیا اس کی شادی نہیں کرنی۔"
"کرنی ہے کیوں نہیں کرنی پر کوئی اچھا رشتہ تو ہو۔"
"امی ایک رشتہ ہے تو۔" کچھ دیر بعد وہ رک رک کر بولا۔
"کون۔" وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔
"ثمرہ کا بھائی ناصر۔" نصرت نے گہرا سانس لیا انہیں نوید سے یہی امید تھی۔

"تم سے ثمرہ نے کہا ہو گا۔" انہوں نے سوال کیا۔
"ثمرہ نے پہلے بھی بات کی تھی۔ کل رات کو پھر کی ہے' وہ کافی زور دے رہی ہے۔"
"اس کی چھوڑو۔ تم اپنی بتاؤ۔ تمہیں ناصر' فاریہ کے لیے ٹھیک لگتا ہے۔" ان کے سوال پر کچھ دیر کے لیے وہ جواب ہی نہیں دے سکا۔
"ناصر میں ایسی کیا خوبی ہے جو میں اپنی بیٹی اس کے ساتھ بیاہ دوں۔ جاب وہ کوئی کرتا نہیں۔ کوئی ٹھکانہ اس کا نہیں۔ ہر وقت تو وہ یہاں پایا جاتا ہے شادی کے بعد وہ کہاں رکھے گا اپنی بیوی کو اور کہاں سے کھلائے گا۔ اب یہ تو نہیں کہ ناصر ثمرہ کا بھائی ہے تو میں اپنی بیٹی کنویں میں دھکیل دوں۔" وہ ناراضی سے بولیں۔
"امی! میں نے ویسے ہی ایک بات کی تھی۔" نوید شرمندگی سے بولا۔
"بات کرنے سے پہلے سوچ ہی لیتے' کیا بات کرنے لگے ہو اور کس کے بارے میں کرنے لگے ہو۔ فاریہ تمہاری بہن ہے جس کو تم نے بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔" نوید سر جھکا کر رہ گیا۔
"امی! ثمرہ بار بار کہہ رہی تھی تو میں نے بات کر لی۔" نوید بات کر کے شرمندہ تھا۔
"ثمرہ تمہیں کنویں میں چھلانگ لگانے کے لیے کہے گی تو تم کنویں میں چھلانگ لگا دو گے۔" نوید سر جھکا کر رہ گیا۔
"میں نے رشتہ کروانے والی عورت سے کہہ رکھا ہے اگر تمہاری بیوی ہونے دے تو وہ پچھلے دنوں ایک رشتہ لے کر آئی تھی لیکن تمہاری بیوی نے پتا نہیں ان سے کیا کہا' وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئے۔ اچھا ہوا تم نے خود بات کر لی۔ اپنی بیوی کو سمجھاؤ' یہ فضول حرکتیں چھوڑ دے۔ ایسی اوچھی حرکتیں کرنے سے میں اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے نکمے بھائی سے نہیں کرنے والی۔"
"جی امی! آپ غصہ نہ کریں میں اسے سمجھا دوں گا۔" اور لگتا تھا نوید نے کچھ زیادہ اچھی طرح بیوی کو سمجھا دیا تھا۔ شام تک اس کا موڈ بہت خراب تھا کچن

میں کام کرتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑاتی رہی تھی۔

"اپنی بیٹی کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ کہیں کی شہزادی ہے نا' جس کے لیے کوئی شہزادہ اترے گا ـــــ میرا بھائی نکما ہے تو ان کی بیٹی جیسے بڑی حور پری ہے۔ دیکھتی ہوں کون سا آفیسر ملتا ہے میرے بھائی کو بھی کوئی رشتوں کی کمی نہیں۔" فاریہ کتنی دیر تک ممو کی بڑبڑاہٹ سنتی رہی پھر تنگ آکر اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

"یہ بھابھی کو کیا ہوا ہے۔ مسلسل بولتی جارہی ہیں اور قصیدہ بھی میری شان میں پڑھ رہی ہیں حالانکہ آج تو میرا ان کا سامنا بھی نہیں ہوا۔" وہ نصرت کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔

"دوپہر میں نوید آیا تھا ناصر کا رشتہ لے کر' میں نے بھی اچھی خاصی سنائیں اسے' دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا اور اس کی بیوی کی حرکت بھی بتائی۔ اس نے جا کر کچھ کہا ہو گا تب ہی جلے توے پر بیٹھی ہے تمہاری بھابھی۔"

"اوہ! تو آپ نے بھائی کو منع کر دیا نا۔"

"تو اور کیا نہ کرتی۔"

"نہیں امی! آپ نے بہت اچھا کیا۔" فاریہ نے جیسے شکر ادا کیا۔

"اب تم کدھر جارہی ہو۔"

"بھابھی تو اب رات تک یونہی بولتی رہیں گی۔ میں شرمین کی طرف جارہی ہوں۔" وہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ وہ بی بی کو گود میں اٹھائے گیٹ میں داخل ہونے لگی تھی کہ بی بی نے چھلانگ لگا دی' وہ اسے پکڑنے کے لیے آگے جھکی جب زور سے اس کا سر کسی سے ٹکرایا۔ اسے صحیح معنوں میں دن میں تارے نظر آگئے مقابل کو بھی ٹکر زور سے لگی تھی تب ہی وہ بلبلایا تھا۔

"نظر نہیں آتا جو پاگلوں کی طرح ٹکر مارتے پھر رہے ہیں۔" غلطی فاریہ کی تھی پھر بھی وہ سر کو تھامتے ہوئے اگلے بندے پر چڑھ دوڑی اور سامنے والے پر نظر پڑتے ہی اس کا غصہ اور سوا ہو گیا۔ اس کے سامنے ماتھے پر بل ڈالے سبطین کھڑا تھا۔

"نظر تو مجھے آپ کی کمزور لگتی ہے بلکہ نظر کے ساتھ دماغ میں بھی کچھ خلل محسوس ہوتا ہے جو ہمیشہ آپ لوگوں سے ٹکراتی پھرتی ہیں۔"

"ٹکراتی میں ہوں۔" انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"تو اور کیا۔"

"میں اپنی بلی کو پکڑ رہی تھی' آپ سامنے آگئے۔ آپ ہٹیں سامنے سے۔"

سبطین نے کچھ حیرت سے اس بددماغ لڑکی کو دیکھا جو بلی کو اٹھا کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ پارک میں نکل گیا۔ کچھ دیر پارک میں بیٹھ کر بچوں کو کھیلتے دیکھتا رہا اور کچھ دیر بعد وہاں سے بور ہو کر اٹھ گیا۔

واپسی میں لان میں کوئی نہیں تھا' البتہ بلی بڑے مزے سے لان میں مٹر گشت کر رہی تھی۔ وہ اندر جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے مڑ کر بلی کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور پھر ان ہی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا وہ مسکرا کر بلی کی طرف بڑھا۔ وہ جب اندر آیا تو نوفل صوفے پر نیم دراز تھا۔ سبطین پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر اٹھا تھا۔

"یہ کس کی بلی لے کر آئے ہو۔"

"اپنی ہی سمجھو۔" سبطین نے پیار سے بلی کی پشت کو سہلایا۔

"پتا بھی تو چلے۔" نوفل اب غور سے بلی کو دیکھ رہا تھا جو سبطین کے ہاتھوں میں مطمئن ہو کر بیٹھی تھی۔

"میں باہر سے آرہا تھا تو یہ راستے میں کھڑی تھی۔ کہنے لگی' میں بھوکی ہوں۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو تو میں اسے لے آیا۔"

"واہ۔" نوفل نے داد دی۔

"اب تم اتنے جینئس ہو گئے کہ بلی کی زبان بھی سمجھنے لگے ہو۔"

"بھئی' تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔ اتنی پیاری اور بے ضرر سی بلی ہے۔" سبطین نے بلی کو نیچے

اتار دیا تو وہ چلتی ہوئی نوفل کے قدموں کے پاس آکر چکر لگانے لگی۔

"لگتا ہے بلی کو تم پسند آئے ہو۔" سبطین کے شرارتی انداز پر نوفل سر جھٹک کر بلی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سبطین مسکرا کر کچن میں چلا گیا۔ واپسی میں اس کے ہاتھ میں پیالہ تھا جس میں دودھ تھا۔ اس نے پیالہ زمین پر رکھا بلی بھاگتی ہوئی آئی تھی اور دودھ پینے لگی۔ سبطین چوکڑی مار کر زمین پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے تمہاری مالکن کافی ظالم عورت ہے۔ تمہیں کھانے پینے کو نہیں دیتی تب ہی تو تم اتنی کمزور ہو۔" نوفل نے حیرت سے موٹی تازی بلی کو دیکھا جو کسی زاویے سے کمزور نہیں لگ رہی تھی۔ بلی نے پیالہ خالی کر دیا تھا۔ اب وہ مزے سے کمرے میں گھوم رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

فاریہ حواس باختہ سی اندر داخل ہوئی تو شرمین حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔"

"بی بی نہیں مل رہی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"نہیں ہو گی کہاں جائے گی۔" شرمین بھی اس کے ساتھ باہر لان میں نکل آئی۔ انہوں نے سارا گھر چھان مارا۔

بی بی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ تھک کر فاریہ رونے لگی تھی۔ شرمین نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"مل جائے گی فاریہ! اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے گھر چلی گئی ہو۔" شرمین کے کہنے پر فاریہ نے تیزی سے آنسو صاف کیے۔

"میں دیکھ کر آتی ہوں۔" وہ گھر آئی تو کنیز کپڑے دھو رہی تھی۔

"کنیز! تم نے بی بی کو دیکھا؟"

"نہیں باجی! وہ تو آپ کے ساتھ گئی تھی۔"

"ہاں میرے ساتھ گئی تھی۔ شرمین کے گھر تھی

وہاں سے پتا نہیں کہاں چلی گئی۔"
فاریہ نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔"پتا نہیں کہاں ہوگی۔"
باجی رو ئیں نہیں مل جائے گی چلیں میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" ان دونوں نے کالونی کے ہر گھر میں پتا کیا۔پارک بھی دیکھ لیا۔دوپہر سے شام ہوگئی لیکن پی نی کا کچھ پتا نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

نوفل کب سے سبطین کو دیکھ رہا تھا۔جو بلی کی ناز برداریوں میں مصروف تھا اور تھوڑی دیر بعد بلی سے باتیں بھی کر رہا تھا۔تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔نوفل نے ایک نظر سبطین کو دیکھا جو بلی کو گود میں لیے پتا نہیں کون سی لوریاں سنا رہا تھا۔
"اگر کوئی بلی کا پوچھے تو نہ بتانا۔"
"کیوں؟" نوفل حیران ہو کر بولا۔
"بس کہا ہے ناں۔" وہ بلی کو اٹھا کر اندر لے گیا۔
نوفل نے حیران ہوتے ہوئے دروازہ کھولا۔سامنے کنیز اور فاریہ کھڑی تھیں۔
"نوفل بھائی! یہاں کوئی سفید رنگ کی بلی تو نہیں آئی؟" نوفل نے گڑبڑا کر پیچھے دیکھا جہاں سے سبطین آرہا تھا۔
"نہیں' یہاں تو کوئی بھی نہیں آئی۔کیوں خیریت ہے۔" سبطین نے بھولا بن کر پوچھا۔
"فاریہ باجی کی بلی تھی۔ادھر لان میں گھوم رہی تھی' وہاں سے پتا نہیں کہاں چلی گئی۔" سبطین نے کنیز سے نظر ہٹا کر فاریہ کو دیکھا تو چونک گیا۔رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔
"تھینک یو' آپ کو ڈسٹرب کیا۔" وہ مایوس ہو کر بولی۔ان کے جاتے ہی نوفل نے سبطین کی کلاس لی تھی۔
"تمہیں شرم نہیں آتی کسی کی بلی چھپاتے ہوئے۔دیکھ نہیں رہے اس لڑکی کا رو رو کر کتنا برا حال ہے۔"
"اچھی بات ہے' محترمہ کا تھوڑا دماغ ٹھکانے لگے۔اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتی ہیں۔" سبطین نے جیسے نوفل کی بات کو ہوا میں اڑا دیا۔
"کدھر ہے بلی۔" نوفل کے پوچھنے پر سبطین چونک کر سیدھا ہوا۔
"اسے تو میں باتھ روم میں بند کر آیا تھا۔" وہ ایک دم اٹھ کر بھاگا۔
واپسی میں بلی اس کے ہاتھوں میں تھی۔
"اتنی تیز ہے' پانی کے ٹب میں چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔" سبطین نے بلی کے بالوں کو جھاڑتے ہوئے بتایا۔
"سبطین یار! اچھا نہیں لگتا۔پتا نہیں یہ بلی اس لڑکی کے لیے کتنی خاص ہے جو وہ اتنا رو رہی تھی۔اسے واپس کر آؤ۔"
یار! اس لڑکی نے بہت دفعہ میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔"
"چلو یار! تم اگنور کر دو' بلی واپس کر دو۔" سبطین نے برا سا منہ بنایا۔پہلے جا کر اس نے باہر جھانکا' وہاں کوئی نہیں تھا پھر بلی کو اٹھا کر تیزی سے باہر نکلا وہ دونوں پارک کی طرف جا رہی تھیں۔
"ایکسکیوز می۔" کی آواز پر فاریہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پی نی کو سبطین کی گود میں دیکھ کر وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی تھی۔
"یہ آپ کو کہاں سے ملی؟" اس نے سبطین سے پوچھا۔
"یہ وہیں لان میں تھی' باہر نکلا تو یہ وہیں سیر کر رہی تھی۔"
"ہمیں تو نظر نہیں آئی تھی۔" کنیز نے مشکوک نظروں سے سبطین کو دیکھا۔
"تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہے کنیز!" سبطین نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ۔"
"سبطین نام ہے میرا۔" اس کے شکریہ ادا کرنے پر سبطین نے اپنا تعارف کروایا۔

"تھینک یو سبطین۔" فاریہ اب کی بار مسکرا کر بولی تو سبطین کی نظر جیسے اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئی تھی۔

"لگتا ہے' آپ کو یہ بلی بہت پیاری ہے۔" اس کی خوشی دیکھ کر سبطین کو پوچھنا پڑا تھا۔

"اس کا نام فی فی ہے اور یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ میری سالگرہ پر میرے پاپا نے مجھے گفٹ کی تھی۔ یہ میرے پاس ان کی نشانی ہے' اس وجہ سے یہ مجھے بہت پیاری ہے۔" ایک پل کے لیے سبطین کو اپنی حرکت پر شرمندگی ہوئی تھی۔

"ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔" فاریہ نے مسکرا کر ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ سبطین کو وہ مسکراتی ہوئی نہ جانے کیوں اچھی لگی۔ اس کو اس کی ہر بد تمیزی بھول گئی بس یہی یاد رہا' وہ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں آئی تو خاور صاحب فون پر مصروف تھے۔ وہ بیٹھ کر ان کے فری ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ فون رکھ کر انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"کس کا فون تھا ابو۔"

"شاہد کا فون تھا۔"

"خیریت تھی؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا' کہہ رہا تھا' اس دن بات کرنے آیا تھا لیکن کسی وجہ سے نہیں کی۔ اب وہ لوگ بات کرنے آنا چاہتے ہیں۔" شرمین خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میں نے منع کر دیا۔" کہہ کر انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"شاہد کو میں نے بتا دیا کہ تمہاری بات طے کر دی ہے' میں نے ٹھیک کیا نا۔"

"جی ابو۔" وہ سر جھکا کر بولی تو وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"نوفل مجھے پسند ہے لیکن اب میں ان لوگوں سے بات کر چکا ہوں۔ وہ لوگ بھی اچھے لگ رہے ہیں۔ لڑکے کا اپنا کاروبار ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں' ویسے بھی نوفل کا ٹی وی میں کام کرنا مجھے پسند نہیں پھر بھی سمجھ نہیں پا رہا میں نے ٹھیک کیا یا غلط۔ شاہد کو منع کر کے میرا دل برا ہو گیا ہے۔" وہ کہہ کر پیشانی مسلنے لگے تو شرمین اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔

"ابو! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے' وہ ٹھیک ہے۔"

"تم خوش ہو نا۔" وہ ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"جی ابو۔" وہ نظریں جھکا کر بولی تو خاور صاحب سر ہلا کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ خاموشی سے دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔

"تمہاری وجہ سے اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل گئی۔ پتا ہے' مجھے کتنی شرمندگی ہوئی خاور سے بات کرتے ہوئے۔ کیا سوچتا ہو گا وہ' پہلے بات کی پھر مکر گئے' اب پھر آ گئے۔ اس نے اپنی بیٹی کی بات طے کر دی ہے۔ اب ظاہر ہے ہم نے نہیں کی تھی' اس نے کہیں تو کرنی تھی پر مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے وہ بچی بہت پسند آئی تھی اور ایک بات۔" وہ تیزی سے بولی۔

"میں تمہیں منع کرتا تھا ٹی وی میں کام کرنے سے' دیکھ لو' خاور نے بھی یہی کہا اسے تمہارا یہ کام پسند نہیں شاید یہ وجہ بھی ہے اس کے انکار کی۔" وہ ان کی ساری گفتگو خاموشی سے سنتا رہا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔

"اب کچھ بولو گے بھی یا نہیں۔"

"کیا بولوں اب۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ اس کا لہجہ محسوس کر کے وہ خاموش ہو گئے۔

"تمہیں افسوس ہوا ہے؟" شاہد صاحب اس سے پوچھ رہے تھے' وہ اب بھی خاموش رہا تھا پھر بولا۔

"ابو! میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے تھے انکل۔" کب سے خاموشی سے دیکھتا سبطین نوفل سے پوچھنے لگا۔

"اس کی بات کہیں اور طے ہو گئی ہے۔"
"اب۔" سبطین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو فون سننے کے بعد بالکل خاموش ہو گیا تھا۔
"میرا خیال ہے، تمہیں خاور انکل سے بات کرنی چاہیے۔"
"تمہیں، اب یہ مناسب نہیں لگتا۔" نوفل نے سبطین کی رائے مسترد کر دی اور خود اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں نے سوسائٹی کا کلب جوائن کیا تھا۔ سبطین نوفل کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے زبردستی اسے ساتھ لے آیا تھا۔ وہاں ان کی ملاقات فاریہ سے ہوئی، وہ بھی اس کلب کی ممبر تھی۔
"کیسی ہیں آپ؟" اسے دیکھ کر سبطین خود ہی اس کی طرف آگیا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں۔"
"اللہ کا شکر ہے، آپ کی فی فی کیسی ہے۔ اب تو آپ کو بتائے بغیر کہیں نہیں گئی۔" سبطین کی بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"نہیں، میرے ساتھ ہے۔ وہ دیکھیں۔" اس نے پاس پھرتی فی فی کی طرف اشارہ کیا۔
"لگتا ہے یہ آپ کی بیسٹ فرینڈ ہے۔"
"جی کہہ سکتے ہیں۔" وہ فی فی کو گود میں اٹھاتے ہوئے بولی۔
"سنیں۔"
"جی۔" وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
"آپ کہیں انگیجڈ تو نہیں؟"
"کیوں؟" فاریہ نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔
"جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں۔" سبطین نے مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔
"آپ جنرل نالج پر نہیں، کوئی کام کاج کرنے پر غور کریں۔" سبطین سر کھجا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" خاور صاحب نے پریشانی سے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا جن کے بیٹے کے ساتھ کچھ دن پہلے انہوں نے شرمین کی بات طے کی تھی۔
"بھائی جی! سچ بات کہنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔ میرا بیٹا نیا کاروبار شروع کرنا چاہ رہا ہے۔ اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے، کل کو شادی ہوتی ہے تو جو آپ کا ہے، وہ آپ کی بیٹی کا ہی ہو گا تو جو آپ نے بعد میں دینا ہے، وہ آپ ابھی دے دیں، ہمیں بھی فائدہ ہو جائے گا۔"
"یہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، جو بھی میرا ہے میری بیٹی کا ہے لیکن پہلے سے مطالبہ کرنا کیا مناسب لگتا ہے۔"
"بھائی صاحب! مناسب لگا ہے تو آپ سے کہہ رہے ہیں۔" وہ خاتون شرمندہ ہونے کو تیار نہیں تھیں۔
"آپ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔"
"سوچ لیں بھائی صاحب! لیکن انجام کے ذمے دار آپ خود ہوں گے اگر آپ کو ہماری شرط منظور نہیں تو آپ اس رشتے سے انکار سمجھیں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بات کر کے کھڑی ہو گئیں جبکہ خاور صاحب سے کتنی دیر تک اپنی جگہ سے ہلا نہیں گیا۔

☼ ☼ ☼

انہیں اپنے جلد بازی کے فیصلے پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس رشتے کے دوران نوفل کا رشتہ بھی آیا تھا جسے انہوں نے سوچے سمجھے بغیر انکار کر دیا تھا۔ اگر انہیں ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ یہ لوگ اتنے لالچی ہیں تو وہ کبھی شرمین کا رشتہ وہاں طے نہ کرتے۔ انہوں نے بہت سوچنے کے بعد ان لوگوں کو انکار کہلوا دیا تھا۔ جواباً وہ خاتون گھر آ کر ان کو اتنی باتیں سنا کر گئی تھیں کہ وہ شرمین کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں اپنا آپ شرمین کا مجرم لگنے لگا تھا جنہوں نے جائیداد ان کے نام نہ کر کے شرمین کی زندگی خراب کر دی تھی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ وہ کب سے شرمین کو دیکھ رہے تھے جو سارے کام مکمل خاموشی سے کر رہی تھی۔ خاموش طبع تو وہ پہلے بھی تھی لیکن اس دن کے بعد اس کی چپ زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ انہیں عجیب سے پچھتاوے کا احساس ہونے لگا۔ اچانک انہیں اپنے دل میں درد محسوس ہوا۔ شرمین کچن سے باہر نکلی تو اس کی نظر خاور صاحب پر پڑی جن کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے اپنے سینے کو مسل رہے تھے۔

"ابو! ابو جی کیا ہوا آپ کو۔" وہ بھاگ کر ان کے پاس آئی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ان کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ شرمین گھبرا کر سیدھی ہوئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔

"ابو! کیا ہو رہا ہے۔ کچھ تو بولیں۔" وہ خود بھی ان کا سینہ سہلانے لگی۔ لیکن اب ان کا سانس بھی اکھڑنے لگا تھا۔ وہ الٹے قدموں باہر کی طرف بھاگی۔ اب وہ انیکسی کا دروازہ بجا رہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح دروازے کو پیٹنے لگی۔ نوفل نے غصے سے دروازہ کھولا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

"آپ۔" وہ حیران ہوا۔

"ابو کو پتا نہیں کیا ہوا ہے' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ نوفل پریشانی سے اس کے پیچھے بھاگا۔ جب وہ اندر آیا خاور صاحب بے ہوش ہو چکے تھے۔ شرمین کی چیخ نکل گئی تھی۔ نوفل نے ان کی نبض ٹٹولی جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔ وہ سبطین کو بلانے بھاگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انہیں ہاسپٹل لے کر جا رہے تھے۔

اسے مسلسل روتے اور پریشان دیکھ کر نوفل کو اس کے پاس آنا پڑا۔

"ڈاکٹر انکل کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ابو ٹھیک ہو جائیں گے نا۔" وہ روتے ہوئے پوچھنے لگی نوفل کو اس پر بے حد ترس آیا تھا۔ اسے بیک وقت اس پر پیار بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔

"وہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گے' آپ بیٹھ جائیں۔"

اس نے بنچ کی طرف اشارہ کیا وہ مسلسل تین گھنٹوں سے کھڑی تھی۔ تب ہی سبطین چائے کے ساتھ سینڈوچ لے آیا۔ اس کی طرف کپ اور سینڈوچ بڑھایا تو اس نے انکار کر دیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک نہیں پھر بھی کھانا پڑے گا۔" نوفل نے زور دے کر کہا تو شرمین نے ایک نظر اسے دیکھ کر کپ اور سینڈوچ تھام لیا۔

"ویسے اچانک انکل کو ہوا کیا تھا' کوئی پریشانی تھی؟" سبطین اس سے پوچھ رہا تھا۔

"پریشانی۔" اس نے زیر لب دہرایا اور ایک نظر دونوں کو دیکھ کر سر نفی میں ہلایا۔ خاور صاحب کو ہوش آ گیا تھا' ان کو انجائنا پین ہوا تھا اور اب انہیں کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ نوفل اور سبطین نے ان کا اتنا ساتھ دیا تھا کہ خاور صاحب ان کے ممنون ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ گھر میں اکیلی تھی' ابھی کھانا تیار کر کے اسے ہاسپٹل جانا تھا جب ڈور بیل کی آواز پر وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ اس وقت عموماً کوئی آتا نہیں تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ گیٹ کے سوراخ سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ باہر بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی کھڑا تھا جسے دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی۔ بیل دوبارہ ہوئی تھی۔ تب ہی بیل کی آواز سن کر نوفل باہر نکل آیا تھا۔ اسے یوں گیٹ کے سامنے کھڑے دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔

"کیا بات ہے' آپ گیٹ کیوں نہیں کھول رہیں۔" وہ واقعی حیران ہوا تھا۔

"باہر ایک آدمی ہے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ نوفل نے ایک گہری نظر اس کی گھبرائی صورت پر ڈالی اور مسکرا دیا۔

"آپ جائیں' میں دیکھ لیتا ہوں۔" وہ تیزی سے

اندر کی طرف بڑھی تھی۔
"جی فرمایئے۔" نوفل نے آنے والے کو سر سے پیر تک دیکھ کر پوچھا۔ وہ شخص اس کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔
"خاور صاحب سے ملنا تھا۔"
"وہ تو گھر پر نہیں' مجھے بتائیں ان سے کیا کام ہے آپ کو۔"
"آپ کون ہیں' پہلے تو کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔"
"میں خاور صاحب کا رشتہ دار ہوں' یہیں رہتا ہوں۔"
"میں ان کی دو کانوں کا کرایہ دینے آیا ہوں۔"
"لائیں' مجھے دے دیں۔" وہ تھوڑا کشمکش کا شکار لگ رہا تھا۔
"اگر آپ کو اعتبار نہیں تو آپ پھر آ کر دے دیں۔"
"نہیں۔ اب میں بار بار نہیں آ سکتا۔ یہ پچاس ہزار ہے۔ گن لیں اور خاور صاحب کو بتا دیں شکور آیا تھا۔" وہ اسے پیسے پکڑا کر چلا گیا تو وہ گیٹ بند کر کے اندر آ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر وہ باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ شرمین باہر آئی تھی۔
"یہ باہر کوئی شکور آیا تھا۔ انکل کے لیے یہ پیسے دے کر گیا ہے۔ پچاس ہزار ہیں' گن لیں۔" وہ اسے پیسے پکڑاتے ہوئے بولا۔
"شکریہ۔ اگر آپ نہ ہوتے تو۔"
"تو کچھ بھی نہ ہوتا۔" وہ اس کا جملہ اچک کر بولا۔
"آپ سب لوگوں سے یونہی ڈرتی ہیں۔" وہ اس کا ڈر سمجھ کر بولا تو وہ جھینپ گئی۔
"میں ہاسپٹل جا رہا ہوں' آپ کو چلنا ہے۔"
"نہیں' میں ابھی کھانا بنا رہی ہوں۔"
"میں انتظار کر لوں گا۔"
"نہیں' میں فاریہ کو کہہ چکی ہوں۔" نوفل نے بحث نہیں کی۔ وہ سمجھ گیا وہ اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔

✲ ✲ ✲

"بیٹا! اب میں ٹھیک ہوں۔ تم تھوڑی دیر گھر جا کر آرام کر لو۔" خاور صاحب نے مسکرا کر شرمین کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا۔ ان تین دنوں میں وہ گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔
"نہیں ابو! میں ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی اور سوپ نکال کر ان کے قریب بیٹھ گئی اور تھوڑا تھوڑا کر کے انہیں پلانے لگی۔
"اسلام علیکم انکل! اب کیسی طبیعت ہے۔" تب ہی نوفل اندر داخل ہوا تھا۔
"اب تو بیٹا! بہت بہتر ہوں۔ تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔ تم اتنا ٹائم نکال کر میرے لیے آتے ہو۔"
"شرمندہ کر رہے ہیں انکل! آپ' ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور آپ میرے انکل بھی ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہے اور میں گھر مزے سے بیٹھ جاؤں' ایسا تو ہو نہیں سکتا۔" وہ مسکرا کر بولا تو خاور صاحب نے پیار سے اسے دیکھا۔
"میں نے ابو کو بھی بتایا آپ کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں۔ وہ بھی پرسوں آ رہے ہیں۔"
"تم نے خواہ مخواہ شاہد کو تکلیف دی۔"
"انکل پلیز' بار بار تکلیف کا لفظ استعمال کر کے ہمیں غیر نہیں کریں۔ اب آپ آرام کریں۔ کل آپ کو ڈسچارج بھی کر دیں گے۔ میں ڈاکٹر سے بھی مل کر آیا ہوں۔"
"تھینک یو بیٹا۔"
"پھر انکل۔" وہ مسکرا کر بولا تو وہ بھی مسکرا دیے۔
"بیٹا! تم گھر جا رہے ہو تو شرمین کو بھی گھر چھوڑ دو' دو دن سے اس نے بالکل آرام نہیں کیا۔" نوفل نے شرمین کی طرف دیکھا جس نے گھبرا کر باپ کو دیکھا تھا۔
"لیکن ابو۔"
"جاؤ بیٹا! آرام کر لو' میں اب ٹھیک ہوں۔ تم صبح آ جانا' نوفل اپنا ہی بچہ ہے بے فکر ہو کر جاؤ۔" اس کا گریز محسوس کر کے انہوں نے تسلی دی تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

گاڑی چلاتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو دونوں ہاتھ گود میں رکھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"آپ اب بھی پریشان ہیں' اب تو انکل بالکل ٹھیک ہیں۔"

"ہوں۔" وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"آپ رو رہی ہیں۔" وہ حیران پریشان ہو کر بولا۔

"میں بہت ڈر گئی تھی۔ ابو کے علاوہ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو میں جیتے جی مر جاتی۔" یہ کہتے ہوئے آنسو آنکھوں سے باہر آ گئے تھے۔ نوفل نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"لیکن اب انکل ٹھیک ہیں۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولا تو اپنی بے اختیاری پر شرمندہ ہو کر اس نے آنسو صاف کر لیے۔

"آپ کا منگیتر کیسا ہے۔" نوفل کے پوچھنے پر شرمین نے چونک کر اسے دیکھا۔ جو سیدھا دیکھتے ہوئے کار چلا رہا تھا۔

"میرا کوئی منگیتر نہیں۔" اب کی بار نوفل نے چونک کر اسے دیکھا۔

لیکن انکل نے تو ابو سے کہا تھا کہ آپ کی بات طے ہو گئی ہے۔"

"جی۔ لیکن ابو نے بات ختم کر دی شاید اسی لیے ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔" وہ دھیمے لہجے میں کہہ کر انگلیاں چٹخانے لگی جبکہ نوفل کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ بھنگڑا ڈالے' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ قسمت یوں اس پر مہربان ہو سکتی ہے۔

"شرمین! میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا۔ مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں' جب سے آپ کو دیکھا ہے' آپ کے علاوہ کسی کے بارے میں نہ سوچا ہے اور نہ دیکھا ہے۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں امی ابو کو انکل کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں' اس امید پر کہ اس بار انکار نہیں ہو گا۔" شرمین کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ گھبرا کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔"

"میں کیا جواب دوں' آپ ابو سے بات کریں۔"

"انکل سے تو میں بات کر لوں گا' پہلے آپ کی مرضی تو جان لوں۔ آپ یہ بتائیں۔ میں آپ کو پسند ہوں ناں۔" شرمین کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اس کی خاموشی پردہ مزید گویا ہوا تھا۔

"انکل نے ابو سے کہا تھا' انہیں میرا ماڈلنگ کرنا پسند نہیں تو کیا آپ کو بھی پسند نہیں۔"

"آپ کو پسند ہے؟" وہ الٹا پوچھنے لگی۔

"پسند تو ہے لیکن آپ میرے لیے اتنی اہم ہیں کہ آپ کی خوشی کے لیے چھوڑ دوں گا۔"

"چھوڑ دیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"چھوڑ دیا۔" وہ بھی مسکرا کر بولا۔

"اب میں ہاں سمجھوں۔"

"ابو سے پوچھ لیں۔" وہ شرما کر بولی۔ نوفل نے مسکرا کر اس کا شرمیلا انداز دیکھا۔ اس کو اس کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ نوفل نے گھر آ کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ شاہد صاحب کو فون کر کے ساری سچویشن سے آگاہ کیا تھا اور انہیں جلدی آنے کو کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خاور! یہ تمہیں اچانک کیا سوجھی بیمار ہونے کی' تم نے ہماری بچی کو پریشان کر دیا۔" شاہد صاحب نے شرمین کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو خاور صاحب مسکرا دیے۔

"میری چھوڑو' تم بتاؤ۔ یہ اتنی زیادہ مٹھائی کس خوشی میں لے کر آئے ہو۔" خاور صاحب نے شاہد صاحب کے لائے ہوئے مٹھائی کے ٹوکروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہم یہاں صرف تمہاری عیادت کرنے نہیں آئے بلکہ اپنی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔" خاور صاحب نے کچھ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ شاہد اور ان کی بیوی کو دیکھا۔

"جی بھائی صاحب! اب کی بار ہم انکار نہیں سنیں گے۔" شاہد صاحب کی بیوی نے بھی مسکرا کر اپنا عندیہ دیا۔

"آپ کی بیٹی ہے۔" خاور صاحب نے مطمئن ہو کر کہا۔

"تو بس منگنی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتے' سیدھا نکاح کر دیتے ہیں تمہارا کیا خیال ہے خاور۔"

"اتنی جلدی یار! میری تو کوئی تیاری بھی نہیں۔" اب کی بار وہ کچھ گھبرا کر بولے۔

"تیاری کیا کرنی ہے' نکاح کا جوڑا ہم لے آئیں گے۔ نکاح کے لیے لڑکی اور لڑکے کا راضی ہونا اور موجود ہونا ضروری ہے' وہ دونوں ہیں۔ مسئلہ کیا ہے اور جہاں تک لین دین کی بات ہے۔" وہ رکے تو خاور صاحب کی سانسیں بھی دھیمی پڑیں۔ "ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہمیں بس ایک بیٹی کی ضرورت ہے' بس وہ ہمیں دے دو۔"

"آپ نے منگنی نہیں کرنی تو نہ سہی لیکن میرا تو اکلوتا بیٹا ہے اور اکلوتی بہو ہے۔ میں تو انگوٹھی پہناؤں گی۔" یہ کہہ کر ثریا نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر شاہد صاحب کے ساتھ بیٹھی شرمین کو پہنا دی جبکہ دوسرے صوفے پر بیٹھا نوفل پہلو بدل کر رہ گیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" سبطین نے اس کا ہلنا محسوس کیا تھا۔

"یار! منگنی میری ہے اور کسی نے مجھے پوچھا بھی نہیں۔"

"تمہیں اعتراض ہے تو میں ابھی منع کرتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا تو نوفل نے دبوچ کر اسے بٹھایا تھا۔

"ذلیل انسان! تم ہمیشہ میرا کام خراب کرنا' میں انگوٹھی پہنانے کی بات کر رہا ہوں جو امی نے پہنا دی ہے۔ اصولاً" تو مجھے پہنانی چاہیے تھی۔ میں کیا یہاں جھک مارنے آیا ہوں۔"

"شکر کرو منگنی ہو گئی اور نکاح کی ڈیٹ بھی فکس ہو رہی ہے۔ مجھے دیکھو جس کو میں پسند کرتا ہوں' اس سے ہمیشہ لڑائی ہی رہی ہے۔ اس کو اندازہ بھی نہیں ہو گا۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔"

"کس کی بات کر رہے ہو۔" نوفل نے چونک کر پوچھا۔

"بھابھی کی دوست' وہ بلی والی یار! مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ کچھ میرے لیے بھی سوچو۔" وہ معصوم سی شکل بنا کر بولا تو نوفل کی ہنسی نکل گئی۔

"دل بھی کس کو دیا۔"

"دل سوچ سمجھ کر نہیں دیا جاتا۔ سمجھے۔" سبطین نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"تم دونوں کون سی باتوں میں مصروف ہو۔" شاہد صاحب کے پوچھنے پر وہ دونوں سیدھے ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔

"پرسوں نکاح رکھا ہے۔ ٹھیک ہے نوفل! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"نہیں ابو! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" اس نے شرمین کی طرف دیکھ کر کہا تب ہی اس نے بھی آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نظریں ملنے پر شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اسٹیج سے کچھ فاصلے پر کھڑی نوفل اور شرمین کو دیکھ رہی تھی جن کا آج نکاح تھا اور دونوں کتنے خوش تھے یہ ان کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا۔ تب ہی نوفل کے ساتھ بیٹھے سبطین کی نظر فاریہ پر پڑی تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

"کیسی ہیں آپ۔" فاریہ نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

"میں ٹھیک ہوں اور آپ کیسے ہیں۔"

"میں فی الحال ٹھیک نہیں ہوں۔"

"کیوں' مجھے تو ٹھیک نظر آ رہے ہیں۔"

"جی بظاہر ایسا ہے لیکن دل کا حال اچھا نہیں۔"

"کیوں دل کے حال کو کیا ہوا۔" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"آپ کیوں بہت بولتی ہیں۔" نوفل تھوڑا بدمزہ

ہوا۔

"کیوں نہ کہا کروں۔" وہ کھلکھلا کر پوچھنے لگی۔

"کہا کریں لیکن ہر سوال کا جواب کیوں نہیں ہوتا۔ کچھ کا ہاں اور اچھا بھی ہوتا ہے۔"

"لیکن آپ نے ابھی تک کوئی ایسا سوال نہیں کیا جس کے جواب میں اچھا یا ہاں کہوں۔"

"چلیں' ایسا سوال پوچھ لیتا ہوں۔ میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔"

"یہ کیسا سوال ہے۔" فاریہ نے برا مان کر کہا۔

"پھر دیکھ لیں' آپ نے سوال میں سے سوال نکال لیا۔"

"آپ نے سوال ہی ایسا کیا ہے۔" وہ کہہ کر جانے لگی۔

"پوری بات تو سن جائیں۔"

"جی بولیں۔" وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"پتا نہیں۔ آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی کیونکہ ہماری چند ملاقاتیں اچھی نہیں ہوئیں لیکن میں آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک اچھا انسان ہوں۔ لوونگ' کیئرنگ اور میری امی کا کہنا ہے کہ جس کی مجھ سے شادی ہو گی وہ بہت خوش قسمت ہو گی۔"

"اچھا۔" فاریہ نے مسکرا کر کہا "لیکن آپ یہ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔"

"کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش نصیب لڑکی آپ ہوں۔"

"جی۔" وہ حیران ہوئی اور پھر نظریں چرا لیں۔ پہلے کی نسبت اب اس کے انداز میں جھجک تھی۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اپنی امی کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"آپ میرے بارے میں جانتے کیا ہیں۔" اب کی بار فاریہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں آپ کے بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں ایک لڑکی جس کے چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگتی ہے اور میں ہمیشہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" سبطین کی نظر ایک پل کے لیے اس کے چہرے پر ٹھہر گئی جس کی آنکھیں اس کی باتوں کی گواہی دے رہی تھیں۔

"اور میں جانتا ہوں' آپ کو نی نی سے کتنا پیار ہے۔ میں جہیز میں نی نی کو بھی قبول کرنے کو تیار ہوں آخر وہی تو ہمارے ملنے کی وجہ بنی تھی جتنی آپ کو وہ پیاری ہے' اتنا ہی میں اسے پیار دوں گا۔" فاریہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"اگر آپ کو نی نی قبول ہے تو مجھے آپ قبول ہیں۔"

"پھر میں ممی کو بھیج دوں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"آپ کو جلدی کس بات کی ہے۔" وہ اسٹیج کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"اگلے ماہ نوفل اور شرمین کی رخصتی ہے۔ میں نے ہر کام اپنے دوست کے ساتھ کیا ہے۔ اب چاہتا ہوں' ہم دونوں کی خانہ آبادی بھی ایک ساتھ ہو پھر بولیں' منظور ہے۔"

"سوچوں گی۔" وہ اترا کر بولی۔

"سوچ لیں۔ میرے جیسا دوبارہ نہیں ملے گا۔" وہ اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"جانتی ہوں۔" کہہ کر وہ اسٹیج پر چڑھ گئی اور سبطین اس کے ہم قدم تھا۔

☆

ناولٹ

"او مائی گاڈ۔ یہ کیا کیا تم نے جاہل لڑکی۔ میری امپورٹڈ چیزوں کا ستیاناس کر دیا تم نے۔" وہ ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ گرمی سے دماغ ویسے ہی تپا ہوا تھا۔ اوپر سے ناپسندیدہ ترین شخصیت اور اس کی کارگزاری دیکھ کر خون ہی کھول گیا اس کا۔ صدمے سے گنگ کھڑی کچھ دیر تو وہ اپنی جگہ سے ہل ہی نہ سکی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر موجود اس کی انتہائی قیمتی کاسمیٹکس بری طرح سے بکھری پڑی تھیں۔ تین چار لپ اسٹکس کو گل نے بری طرح سے اپنے منہ پر رگڑا ہوا تھا۔ نیل پالش لگانے کی کوشش میں اس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں بری طرح لتھیڑ رکھے تھے۔ پھر شاید نیچے ڈال دی تھی تب ہی تو بھورے رنگ کے قالین پر سرخ نیل پالش پھیل کر اسے داغ دار کر چکی تھی۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اندر داخل ہو کر زوردار دھکا دے کر گل کو گرایا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب سے اسے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ گل اگرچہ پاگل تھی پر رویے کی زبان ہر ذی روح سمجھتا ہے۔ اس کے تیور دیکھ کر بری طرح سہم گئی۔ خوب صورت آنکھوں میں ہراس اتر آیا۔

"اماں میں۔۔۔ دلہن۔۔۔ میں دلہن۔۔۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولنے لگی تو اسے مزید غصہ آ گیا۔

"تو دلہن بنے گی۔۔۔" اس نے حقارت سے اس کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ "میں نے کتنی بار کہا ہے کہ اپنی یہ منحوس شکل لے کر میرے سامنے مت آیا کرو۔" اس کے منہ سے بہتی رال کو اس نے کراہیت سے دیکھا۔

اس کے زور زور سے چلانے کی آواز سن کر کچن میں موجود رفعت بیگم بھاگی چلی آئیں۔

"کتنی بار کہہ چکی ہوں آپ سے کہ اس پاگل کو باندھ کر رکھا کریں۔ نہیں تو کسی دن قتل ہو جائے گا میرے ہاتھوں اس کا اور میں کسی پاگل کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتی۔" نفرت اور حقارت اس کے ہر لفظ سے ہویدا تھی۔

گل اٹھ کر رفعت بیگم کے پاس آ گئی۔ "اماں میں دلہن۔۔۔ مجھے مارا۔۔۔" بولنے سے اس کی رال ایک بار پھر بہنے لگی۔

رفعت بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا۔ "اچھا بیٹا! تم غصہ مت کرو' میں ٹھیک کر دیتی ہوں ابھی سب کچھ۔ ابھی تو میرے پاس کچن میں تھی' پتا نہیں کیسے نظر بچا کے یہاں آ گئی۔" رفعت بیگم لجاجت سے بولتے ہوئے آگے آئیں اور اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پھیلی ہوئی چیزوں کو پھر سے ترتیب دینے لگیں۔

ملیحہ کا بگڑا موڈ ویسے ہی رہا۔ "رہنے دیں بس اتنا احسان کیا کریں کہ اس پاگل کو مجھ سے دور ہی رکھا کریں۔ رحیماں کو بھیجیں' وہ آ کر ٹھیک کر لے گی سب۔ اس کو لے جائیں' مہربانی ہو گی آپ کی۔" اس قدر توہین آمیز لہجے پر رفعت بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کچھ بھی بولے بغیر ایک طرف کھڑی گل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر اسے باہر لے آئیں اور کمرے میں آ کر اس کو بری طرح پیٹ ڈالا۔

"کم بخت! تو مرتی کیوں نہیں ہے۔ کیسے کیسے لوگ کھڑے کھڑے منٹوں میں چٹ پٹ ہو جاتے ہیں اور تو ابھی تک جان سے چمٹی ہوئی ہے۔ ہمیں مار کے ہی مرے گی یہ تو۔"

"ارے۔۔۔ امی کیا کر رہی ہیں؟ کیوں مار رہی ہیں اس معصوم کو۔" کالج سے ابھی ابھی آئی دعا نے ایک نظر میں ہی ساری صورت حال کو بھانپ لیا اور تیزی سے آ کر ماں کا ہاتھ پکڑا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ پھر سسکیاں لیتی گل کو نیچے سے اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔ اپنے دوپٹے سے آنسو سے بھرا اس کا چہرہ صاف کیا۔ منہ سے بہتی رال کو بغیر کسی کراہت کے صاف کیا۔ امی اب روتے ہوئے اسے ساری تفصیل بتا رہی تھیں۔

دعا نے ان کو پانی پلایا۔

"اچھا اب بس کریں رو رو کر طبیعت خراب کر لیں گی اور اپنی۔" اس نے ماں کی پیٹھ سہلائی۔

"ارے دعا! تم تو جانتی ہو نا اب وہ باپ کی لاڈلی ایک کی چار لگائے گی' باپ جب آفس سے آئے گا۔ اس نے میرے اوپر ہی چڑھ دوڑنا ہے اتنے برسوں کی ریاضت کو خاک میں ملا کر۔" انہوں نے آنسو پونچھ کر آزردگی سے کہا۔ دعا طویل سانس لے کر رہ گئی۔

معا" باہر مہد کی آواز پر وہ دونوں ماں بیٹی چونک گئیں۔ "لو ایک اور ہمدرد میدان میں اتر آئے ہیں ملیحہ بی بی کے۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر وہ گل کے پاس آ گئی۔

"گل! میں نے آپ کو منع کیا تھا نا کہ ملیحہ کے کمرے میں نہیں جانا' وہ مارے گی۔ تو دیکھا اس نے مارا نا آپ کو۔" گل کو بات تو نہیں پر محبت اور اپنائیت بھرا لمس اور رویہ اس کی طرف متوجہ ضرور کر گیا۔

"دعا۔۔۔ میں۔۔۔ دلہن۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں آپ ضرور دلہن بننا' میں آپ کو ڈھیر سارا میک اپ کا سامان لا کر دوں گی۔"

بات اب شاید گل کی کچھ سمجھ میں آ گئی تھی۔ تب ہی خوش ہو کر بولی۔ "دعا۔۔۔ چوڑیاں۔" بولنے سے ایک بار پھر۔۔۔ اس کے منہ سے رال بہنے لگی۔

دعا نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے میں سے ایک ٹشو نکال کر اس کا منہ صاف کیا اور نرمی سے بولی۔

"ہاں چوڑیاں بھی لا دوں گی بلکہ آپ میرے ساتھ آؤ۔ منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے تبدیل کرا دوں آپ کے۔ لگتا ہے آج امی نے کپڑے چینج نہیں کیے آپ کے۔ پھر دعا اور گل مل کر کھانا کھائیں گے اور کھانے کے بعد میں اپنی گل کو ڈھیر ساری چوڑیاں دوں گی۔"

اس نے تنقیدی نظروں سے گل کے گل کے پہنے ہوئے ملگجے کپڑوں کا جائزہ لیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے واش روم کی طرف لے جانے لگی۔ پیار کی زبان سے انسان خطرناک سے خطرناک جانور سدھا سکتا ہے تو گل تو پھر ایک بے ضرر انسان تھی سو بغیر کوئی مزاحمت کیے اس کے ساتھ چل پڑی۔

ہاں کبھی غصے میں آ جاتی تو پھر ایسا بگڑتی کہ اسے سنبھالنا بے حد مشکل ہو جاتا۔ زور زور سے چیختی چلاتی تھی۔ سامنے رکھی ہر چیز جو ہاتھ آتی مقابل کو دے مارتی تھی ایسے میں دعا ہی تھی جو اسے سنبھال لیتی تھی۔

✲ ✲ ✲

رفعت بیگم، توقیر احمد خان کی خالہ کی بیٹی اور منگیتر تھیں۔ رفعت بیگم کی بڑی بہن سمیعہ بیگم بھی توقیر احمد کے بڑے بھائی توصیف احمد سے بیاہی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی مہینوں میں توقیر احمد کی شادی رفعت بیگم سے متوقع تھی جب توقیر احمد اپنے آفس میں کام کرنے والی خوب صورت اور طرحدار شہلا بیگم کی زلف کے ایسے اسیر ہوئے کہ رفعت بیگم سے شادی سے انکار کر دیا۔ توصیف احمد ہی اب رفعت کے کفیل تھے کہ ان کے والدین اور رفعت اور سمیعہ کے والدین اب حیات نہیں تھے۔ توصیف احمد کی کوئی دھمکی، ڈانٹ، پیار کچھ بھی کام نہ آسکا اور توقیر احمد، شہلا بیگم کو بیاہ کر لے آئے۔

توصیف احمد نے اسی ہفتے دونوں پورشنز کے بیچ میں دیوار اٹھوادی تھی اور توقیر احمد کے معافی مانگنے کے باوجود ان سے ہر قسم کا تعلق قطع کر لیا تھا۔ دلوں کے بیچ دیوار آجانے سے گھر میں بھی ایک دیوار تعمیر ہو گئی تھی۔

مہد اس وقت تین سال کا تھا جب شہلا بیگم کے ہاں ملیحہ نے جنم لیا جو خوب صورتی میں اپنی ماں کا پرتو تھی۔ اولاد کی نعمت پانے پر دونوں خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ اپنی اس خوشی میں توقیر احمد نے ایک دفعہ پھر اپنے بھائی کو شریک کرنا چاہا لیکن توصیف احمد جب جب رفعت کو گم صم دیکھتے تو بھائی سے کدورت زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ سو انہوں نے توقیر احمد کی کسی بھی معافی تلافی کو قبول نہیں کیا۔ سمیعہ اور توصیف احمد نے بہت کوشش کی کہ رفعت کو کسی اچھے گھر بیاہ دیں پر کیا کرتے کہ کوئی ڈھنگ کا رشتہ کوشش کے باوجود نہ مل سکا۔

ملیحہ چھ ماہ کی تھی جب ایک روز توقیر احمد، شہلا بیگم کو ان کے ماں باپ سے ملوا کر واپس لا رہے تھے کہ ایک جان لیوا ایکسیڈنٹ نے شہلا بیگم کی جان لے لی۔ توقیر احمد شدید زخمی ہوئے اور کئی دن اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہے جب کہ ننھی ملیحہ حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح سلامت رہی۔

توصیف احمد ساری ناراضی و کدورت بھلا کر دن رات بھائی کے پاس اسپتال میں تھے جب کہ سمیعہ بیگم نے ننھے مہد کے ساتھ ملیحہ کو بھی سنبھال لیا بلکہ ملیحہ کو زیادہ تر رفعت ہی سنبھالتی رہی۔ شہلا بیگم کے بھائی بہن کھڑے کھڑے ہی توقیر احمد کو دیکھنے آتے اور ایک آدھ بار ملیحہ کو بھی دیکھ کر گئے تھے۔

موت کو پچھاڑ کر توقیر احمد زندگی کی طرف تو لوٹ آئے تھے، لیکن محبوب بیوی سے بچھڑنے کا غم انہیں زندگی کی رنگینیوں کی طرف پلٹنے نہیں دیتا تھا۔ وقت بڑے سے بڑے گھاؤ پر صبر کی چادر ڈال کر اپنے ہونے کا احساس دلا ہی دیتا ہے۔ ننھی ملیحہ کی پرورش و دیکھ بھال کے لیے انہوں نے توصیف احمد کی اس پیش کش کو قبول کر لیا جو انہوں نے یہ کہہ کر کی تھی کہ بھلے ہی ملیحہ رفعت سے مانوس ہو چکی ہے، لیکن جلد یا بدیر رفعت کی شادی ہونی ہے تو ایسی صورت میں وہ دونوں ہی ڈسٹرب ہوں گی۔ مناسب تو یہی ہے کہ وہ رفعت سے شادی کر لیں۔ کچھ سوچ بچار کے بعد ان کا مثبت جواب رفعت کو ان کی زندگی میں لے آیا، لیکن پھر ساری زندگی وہ رفعت کو نہ تو ان کا صحیح مقام دے پائے نہ ہی شہلا کی تصویر اپنے دل سے ہٹا پائے۔

ملیحہ میں ان کی جان تھی۔ رفعت بیگم ہزار کوشش کرتیں کہ ملیحہ کی طرف سے وہ مطمئن ہو جائیں پر بچی تھی کبھی رو بھی پڑتی۔ کبھی چوٹ بھی لگ جاتی اور کبھی کبھار بیمار بھی ہو جاتی بس پھر تو رفعت بیگم کی شامت آجاتی۔ وہ برملا کہتے کہ رفعت کی بددعاؤں نے ہی ان کو زندگی سے خوشیاں کشید نہیں کرنے دی تھیں اور اب وہ شہلا کی اولاد کی جان کے در پے تھی۔

رفعت بیگم کے امید سے ہونے کی خبر نے ان کو چراغ پا کر دیا۔ ان کے خیال میں رفعت ملیحہ سے لاپروائی تو ویسے ہی برتتی تھی۔ اب اپنی اولاد کے بعد تو سرے سے ہی اسے بھول جائے گی۔ رفعت بیگم کی صفائیاں، وضاحتیں بھی انہیں مطمئن نہ کر پاتیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

توصیف احمد ان کا رویہ دیکھتے تھے۔ بھائی کو سمجھاتے بھی تھے پر جو گرہ توقیر احمد کے دل میں لگ چکی تھی، وہ کبھی نہ کھل سکی۔ توصیف احمد نے درمیانی دیوار میں ایک دروازہ بھی کھلوا دیا تھا۔ رہی سہی کسر گل کی پیدائش نے پوری کردی۔ قبل از وقت پیدا ہونے والی وہ بچی انتہائی لاغر تھی۔ اور مختلف ٹیسٹس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ ایک ایب نارمل بچی تھی۔ مسلسل علاج نے اتنا کیا کہ وہ خود سے چلنے پھرنے لگ گئی تھی، لیکن اس کی نشوونما عام بچوں سے انتہائی پیچھے تھی۔

ملیحہ شروع سے ہی ضدی اور خود سر بچی تھی۔ کچھ اسے باپ کے رویے نے بھی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ ماں کی قدر اس نے باپ کی زندگی میں کیا جان لی کہ خود بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کی دل آزاری کا ہر انداز اپنائی گئی۔ گل کے دو سال بعد دعا نے جنم لیا تو ماں کی طرح واجبی شکل و صورت والی دعا بھی باپ کی توجہ اور شفقت سمیٹنے میں ناکام رہی تھی لیکن رفعت بیگم ماں تھیں یہ جان کر اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ ایک نارمل بچی تھی۔

ہفتے میں ایک دفعہ ملیحہ کو اس کی خالہ بلوا بھیجتیں اور واپسی پر وہ نفرت اور کدورت کے نئے نئے رنگ اپنے دماغ میں بھر کر لاتی۔ کچی عمر کے رنگ ویسے بھی بہت پختہ ہوتے ہیں۔ سو ساری عمر وہ رفعت بیگم کو ایک ماں کا درجہ کبھی نہ دے سکی۔ باپ کی توجہ نے اسے مغرور بنا ڈالا اتنا کہ گھر کے باقی لوگ اسے کیڑے مکوڑے لگتے۔ توقیر احمد ہمیشہ اس کے لیے اعلا اور معیاری چیزیں لاتے جب کہ سگی اولاد ہونے کے باوجود دعا اور گل ان سب سے محروم تھیں۔

گل تو چلو حواس سے عاری تھی پر دعا باپ کا بیگانہ اور بے رخی والا رویہ محسوس کرتی اور دل میں کڑھتے ہوئے بھی ماں کی ہمت بندھاتی۔ فطری طور پر وہ اپنی ماں کی طرح صلح جو بچی تھی۔ اب یہ سب بچے بچپن پھلانگ کر جوانی کی حدود میں تھے۔

مہد کی ملیحہ میں دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی جب کہ دعا کے سچے اور خالص جذبوں نے مہد کو اپنا سب کچھ مان رکھا تھا۔ بڑے ہونے پر ملیحہ نک چڑھی تھی۔ گھر میں تو کسی شہزادی کی طرح رہتی ہی تھی خالہ کے گھر بھی اسے اعلا قسم کا پروٹوکول ملتا۔ گل سے اسے خاص قسم کی چڑ تھی۔ بقول اس کے کہ اسے دیکھ لینے پر اس کا دن بہت برا گزرتا تھا اور کراہت محسوس ہوتی تھی۔ بعض دفعہ تو غصے میں وہ اسے ایک آدھ تھپڑ لگا بھی دیتی تھی۔ رفعت بیگم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ملیحہ کو روک کر اپنی شامت کو بلاتیں جب کہ توقیر احمد ملیحہ کا رویہ دیکھ کر بھی نظر انداز کر جاتے۔

☆ ☆ ☆

زندگی اسی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ ملیحہ یونیورسٹی میں، دعا کالج میں جب کہ مہد آج کل توصیف احمد کے ساتھ آفس جا رہا تھا۔

توقیر احمد ایک ہفتہ بعد ایک بزنس ٹور سے رات ہی واپس آئے تھے سو اس وقت ناشتے کی میز پر سب کے ساتھ موجود تھے۔ ملیحہ حسب معمول ان کی ساتھ والی کرسی پر موجود تھی، جب کہ دعا رفعت بیگم کے ساتھ کچن میں موجود تھی۔ جب وہ ماں بیٹیاں ناشتے کے تمام لوازمات میز پر لاچکیں تو اپنی اپنی نشست آکر سنبھال لی۔

''اور ملی بیٹا کو سامان پسند آیا کہ نہیں۔'' توقیر احمد نے سنگاپور سے لائے گئے تحائف کی بابت دریافت کیا جو وہ اس کے لیے لائے تھے۔ دعا نے ایک نظر توقیر احمد کے چہرے پر موجود ملیحہ کی محبت کو جگمگاتے دیکھا اور اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

''اوکے' آپ ایسا کریں جو چیزیں آپ کو پسند آئی ہیں وہ لے لیں باقی دعا کو دے دیں۔'' ملیحہ کا سر اثبات میں ملتے ہی توقیر احمد نے ملیحہ سے کہا۔

''اوہ نو پاپا! وہ سب تو آپ میرے لیے لائے ہیں نا۔'' ملیحہ نے لاڈ سے ٹھنک کر کہا حالانکہ اس کے پاس ایسی چیزوں اور کپڑوں کی بھرمار تھی جو بغیر استعمال کے تھے اور توقیر ہر بار اس کے لیے لے کر آتے تھے پر ملیحہ

کو کہاں برداشت تھا کہ اس کے لیے لائی گئی چیز کوئی اور استعمال کرے اور کئی بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ رفعت بیگم یا دعا کچھ اپنے لیے لے آتیں تو دعا کی آنکھوں میں ستائش دیکھ کر وہ چیز یہ کہہ کر جھٹ سے اٹھا لیتی کہ یہ اسے پسند آ گئی ہے اور ایسا اس وقت کرتی جب پاپا موجود ہوتے سبالکل غیر محسوس انداز میں کچھ ایسے بات کرتی۔ "کل دعا ایک سوٹ لے کر آئی ہے پاپا! مجھے بڑا پسند آیا وہ۔" بس پھر کیا ہوتا توقیر احمد یہ سنتے ہی دعا کو آواز لگاتے۔

"دعا! کل جو آپ سوٹ لائی ہیں بیٹا۔ ایسا کریں اپنی بہن کو دے دیں۔ اس کو پسند آ گیا ہے۔ آپ یہ رقم رکھ لیں ـــــ اپنے لیے اور لے آنا۔"

گزرتے وقت میں دعا نے اپنی اچھی فطرت اور عادات کی بنا پر توقیر احمد کے دل میں اتنی جگہ تو بنا ہی لی تھی کہ ملیحہ کے بعد ہی سہی اب کوئی چیز لیتے ہوئے انہیں دعا کا بھی خیال آ ہی جاتا تھا۔

"اچھا کوئی بات نہیں، میں دعا کے لیے اور لے آؤں گا۔" انہوں نے ملیحہ کو ٹوکے یا کچھ کہے بغیر یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

"السلام علیکم چچا جان! آپ کب آئے؟" مہد اچانک ہی وہاں آیا تھا۔

"آؤ بیٹھو بیٹا! ناشتا کرو۔ رات ہی کو آیا ہوں۔" توقیر احمد نے اس کے سلام کا جواب دے کر ایک محبت بھری نگاہ ڈال کر بھتیجے کو بیٹھنے کی پیش کش کی۔

"جی جی، میں تو آیا ہی ناشتا کرنے ہوں۔ دعا کے ہاتھ کی پوریاں اور چنے۔ واہ! کیا کمال کا ذائقہ ہے لڑکی تمہارے ہاتھوں میں۔ کبھی یہ ہنر اپنی بہن صاحبہ تک بھی منتقل کرنے کی کوشش کرو نا۔" بیٹھتے بیٹھتے وہ شرارت سے گویا ہوا۔

توقیر احمد مسکرا کر چائے پینے لگے جب کہ وہ ملیحہ ہی کیا جو چپ کر جائے۔

"ارے واہ! میں کیوں کروں یہ نوکروں والے کام۔ تمہاری دعا بیگم کو ہی یہ غریبوں مسکینوں والے کام کرنے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کچن میں جا کر اپنا وقت برباد کرنے کا۔"

یہ سن کر دعا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ رفعت بیگم شکر ہے اس وقت وہاں نہیں تھیں۔ مہد کے لیے کچن سے تازہ پوریاں لینے گئی تھیں۔ توقیر احمد نے بڑے پیار سے ملیحہ کو دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت اچھی بات کی ہو۔

"اور میڈم! اگر تمہارا شوہر چاہے کہ تم اس کے لیے خود کھانا بناؤ اور ہو سکتا ہے وہ نوکر بھی افورڈ نہ کر سکے تو۔" مہد یقیناً "مذاق کر رہا تھا۔

ملیحہ حسب عادت بھڑک گئی۔ "میں کیوں کرنے لگی کسی کنگلے سے شادی اور میں تو پہلے دن ہی اسے بتا دوں گی کہ دیکھو مسٹر مجھے دنیا میں صرف عیش کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کیوں پاپا!" اس نے فخریہ انداز میں کہہ کر پاپا کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی بالکل ٹھیک! ہماری پرنسز کے لیے تو کوئی پرنس ہی آئے گا۔"

توقیر احمد کی تائید پر دعا نے ٹھک سے کپ کو ٹیبل پر رکھا۔ اس کی ضبط کی حد بس یہیں تک تھی۔ ملیحہ گردن اٹھا کر مہد کو دیکھنے لگی گویا اترا رہی ہو۔ اسی پل جب رفعت بیگم مہد کے لیے گرم پوریاں چنے لے کر میز پر رکھ رہی تھیں۔ دعا وہاں سے جانے لگی تو توقیر احمد نے اسے پکار کر کمرے میں سے اپنا بریف کیس نکال لانے کو کہا۔ رال بہاتی، آنکھیں ملتی ہوئی گل وہیں چلی آئی۔

"تم پھر چلی آئیں یہاں۔ کتنی بار کہا ہے، مت دندناتی ہوئی ہر جگہ پر پہنچ جایا کرو۔" ملیحہ کا خوب صورت چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ پڑ گیا۔ رفعت بیگم تیزی سے گل کی طرف بڑھیں کیوں کہ ملیحہ کی بات پر انہوں نے توقیر احمد کی پیشانی کے بل اور آنکھوں کی ناگواری بھانپ لی تھی۔

"کام ڈاؤن ملی! کیا ہو گیا ہے۔ اس بے چاری کو کیا پتا، کہاں جانا ہے، کہاں نہیں۔" مہد نے ناشتا کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"مت کہو اس کو بے چاری۔ زندگی اجیرن کر ڈالی

ہے اس منحوس نے۔" وہ تنفر سے گویا ہوئی۔ "اور پاپا! میں تو کہتی ہوں آپ اسے پاگل خانے داخل کرادیں۔" باپ کی طرف مڑتے ہوئے اس نے سنگدلی سے کہا۔

دروازے تک گل کو گھسیٹ کرلے کر جاتی رفعت بیگم ساکت رہ گئیں۔ کچھ ایسی ہی حالت اندر داخل ہوتی دعا کی تھی۔ وہ دونوں ہی جانتی تھیں کہ ملیحہ کے منہ سے نکلی غلط یا درست ' جائز یا ناجائز ہر بات کو پورا کرنا توقیر احمد اپنا فرض سمجھتے تھے۔

"چھوڑو بھی ملی! کیا فضول بات کر رہی ہو۔" مہد کو اس کی بات انتہائی نامناسب معلوم ہوئی۔ وہ سنجیدگی سے ملیحہ کو مخاطب کرکے بولا۔

"تم چپ کرو مہد۔" ملیحہ نے ٹوک کر مہد سے کہا اور پھر دعا سے بریف کیس لیتے ـــ باپ کو کہا۔

"دس از ٹو مچ پاپا! آئے دن وہ جنگلی لڑکی میرے کمرے میں آکر میری ہر چیز کو تباہ کر جاتی ہے۔ امی کو ہزار بار کہا ہے کہ اسے باندھ کر رکھیں۔ جس جگہ اور جب اس کا دل کرے غلاظت پھیلا دیتی ہے۔ بس اب اسے بھیج ہی دیں مینٹل اسپتال یقین کریں 'سکون آجائے گا سب کی زندگیوں میں۔" وہ اب دلائل سے توقیر احمد کو قائل کر رہی تھی۔

"گل آئندہ ایسا کچھ نہیں کرے گی پاپا' جو ملیحہ کو برا لگے۔ میں آپ کو اور ملیحہ کو یقین دلاتی ہوں۔ آپ ایسا مت کیجیے گا پاپا پلیز 'مینٹل اسپتال میں تو بہت بری حالت ہوتی ہے مریض کی۔" دعا کی آواز بھرا گئی۔ اس پل پتا نہیں کیسے عجیب سے احساس نے توقیر احمد کے دل کو چھوا تھا۔

"اٹس اوکے بیٹا! ڈونٹ وری۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" انہوں نے دعا کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

اور پھر ایک طرف غصے میں کھڑی ملیحہ کی طرف متوجہ ہوئے جس کی زندگی میں پہلی بار پاپا نے کوئی بات رد کی تھی۔ وہ غصے میں ادھر ادھر دیکھتی رہی جب پاپا نے اس کے یونیورسٹی جانے کے بارے میں استفسار کیا وہ دیر سے آفس جاتے تھے لیکن کبھی کبھار جلدی جانے کی صورت میں اسے یونیورسٹی ڈراپ کر دیا کرتے تھے۔ ویسے وہ اسٹاپ تک پیدل چلی جاتی یا مہد چھوڑ دیا کرتا تھا۔ آگے پوائنٹ سے جاتی تھی جب کہ دعا کو کالج وین گھر سے پک اینڈ ڈراپ کرتی۔

ملیحہ نے صرف ایک شاکی نظر سے باپ کو دیکھا اور پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ لاڈلی بیٹی کا اس طرح ناراض ہونا توقیر احمد کو پریشان کر دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی۔ ایک اہم میٹنگ نہ ہوتی تو وہ اس کو منائے بغیر ہرگز گھر سے نہ نکلنے پر مجبوری تھی۔ سو چائے پیتے مہد کی طرف متوجہ ہوئے جو یہ ساری کارروائی آرام سے ملاحظہ کر رہا تھا گویا اسی کام کے لیے وہاں آیا ہو۔

دعا الگ باپ سے شرمندہ نظر آرہی تھی۔

"مہد بیٹا! آپ جاؤ ملی کے پاس۔ پتا تو ہے کتنی جذباتی ہے۔ آپ کی بات آرام سے سن لے گی۔ کبھی کبھی اس کی بے جا ضد مجھے بے حد پریشان کرتی ہے کہ کیا ہوگا اس لڑکی کا۔" وہ پریشانی سے بولے تو مہد اپنا چائے کا کپ میز پر رکھ تیزی سے ان کے قریب آیا۔

"ارے چچا جان! بے فکر ہو کر جائیں۔ ملی کی عادت کا تو پتا ہے آپ کو پھر بھی پریشان ہو رہے ہیں۔ سب کچھ میرے اوپر چھوڑ کر جائیں۔ واپس آنے پر دیکھیے گا 'آپ کی ملی آپ کو ہنستی مسکراتی ہوئی ملے گی۔" اس کے اس طرح کہنے پر توقیر احمد کو کچھ تسلی ہوئی کیہ واقعی ان کے بعد وہ مہد کی کوئی بھی بات نہیں ٹالتی تھی سو گہری سانس لیتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل گئے۔

"اچھا بھئی دعا! دعا کرنا تمہاری خونخوار آپا کا موڈ ٹھیک ہو جائے' مجھے تو ایسے ہر موقع پر ایسے ڈر لگتا ہے جیسے شیر کی کچھار سوری شیرنی کے کچھار میں ہاتھ ڈالنے جا رہا ہوں۔" اپنے کسی خیال میں مگن برتن اٹھاتی دعا سے اس نے کہا تو وہ ایک پھیکی سے مسکراہٹ لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

کچھ لوگ دنیا میں صرف اپنی منوانے کے لیے آتے

ہیں۔ لاڈ سے' پیار سے' محبت سے' دھونس سے یا دھمکی سے منواتے اپنی ہی ہیں اور ملیحہ ان ہی لوگوں میں سے تھی۔ پاپا کے گھر میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ مہد کے دل پر اسی کا سکہ رائج تھا۔ خالہ کے گھر اس کی کبھی کوئی بات ٹالی نہیں گئی تھی۔ یہ سارے خیالات وقتاً" فوقتاً" دعا کے دل و دماغ میں اودھم مچائے رکھتے تھے۔

ملیحہ کے کمرے کے سامنے گزرتے ہوئے اس کے قدم کچھ آہستہ ہوئے۔ وہ مہد پر۔ چلا رہی تھی۔ دعا سر جھٹک کر اپنے کمرے میں کالج کے لیے تیار ہونے چل دی اور جس وقت کالج کے لیے نکل رہی تھی اس نے ہنستی مسکراتی ملیحہ کو مہد کے ساتھ بائیک پر باہر جاتے دیکھا۔ جاتے ہوئے مہد نے اسے وکٹری کا نشان بنا کر دکھایا۔ اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔

کالج میں بھی اس کا دل نہ لگ سکا۔ ان دونوں کا بے تکلف انداز' نظر کے سامنے بار بار آتا رہا۔ اس کے کالج سے واپس آنے کے بعد بھی ابھی وہ لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ گل کا موڈ آج کچھ ٹھیک تھا جب ہی کارپٹ پر پھسکڑا مار کر بیٹھی' سامنے رکھے ٹی وی انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ امی کچن میں تھیں وہ وہیں پر چلی آئی۔

"لائیں امی! پھلکے میں ڈال دیتی ہوں۔" اس نے ان کے نزدیک آکر کہا۔ حالانکہ وہ خود تھکی ہوئی آئی تھی لیکن امی کا احساس تھا اسے کہ گل کے ساتھ سارا دن گزار کر وہ کیسی اعصاب شکن تھکاوٹ کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ اوپر کے کاموں کے لیے ملازمہ آتی تھی پھر بھی کچن کا سارا کام امی خود سنبھالتی تھیں۔ اس وقت بھی امی نے اس کی تھکاوٹ کا خیال کرتے اسے سہولت سے انکار کر دیا اور روٹیاں پکا کر امی جب تک فارغ ہوئیں۔ دعا نے وہیں کچن میں ہی چھوٹی میز پر کھانا لگا دیا پھر گل کو بھی وہیں لے آئی۔ جانتی تھی کہ اسے کھانا کھلانا ایک مشکل مرحلہ ہوتا تھا پر امی کے خیال سے گل کے کئی مشکل کام وہ بغیر کہے اپنے ذمے لے چکی تھی جیسے کھانا کھلانا۔ اسے واش روم لیجانا اور سب سے مشکل مرحلہ اس کے لیے گل کو نہلانے کا ہوتا۔

اس دن مہد اور ملیحہ بہت دیر سے آئے تھے ڈھیروں ڈھیر شاپرز سے لدے پھندے۔ ملیحہ نے تو کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا کہ مہد کے ہمراہ باہر سے کھا کے آئی تھی اور موڈ جو صبح خطرناک تک بگڑ گیا تھا اب اتنا خوشگوار ہو چلا تھا کہ اس نے مہد کے ساتھ کی ہوئی تمام شاپنگ بڑی خوش دلی اور کسی حد تک فخر کے ساتھ دعا کو دکھائی تھی۔ مہد آتے ہی اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

خالہ کا ارادہ مہد کے لیے دعا جیسی فرمانبردار اور سلجھی ہوئی لڑکی کو بہو بنا کر لے آنے کا تھا مگر تایا اور ان کے صاحبزادے دونوں کو ملیحہ کے سوا کچھ دکھتا ہی نہ تھا۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو تایا نے توقیر احمد سے بات کی تھی کہ مہد اور ملیحہ کی فی الحال منگنی کر دی جائے' اور شادی ملیحہ کے امتحانات کے بعد کریں گے۔ توقیر احمد کو بھلا کیا اعتراض ہوتا فوراً" ہی ہاں میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں آفس کے کام کے سلسلے میں تین دن کے لیے اسلام آباد جانا تھا۔ وہاں سے واپسی پر انہوں نے کہا کہ ملیحہ سے پوچھ کر وہ منگنی کی تاریخ بتادیں گے' ساتھ ہی جانے سے قبل ملیحہ کو رقم دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ امی اور دعا کے ساتھ جا کر خریداری وغیرہ کر آئے اور حیرت کی بات تھی کہ اس بار انہوں نے دعا کو بھی الگ سے خریداری کے لیے رقم دی تھی۔

یہ الگ بات تھی کہ ملیحہ نے ان کی بات کو قطعاً" اہمیت دیئے بغیر نہ تو دعا کو ساتھ چلنے کو کہا اور نہ امی کو۔ ساری خریداری مہد کے ساتھ جا کر آئی تھی۔ اب صرف انتظار تھا تو توقیر احمد کا جو تین دن کا کہہ کر گئے تھے اور انہیں پانچ دن لگ گئے تھے۔ اتوار کی صبح وہ واپس آئے تھے۔ ہفتہ وار تعطیل کے باعث ملیحہ اور دعا بھی گھر پر تھیں۔

ملیحہ تو چھٹی کے دن دوپہر کر کے ہی اٹھتی تھی سو

ابھی تک ــ سو رہی تھی۔ دعا اپنے مخصوص وقت پر ہی اٹھی تھی۔ چھٹی والے دن وہ ملازمہ کے ساتھ مل کر تفصیلی صفائی وغیرہ کرواتی۔ ہفتے کے دھونے والے کپڑے بھی اپنی نگرانی میں دھلواتی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ملازمہ کا انتظار کیے بغیر ہی مشین لگائی پھر وہ اور امی گل کو کھینچ کھانچ کر باتھ روم نہلانے کے لیے لے گئیں۔ آدھے گھنٹے کی زبردست مشقت کے بعد دھلی دھلائی گل برآمد ہوئی۔ وہ دونوں بھی بری طرح سے پانی میں شرابور ہو چکی تھیں۔

امی اور دعا نے بھی کپڑے بدل لیے تھے۔

دفعتاً" امی کمرے میں داخل ہوئیں۔" دعا بیٹا! میں اور تمہاری خالہ (مہدی کی امی) مسز خالد کے ہاں جا رہے ہیں ان کی ساس کی تعزیت کے لیے تم ایسا کرو اسے ناشتا کرا کے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دو پھر ملیحہ کے اٹھنے پر اسے ناشتا بنا دینا۔ تم تو کام میں لگی رہو گی اور یہ ادھر ادھر ہو گئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔" امی نے دعا کو تفصیل سے بتایا ساتھ ہی گل کو دیکھا جو غور سے اپنے قمیص کے دامن کو ہاتھ میں لیے' پتا نہیں کیا حفظ کر رہی تھی۔

ایک دفعہ آنکھ بچا کر وہ ننگے پاؤں' ننگے سر گلی میں نکل گئی تھی اگرچہ فوراً" پتا چلنے پر امی اور دعا اسے گلی کے نکڑ سے پکڑ تو لائی تھیں پر اس دن کے بعد کسی بھی مصروفیت یا گھر سے باہر جانے کی صورت میں امی اس کا ایک پاؤں بیڈ کے پائے کے ساتھ زنجیر میں باندھ کے جاتی تھیں۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا تھا پر ایسی کسی لاپروائی سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا جو ان کو بعد میں عمر بھر کے رونے پر مجبور کر دیتی۔ دعا کے اثبات میں سر ہلاتے ہی وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھیں۔ پتا تھا کہ دعا' گل کا ان سے بھی زیادہ خیال رکھتی تھی اور یہ بات تھی بھی ٹھیک۔

دعا گل کو ابھی اسے ناشتا کرانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ آنکھیں ملتی ہوئی ملیحہ وہیں آ گئی۔

"دعا یار' ناشتا نہیں ملے گا کیا آج۔ اور یہ صبح صبح مشین کا کھٹ راگ مت پال لیا کرو سیٹیاں بجا بجا کے اٹھنے پر مجبور ہی کر ڈالا اس کے شور نے۔"

پچھلی طرف جہاں دعا نے مشین لگائی ہوئی تھی ملیحہ کے کمرے کی ایک کھڑکی وہیں کھلتی تھی سو اس نے نخوت سے کہا۔

"تم چلو' فریش ہو جاؤ۔ میں ناشتا لے آتی ہوں تمہارا!" دعا نے اس کی دوسری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

ملیحہ سستی سے چلتی باہر نکل گئی۔ دعا پھر سے گل کے پاس آ گئی اور کوئی دس دفعہ بڑے پیار سے اور زور دے دے کر اسے سمجھایا کہ وہ باہر مت آئے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی بات کو اس نے کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ لیا ہو گا۔ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ ملیحہ کی پسند پر چھٹی والے دن اس کا فرمائشی ناشتا بنتا تھا وہ بنا کر اس کے کمرے میں دے کر آئی ایک نظر پھر سے گل کے پاس جا کر دیکھا۔ وہ اپنے کھلونوں میں مگن تھی جو آتے ہوئے وہ اس کے پاس رکھ آئی تھی۔

مشین سے پہلے والے کپڑے نکال کر اس نے دوسرے کپڑے ڈالے ہی تھے کہ ملازمہ بھی آ گئی۔ اس کے ذمہ دھلائی کا کام لگا کے وہ دوبارہ گل کا ناشتا بنانے آ گئی۔ گل عموماً" خود ہی ناشتا کر لیا کرتی تھی۔ آدھا کھاتی' آدھا پھیلاتی تھی بعد میں امی اس کے کپڑے بدلوایا کرتی تھیں لیکن آج چونکہ وہ کپڑے بدل چکی تھی اس لیے اس کو ناشتا کرانے لگی۔ ناشتا کرنے کے بعد اس نے گل کی آنکھوں کو بوجھل ہوتا محسوس کیا۔ چلو یہ اچھی بات ہوئی کہ یہ سو جائے ورنہ زنجیر ڈالنے کے بعد جو رونا پیٹنا وہ ڈالتی تھی' وہ برداشت کرنا دعا کے اعصاب کے لیے ایک کٹھن مرحلہ ہوتا تھا۔

"گل تو بہت اچھی بچی ہے' ابھی سو جائے گی۔ ہے نا۔" کسی بچے کی مانند اس کے کھلونے سمیٹتی وہ اسے سونے پر آمادہ کرنے لگی۔

خلاف توقع وہ جلد سو بھی گئی۔ سوتے ہوئے وہ بہت معصوم اور کسی چھوٹی سی بچی کی مانند لگ رہی تھی۔ جاگتے ہوئے اس کا منہ جو ادھ کھلا رہتا' وہ اس وقت بند تھا۔

کچن میں آنے پر پتا چلا کہ ملیحہ نے ملازمہ کو چائے بنانے کے لیے بھیجا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر بریانی کی فرمائش کی تھی ساتھ ہی یہ کہلوایا تھا کہ ”اسے دوپہر سے پہلے ہرگز ڈسٹرب نہ کیا جائے وہ کل ہونے والے کسی ٹیسٹ کی تیاری کرے گی اور جب پاپا جاگیں تو اسے ضرور بتا دیا جائے۔ دعا نے یہ تمام فرمان خاموشی سے سنے۔

”بی بی جی۔ ملی باجی ہے تو آپ کی بہن پر ہے بڑی نخرے والی جی۔ ملازموں کو تو ایسے سمجھتی ہے جیسے انسان نہ ہوں۔“ چائے چھانتے اس نے دعا پر اپنے خیالات ظاہر کیے یہ سوچ کر کہ دعا بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کرے گی۔

”اچھا تم جاؤ۔ جلدی سے کپڑوں والا کام مکمل کر کے لاؤنج میں پہنچو کافی دنوں سے تفصیلی صفائی کا سوچ رہی ہوں میں۔ لگے ہاتھوں آج وہ بھی ہو جائے۔“

خلاف توقع جواب سن کر ملازمہ نے برا سا منہ بنایا اور جی اچھا کہہ کر چائے لے کر وہاں سے چلتی بنی۔ ان ہی کاموں کے چکر میں گھن چکر بنی دعا ایک دم بے حد گھبرا کر اندر کو بھاگی جب اس نے ملیحہ کی چیخ و پکار کی آواز سنی۔ اس نے پاپا کو بھی تیزی سے اس کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ بھی شاید ملیحہ کی آواز سن کر ابھی نیند سے جاگے تھے کیونکہ ان کی آنکھیں سرخ اور حلیہ بے ترتیب تھا وہ ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھے ورنہ وہ لباس کا بہت خیال رکھنے والے انسان تھے۔ دعا نے ہمیشہ نک سک سے باوقار انداز میں ہی انہیں دیکھا تھا۔

ملیحہ کے کمرے کی دروازے کی چوکھٹ پر قدم دھرتے ہی اس کے قدم وہیں جم گئے۔ ملیحہ نیچے پڑی گل کو بری طرح سے پیٹ رہی تھی۔ بہت مشکل سے پاپا نے اسے گل سے دور ہٹایا۔

”کام ڈاؤن ملیحہ کیا ہو گیا ہے بیٹا! بس کرو ادھر آؤ۔ شاباش۔“ پاپا اسے بہلا رہے تھے جبکہ سہمی ہوئی گل کو انہوں نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر دیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے؟ آپ دیکھ چکے ہیں میری اس اسائنمنٹ کا حشر جو صبح سے کمپلیٹ کرنے میں لگی ہوں۔ سب مٹ کرانے کی لاسٹ ڈیٹ ہے کل۔ کہلوا کے بھی بھیجا تھا ان لوگوں کو کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے اور ہزار بار کہا ہے اس جانور کو باندھ کر رکھا کریں۔ پتا نہیں کہاں سے انک کی ڈبی لے کر ساری الٹ دی۔“ یہ کہہ کر ملیحہ نے غصے میں اپنی وارڈروب کھول کر اس میں بیگ کھینچ کر نکالا اور کپڑے نکال نکال کر غصے سے اس میں ٹھونسنے شروع کر دیے تو قیر احمد یہ دیکھ کر بے حد گھبرا گئے۔ گل کو باہر لے جاتی دعا بھی ٹھٹک گئی۔

”میں نے ایک دفعہ پہلے بھی کہا تھا کہ اس پاگل کو گھر میں رکھ کر پتا نہیں کیا مل رہا ہے آپ کو ہاں دوسرے ضرور ذہنی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ اب میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں۔ اس دن اس گھر میں قدم رکھوں گی جب گھر اس کے وجود سے پاک ہو جائے گا۔“ تو قیر احمد کی پریشانی اور بے قراری نظر انداز کرتے اس نے تحقیر سے گل کی جانب اشارہ کر کے لفظوں کو چبا چبا کے ادا کیا۔ دعا تڑپ کے رہ گئی۔

تو قیر احمد بھی ملیحہ کے پیچھے ہی نکل گئے جب کہ دعا گل کو زور سے گھسیٹتی اپنے کمرے تک لے آئی اور نجانے کیوں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس بار وہ بھی تو قیر احمد کو ملیحہ احمد کی فرمائش پوری کرنے سے روک نہیں پائے گی۔ دروازے میں کھڑی امی نے حیرت سے اور تشویش سے روتی ہوئی دعا اور کسی غیر مرئی نقطے کو تکتی گل اس کے کھلے منہ اور بہتی رال کو دیکھا اور کسی پریشان کن خیال کے تحت تیزی سے اندر آئیں۔

”دعا! کیا ہوا بیٹا! کیوں رو رہی ہو ایسے؟ کیا ہو گیا ہے؟“ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔ دل ہی دل میں خود کو بھی کوسنے لگیں کہ باتوں میں انہیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا دوسرے دعا کی طرف سے بے فکر بھی تھیں۔ انہیں یقین تھا وہ گھر کو ان سے بھی زیادہ اچھا سنبھال سکتی ہے لیکن اب دعا کو اس طرح

روتے دیکھ وہ بے حد پریشان ہو گئی تھیں۔

گل کو صحیح سلامت دیکھ کر کچھ ڈھارس تو بندھی لیکن یہ خیال ساتھ دامن گیر ہوا کہ کچھ تو ایسا ہوا ہے جس نے دعا جیسی صابر اور معاملہ فہم لڑکی کو رلا ڈالا تھا۔

دعا نے آنسو صاف کرتے ہوئے جلدی جلدی وہ سب کچھ امی کو بتایا جسے سن کر ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ یکایک انہوں نے اٹھ کر گل کو بے دردی سے پیٹ ڈالا۔

"تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی گل۔ جب سے پیدا ہوئی ہے میری سزا بڑھتی جا رہی ہے۔" دعا نے بمشکل ان کو گل سے چھڑا کر بیڈ پر بٹھایا۔

"کیا کر رہی ہیں امی آپ؟ اس معصوم کو کیا پتا۔ اس کا کیا قصور ہے؟" وہ افسردہ سی بولی۔

گل اب سسکیاں بھرتے ہوئے "اماں نے مارا۔۔۔۔ اماں نے مارا" کر رہی تھی۔ دعا اسے تھپکنے لگی۔

"اب تمہارے پاپا کہاں ہیں دعا؟" کسی سوچ کے زیر اثر امی نے پوچھا۔

"وہ تو ملی کے پیچھے گئے تھے اس وقت۔ شاید چھوڑنے بھی خود چلے گئے ہوں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

پھر ملیحہ کی اسی ضد میں کتنے ہی دن ایک دوسرے کے تعاقب میں گزرتے چلے گئے۔ پاپا منتیں کر کے تھک گئے۔ دعا نے اس کو کئی بار فون کر کے منانا چاہا لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی کہ جب تک گل اس گھر میں ہے وہ واپس نہیں آئے گی۔ بالآخر پاپا نے سرد لہجے میں دعا کو مخاطب کیا۔

"گل کا سامان پیک کرو میں اسے اسپتال چھوڑ آتا ہوں۔" ہاں انہوں نے پاگل خانے کے بجائے اسپتال کا لفظ کہا تھا لیکن وہ دونوں ماں بیٹی سمجھ گئی تھیں۔ رفعت بیگم تو رو ہی پڑیں اور توقیر احمد کو اس قدم سے باز رکھنے کے لیے منتیں کرنے لگیں۔

"مت ایسا ظلم کریں توقیر احمد۔ مت کریں ایسا۔ خدا گواہ ہے میں نے ملیحہ کو اپنی بیٹیوں پر ہمیشہ فوقیت دی ان سے بڑھ کر سمجھا ہے۔ گل ایسی ہے اس میں میرا یا اس کا کیا قصور۔ میں۔۔۔ میں وعدہ کرتی ہوں اسے اب کھلا ہرگز نہیں چھوڑوں گی‘ ملی کو گل سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ مجھ بدنصیب کو مزید دکھ مت دیں۔" دعا سہمی ہوئی نظروں سے کبھی ماں کو کبھی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ توقیر احمد پیشانی پر لاتعداد شکنیں لیے خاموش بیٹھے رہے۔

"دعا! آپ کو جیسا کہا ہے ویسا کریں۔ ایک گھنٹہ ہے آپ کے پاس۔" توقیر احمد سپاٹ چہرہ لیے وہاں سے اٹھ گئے۔

روتی ہوئی رفعت بیگم ایک دم جیسے ساکت رہ گئیں۔ مہد۔۔۔۔ ہاں مہد ایک ایسا شخص ہے۔ جو ملیحہ کی ضد کو ختم کر سکتا ہے۔ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں مہد کا نام ایک ٹمٹماتے جگنو کی مانند چمکا اور وہ آنسو صاف کرتی‘ دعا کو بتا کر درمیانہ دروازہ کھول کر بہن کے گھر چلی گئیں۔ مہد اور سمیعہ بیگم گھر پر ہی مل گئے۔ بہن کو سامنے دیکھ کر ضبط ہاتھ سے رخصت ہوا اور رو رو کر ساری کتھا کہہ سنائی۔

مہد خاموشی سے بیٹھا ساری بات سنتا رہا پھر رفعت بیگم کی امید بھری نظروں پر وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ وہ ملیحہ کو اس کی ضد سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن زیادہ یقین دہانی نہ کرا سکا کہ ملیحہ کو بچپن سے جانتا تھا وہ جس بات پر ایک دفعہ اڑ جاتی اس سے اسے ایک انچ بھی پیچھے ہٹانا ناممکن تھا‘ چاہے اس میں اس کا اپنا نقصان کیوں نہ ہو جاتا۔

رفعت بیگم کی حالت اور یہ سن کر کہ توقیر احمد آج ہی ملیحہ کی فرمائش پوری کرنے والے ہیں فوراً" ہی ملیحہ سے ملنے کے لیے چلا گیا لیکن دو گھنٹہ بعد وہ بے حد مایوسی کی حالت میں واپس آیا کہ ملیحہ اس سلسلے میں کسی کی بھی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ وہ خود بجھا بجھا اور افسردہ سا تھا۔ شاید اس لیے کہ ملیحہ نے ہمیشہ اپنی بات ہی منوائی تھی۔ اور وہ اس سے اتنی شدید محبت کرتا تھا کہ اس کی بات ماننے میں ہمیشہ خوشی محسوس

کرتا اور بعض دفعہ ملیحہ اس کے ساتھ زیادتی بھی کرجاتی تو بھی ہنس کرٹال دیتا تھا لیکن آج پتا نہیں کیوں ملیحہ کی یہ بے جا ضد اسے ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا کررہی تھی۔ اور ہوا بھی وہی جیسا وہ چاہتی تھی۔

رفعت بیگم کا رونا پیٹنا اور دعا کی التجائیں بیکار گئیں اور تو اور تایا نے بھی توقیر احمد کو مناسب لفظوں میں روکنا چاہا لیکن کل اگر توقیر احمد شہلا کی محبت کے آگے بے بس تھے تو آج بیٹی کی اندھی محبت ان کے ہاتھ باندھے ہوئے تھی۔ گل جاتے سمے اپنی بدقسمتی سے بے خبر تالیاں بجا بجاکر بہتی رال کے ساتھ خوشی کا اظہار کررہی تھی۔ دعا سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ وہ زبردستی امی کو کمرے میں لے گئی۔ ابھی اسے گئے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا مگر پورا گھر ویران لگ رہا تھا۔ امی گھٹ گھٹ کررو رہی تھیں۔ خالہ بھی آگئی تھیں۔ دونوں نے بمشکل نیند کی گولی کھلا کر ان کو لٹادیا۔ توقیر احمد رات گئے واپس آئے تھے۔

دعا کو ساری رات نیند نہ آسکی۔ وہ بار بار گل کے خالی بستر کی طرف دیکھتی۔ وہ روز اسے بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کے بستر تک لاتی اس سے باتیں کرتی رہتی تھپکتی رہتی جب تک نیند کی مہربان پری اس پر مہربان نہ ہوجاتی۔ اسی طرح بیدار ہونے پر اسے واش روم لے جانا پھر ناشتے کے لیے آمادہ کرنا اور بعض دفعہ اس چکر میں اسے کالج سے بھی خاصی دیر ہوجاتی تھی۔ گل کے ساتھ گزرا وقت یاد کرتے کرتے کب رات کا گہرا اندھیرا روشن سویرے میں بدل گیا اسے پتا ہی نہ چلا۔

رفعت بیگم کا بیدار ہونے پر رو رو کر رات سے بھی زیادہ برا حشر تھا۔ دعا نے ملازم کے ساتھ مل کر ناشتا ٹیبل پر لگادیا تھا۔ کیونکہ توقیر احمد ہر کام کو مقررہ وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ دنیا اور گھر کی اونچ نیچ کبھی ان کے معمول پر اثر انداز نہ ہوتی۔ ان کی ذات کے لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے کے عادی تھے۔

حسب معمول وہ ناشتے کی ٹیبل پر نک سک سے تیار موجود تھے۔ ”تمہاری امی کہاں ہیں 'بلاؤ انہیں۔“ انہوں نے دعا کی روئی روئی آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لیٹی ہوئی ہیں اندر۔“ دعا نے آہستہ سے کہا۔

”کب تک یہ سوگ منانے کا ارادہ ہے؟ ان سے کہو وہ زندہ ہے ابھی 'مری نہیں ہے۔ جس دن مرجائے یہ شوق بھی پورا کرلیں۔ فی الحال میں اس قسم کا ماحول گھر میں برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ آج ملیحہ آرہی ہے۔ اس کے سامنے نہ تو ایسا موڈ ہو آپ لوگوں کا نہ کوئی ایسی بات ہو جس سے اس کو برا لگے۔ اگلے ہفتے تک منگنی کا فنکشن بھی رکھ رہا ہوں۔ بہت ڈیلے ہوگیا ہے پہلے ہی۔“ وہ ناشتا کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

دروازے میں کھڑی رفعت بیگم نے دکھے دل کے ساتھ شوہر کے یہ احکامات سنے اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئیں۔

”ہائے گل! میری بچی کیسی ہوگی؟ کیسے باپ ہو توقیر احمد! ہوش و حواس سے بیگانہ سہی پر ہے تو گل بھی تمہارا ہی خون۔ کیا ایک دفعہ بھی تمہارا دل نہیں کانپا — کے ٹکڑے کو پاگلوں کے درمیان چھوڑ آنے پر۔“ اس سوچ کا آنا تھا کہ ان کے رکے آنسو ایک بار پھر رواں ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

دعا دو دن سے چھٹی پر تھی۔ ملیحہ شام کو توقیر احمد کے ساتھ اسی طمطراق سے واپس لوٹی جس سے گئی تھی۔ اسے اپنے کسی فعل پر شرمندگی نہیں تھی۔ رفعت بیگم اپنے کمرے میں ہی تھیں کل سے۔ رات کے کھانے پر دعا بمشکل انہیں باہر لائی تھی۔ پتا تھا کہ ان کو — نہ پاکر توقیر احمد کا موڈ بگڑ جانا تھا۔ ایک ہی دن میں نچڑ سی گئی تھیں رفعت بیگم۔ ملیحہ البتہ خوب چہک رہی تھی۔ کسی کا دل اجاڑ کر لوگ پتا نہیں کیسے اتنا خوش رہ لیتے ہیں؟ انہوں نے ایک نظر باپ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ملیحہ پر ڈالتے ہوئے سوچا۔

"کیا بات ہے امی! آپ کھانا کیوں نہیں کھارہیں۔" اچانک ہی اس نے رفعت بیگم پر نظر کرم کی۔

"تمہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری تو خواہش پوری ہوگئی ناں۔" انہوں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

دعا کا نوالہ ــــ لیا ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا۔ توقیر احمد کے چہرے کے نقوش تن سے گئے۔ لاڈلی بیٹی کے ساتھ اس قسم کا رویہ انہیں ہرگز گوارا نہیں تھا۔ وہ تو شکر ہے اسی پل مہد کی آمد پر ملیحہ نے رفعت بیگم کی طرف سے روئے سخن موڑ کر توجہ اس جانب مرکوز کرلی۔ دعا نے سکون کا سانس لیا۔ اور ماں کو کمرے میں لے گئی۔

اگلے دن رفعت بیگم ناشتے کی میز پر خود ہی آگئی تھیں اور آتے ہی انہوں نے پہلا مطالبہ یہی کیا کہ وہ اپنی گل کو دیکھنا' اسے ملنا چاہتی ہیں۔

"دعا! آپ جب کالج سے واپس آجائیں تو مجھے انفارم کردیجیے گا گاڑی بھیج دوں گا۔ پھر آپ اس سے مل آنا۔" ایک طویل خاموشی کے بعد انہوں نے مژدہ جاں فزا سنایا تھا۔

دعا کالج کے لیے اور ملیحہ یونیورسٹی کے لیے نکل گئی تھیں۔ شام کو انہوں نے جس گل کو جاکر دیکھا۔ وہ ان کی گل ہرگز نہ تھی' بے شمار پاگل عورتوں کے درمیان مخصوص یونیفارم میں بے تاثر آنکھوں' بہتی رال اور کمزور چہرے والی کو رفعت بیگم نے تڑپ کر گلے سے لگالیا۔ ماں بہن کے چہرے' ان کا لمس بھی اس کے شعور کو نہ جگا سکا ورنہ رفعت بیگم اور دعا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر ضرور پھیل جاتا تھا اور اب وہ تاثر ندارد تھا۔

وہ کس حد تک غنودگی کے زیر اثر لگی اور اس مختصر وقت میں جو ملاقات کے لیے مخصوص تھا اس پر نیند طاری ہوگئی اور وہیں اپنے سینتیس نمبر بیڈ پر وہ پھیل کر سوگئی۔ وہاں کا ماحول' پاگل عورتوں کی چیخ وپکار اور عجیب وغریب حرکتوں کے بیچ اپنے جگر کے ٹکڑے کی حالت اور وہاں موجودگی رفعت بیگم کے دل کو کاٹ کر رکھ گئی۔ وہ خوش ہونے کی بجائے بے حد دل گرفتہ اور عجیب سی گھٹن لیے واپس آئیں اور باہر آتے ہی وہاں ــ کمپاؤنڈ میں ہی دعا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رودیں۔

دعا کیا کرتی۔ وہ خود بھی گل کو اپنی ماں جائی کو اس حالت میں دیکھ کر گم صم سی تھی۔ دونوں ماں بیٹی کچھ دیر وہیں بیٹھی رہیں پھر بوجھل دل اور قدموں سے واپس لوٹ آئیں۔

اگلے ہفتے ہی ملیحہ کی منگنی کی تاریخ طے کردی گئی تھی۔ گھر کا عجیب سا ماحول تھا' دعا کو نہ تو ملیحہ کی تیاریاں اچھی لگ رہی تھیں نہ ہی اس تقریب میں شرکت کرنے کا دل کررہا تھا۔ کچھ لوگوں کو واقعی دنیا کی ہر خوشی پلیٹ میں رکھ کردی جاتی ہے۔ ملیحہ ان ہی لوگوں میں سے ایک تھی۔ رفعت بیگم کو ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ان ہی بوجھل بوجھل دنوں میں ملیحہ کی منگنی کا دن آکر گزر بھی گیا۔

اگرچہ یہ شروع سے طے شدہ بات تھی پر ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر دعا کے دل کا ایک کونا ہمیشہ کے لیے ویران ہوگیا تھا۔ اگر وہ صرف ملیحہ کے مقدر کا ستارہ تھا تو اس کے دل کا ایک کونا کیوں ہمیشہ اس کے نام پر روشن ہوتا رہا۔ جھلملاتی آنکھوں سے اس نے اسٹیج پر خوش گپیوں میں مصروف اس حسین ترین جوڑے کو دیکھ کر دل گرفتگی سے سوچا اور آنکھ سے نکل آنے والا واحد آنسو اس نے بے مول ہونے سے پہلے ہی صاف کرلیا۔ اس کے بعد ملیحہ اور مہد کی شادی 'ملیحہ کے فائنل امتحان جو دو ماہ بعد تھے' کے بعد ہونا قرار پائی۔

اب مہد اور وہ جو بھی وقت ملتا' ادھر ادھر شادی کی خریداری میں گزارتے۔ رفعت بیگم کی بیماری کے پیش نظر توقیر احمد نے ایک خطیر رقم اپنی بھابھی' مہد کی ماں کے حوالے کی تھی کہ دعا کو ساتھ لے کر وہ ان کی طرف کی تیاری بھی کرلیں۔ اس عرصہ میں دعا ہر ہفتے ماں کو گل کے پاس لے جاتی جس کی ذہنی اور جسمانی طور پر مخدوش ہوتی حالت انہیں ہر ملاقات پر ادھ موا

کرڈالتی۔ وہ زیادہ تر انہیں غنودہ کیفیت میں ہی ملتی تھی۔ اور رفعت بیگم اس کے غم میں گھل گھل کر خود ختم ہورہی تھیں۔

اور اس دن جب دعا بے حد گہری نیند میں تھی صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی جب اس کا دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ "یا الٰہی خیر" وہ ننگے پاؤں ہی دروازے کی طرف بڑھی اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہاں برخلافِ توقع توقیر احمد کو سلیپنگ گاؤن میں ملبوس دیکھ کر وہ پریشان سے زیادہ حیران رہ گئی۔

"پاپا خیر تو ہے ناں۔ کیا ہوا؟"

"تم میرے ساتھ آؤ دعا!" وہ کہتے ہی وہاں سے ہٹ گئے۔ دعا تیزی سے بھاگ کر ان کے کمرے کی طرف گئی۔ وہاں رفعت بیگم کو سکون سے سوتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور توقیر احمد کو ڈھونڈتی لاؤنج اور پھر پورچ کی طرف آئی وہ ڈرائیور سے گاڑی نکلوا رہے تھے اور ابھی تک سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھے۔

"کیا ہوا پاپا؟ کہاں جارہے ہیں اس ٹائم۔"

"آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں دعا!" انہوں نے صرف اتنا کہا اور ڈرائیور کی موجودگی کے سبب کچھ کہنے سے احتراز برتا۔

دعا بھی کچھ حیران کچھ پریشان اندر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے زن سے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر آگے بڑھا دی۔ صبح کی روشنی ہلکی ہلکی پھیل کر پوری کائنات کو اپنی گرفت میں لینا شروع کرچکی تھی۔ دعا اس وقت چونکی جب اس نے جانے پہچانے راستوں پر گاڑی کو دوڑتے دیکھا۔

"پاپا! ہم کہاں جارہے ہیں، گل ٹھیک تو ہے ناں؟ ہم اس وقت کیوں یہاں آئے ہیں؟" اسے پتا بھی نہ چلا اور پتا نہیں کیوں آنسو تیزی سے اس کے گال بھگونے لگے۔ پاپا کے ماتھے کی شکنیں اور طویل خاموشی اسے کسی ان ہونی کا پتا دینے لگی۔ کچھ ہی دیر میں سب کچھ واضح تھا۔ گل کی اچانک موت کی تصدیق کرتا ڈاکٹر۔ ڈاکٹرز پر چیختے چلاتے توقیر احمد۔ شدت غم سے اسے اپنے حواس مفلوج ہوتے محسوس ہوئے۔

اسٹریچر پر لیٹی معصوم گل جس کے چہرے پر اس وقت ابدی سکون تھا۔ پاپا کی گاڑی میں واپسی کا سفر کرتی کسی بھیانک خواب کے زیر اثر دعا اور پیچھے ایمبولینس کا بھیانک سائرن جو ایک تلخ، بے حد تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کررہا تھا۔

امی تو یہ سب دیکھ کر تیورا کر گر پڑیں۔ خالہ بھی آگئی تھیں۔ محلے والے سب جمع تھے۔ ایک بار پھر ہوش میں آنے پر رفعت بیگم ایک طرف خاموش کھڑی ملیحہ کی طرف لپکیں۔

"مار دیا ناں میری معصوم بچی کو تیری ضد نے۔ جشن مناؤ۔ خوشیاں مناؤ ملیحہ! تمہاری آنکھوں میں کھٹکھتا سب سے بڑا کانٹا نکل گیا ہے۔ میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے ناں ملیحہ تو نے۔ دیکھنا تو بھی کبھی خوش نہیں رہے گی۔"

دعا ایک دم سے حواسوں میں لوٹی اور روتی، بین کرتی ماں کو خود میں سمیٹ لیا۔ توقیر احمد سے پتا چلا تھا کہ ڈاکٹرز نے ملیحہ کی موت کو ہارٹ اٹیک کا نتیجہ قرار تھا ساتھ رپورٹس بھی تھیں۔ پر گل کو نہلانے والی عورت نے انکشاف کیا تھا کہ گل کے سر میں کسی گہری چوٹ کا نشان تھا۔ توقیر احمد اسپتال والوں پر مقدمہ کرنا چاہتے تھے پر رفعت بیگم کی بات پر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

"میں نے اپنی بیٹی کا مقدمہ اپنے مالک کے سپرد کیا۔ وہ بہترین منصف ہے اور اگر بات ہے مقدمے کی تو ڈاکٹرز اور عملے پر مقدمہ کرنے سے پہلے یہ سلسلہ گھر سے شروع کیوں نہیں کرتے آپ، جہاں اس مقدمے کی زد میں کئی لوگ آئیں گے۔" ان کا اشارہ کس جانب تھا، وہ سمجھ گئے تھے پر زندگی میں پہلی بار ان کو کچھ کہنے یا ان سے الجھنے کی بجائے انہوں نے آہستہ سے دعا سے کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو اندر لے جائے۔

صدمہ تو شدید تر تھا۔ پر رفعت بیگم اپنی معصوم بچی کا معاملہ خدا پر ڈال کر حیرت انگیز طور پر پرسکون ہوتی چلی گئیں۔ وقت بڑے بڑے گھاؤ پر صبر کی چادر ڈال دیتا ہے۔ وہ بھی رو پیٹ کر ہی سہی صبر کرنا سیکھ گئی

تھیں۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں ملیحہ کے فائنل ایگزام شروع ہو گئے جب اس نے بہانہ بنایا کہ ایسے ٹینشن والے ماحول میں وہ اپنی پڑھائی پر صحیح توجہ نہیں دے پا رہی سو خالہ کے گھر جا کر رہے گی۔ توقیر احمد اور اس کی بات کی نفی کر جائیں ایسا تو کبھی ہی نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اپنی خالہ کے گھر چلی گئی۔

دعا کے وہی معمولات تھے۔ وہ کالج سے آ کر امی کے ساتھ کھانا کھا کے تھوڑا آرام کرتی پھر اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ امی کو بھی وقت دیتی۔ وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ کل تھی تو کتنی مصروفیات ہی اس کے حوالے سے دعا اور رفعت بیگم کو گھیرے رکھتی تھیں۔ اب وہ نہیں تو لگتا تھا کہ مصروفیت نام کی کوئی چیز ان کی زندگی میں رہی نہیں اور فراغت نامی شے نے ان کی زندگی کو بری طرح سے جکڑ لیا تھا۔

توقیر احمد ہر روز ملیحہ کے پاس چکر لگا آتے۔ پیپرز سے فراغت پاتے ہی ملیحہ 'پاپا سے اجازت لے کر خالہ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئی تھی اور اس کی واپسی کے بعد ملیحہ اور مہد کی شادی کا پروگرام تھا۔ ملیحہ کی واپسی کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ شادی کی شاپنگ ایک بار پھر مہد اور وہ اکٹھے مل کر کر رہے تھے۔ ایک دو بار ملیحہ 'دعا کو بھی ساتھ لے کے گئی تھی۔ شادی سے ہفتہ بھر پہلے خالہ نے توقیر احمد کو فون کر کے درخواست کی تھی کہ وہ چاہتی ہیں کہ ملیحہ کو اپنے گھر سے رخصت کریں اور خلاف توقع توقیر احمد مان گئے تھے۔ ملیحہ ایک بار پھر خالہ کے گھر چلی گئی تھی۔

مایوں سے دو دن پہلے خالہ کے گھر سے آنے والے ملیحہ کے فون نے توقیر احمد کو ساکت کر ڈالا تھا۔ دن میں دو تین بار فون پر بات چیت تو روز کا معمول تھا۔ اصل تو وہ بات یا فرمائش تھی جو اس بار ملیحہ نے توقیر احمد کے سامنے رکھ کر بتا دیا تھا کہ اولاد بھی آزمائش ہوتی ہے۔ کبھی دے کر آزمائی جاتی ہے۔ کبھی لے کر اور کبھی اس کے بیچ کی بات ہوتی ہے۔

اس بار ملیحہ احمد نے باپ سے کہا تھا کہ اگرچہ اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے لیکن خالہ کا کینیڈا پلٹ بیٹا جس سے اس کی کوئی دس سال پہلے ملاقات ہوئی تھی پھر وہ بغرض تعلیم کینیڈا چلا گیا تھا۔ بعد میں جاب پھر وہیں شادی کے بعد کبھی واپس ہی نہ آیا تھا۔ خالہ ہی پانچ سال پہلے اس سے مل آئی تھیں اور جب دو سال پہلے اس کی پہلی شادی ٹوٹ گئی تھی' وہ لوٹ آیا تھا۔

مہد سے کہیں زیادہ خوب صورت' کہیں زیادہ مالدار پھر کینیڈا کی شہریت رکھنے والا وہ خوبرو نوجوان جس نے پہلی نظر میں ہی ملیحہ سے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا کہ کاش وہ دو سال پہلے ملے ہوتے اور نجانے کیا ہوا تھا کہ ملیحہ نے بھی اپنے آپ کو فرہاد سے ایک ان دیکھی ڈور میں بندھتے محسوس کیا اور ہر گزرتا دن انہیں قریب لاتا گیا اور آخر کار ملیحہ اپنی پہلی محبت سے دستبردار ہوتے ہوئے توقیر احمد کو ایک بار پھر آزمائش کے دائرے میں کھینچ لائی تھی۔ ایسا دائرہ جو اس کی ذات سے شروع اور اسی کی ذات پر ختم ہوتا تھا۔

ملیحہ کب کا فون بند کر چکی تھی۔ توقیر احمد بے جان ہاتھوں کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے موبائل کو تھامے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورے جا رہے تھے۔

"پاپا۔۔۔ پاپا! کیا ہوا؟" دعا کے بار بار بلانے پر وہ چونکے اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگے جو ان کی غائب دماغی محسوس کر کے ان کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

قسمت اس طرح بھی مہربان ہوتی ہے۔ اتنی فیاض کہ مقدر کا سب سے روشن ستارہ لا کے آپ کی مانگ میں سجا دے ایسے کہ آپ ششدر رہ جائیں۔ اپنا پور پور سجائے وہ اس شخص کی منتظر تھی جسے ہوش سنبھالتے ہی اس نے دل کی سب سے اونچی مسند پر بٹھا

دیا تھا پر کبھی بھی اسے اپنے رب سے مانگنے کی جرات اپنے اندر نہ پائی تھی پر اللہ وہ مہربان کریم ذات پاک جو دیتے ہوئے بندے کے اعمال نہیں اپنی رحمت کو بھی دیکھتا ہے اور جھولیوں کو ایسے بھرتا ہے کہ سمیٹنے کے لیے جگہ تنگ پڑجاتی ہے۔ اس کی کسی نیکی کے عوض وہ نوازدی گئی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ ایک عجیب اور انوکھے احساس کے تحت سر کو جھکا کر بیٹھ گئی۔ شور مچاتی دھڑکنوں کے درمیان اس نے اس کا آنا اور اپنے پاس بیٹھنا محسوس کیا تھا۔ کچھ لمحے ایک معنی خیز سی خاموشی کی نظر ہوگئے۔ اس کی آواز سن کر اس کا دل گویا کانوں میں دھڑکنے لگا۔

"اپنے ہوش سنبھالنے پر میں نے اپنی خالہ کے ہاں ایک بے حد خوب صورت گلابی گڑیا کو دیکھا اور پھر روز اسکول جانے سے پہلے اسے دیکھنا' واپس آنے کے بعد اسے چھونا پھر رات کو سونے سے پہلے جب تک اسے دیکھ نہ لیتا نیند مشکل سے ہی آتی تھی۔ پھر جب وہ گڑیا میرا التفات محسوس کرنے کے قابل ہوئی اس نے مجھ سے پیار وصولنا اور ضد منوانا اپنا حق سمجھ لیا۔ اس کا ایسا کرنا مجھے خوش کردیتا میں نے اپنی زندگی میں اس کے آنے کے بعد کسی کی کمی محسوس نہیں کی۔ میری مصروفیات' میری ترجیحات' پسند ناپسند اس کی مرضی کی تابع ہوتی گئیں۔

امی' ابا نے بارہا اس کے رویے سے مجھے احساس دلانا چاہا کہ وہ فطرتاً" اپنے زعم میں زندگی گزارنے والی ایک خود غرض لڑکی ہے جس نے امی کی بہن کی' ان کی بھانجیوں کی زندگی میں کبھی خوشیوں کی بارش کو نہ برسنے دیا۔ توقیر احمد اور ان کے باقی اہل و عیال کے درمیان وہ لڑکی ایسی چھتری کی مانند تھی جو ان کے پیار توجہ' التفات کے سارے موسم خود پر لے لیتی اور باقی لوگ ترستے رہ جاتے۔ امی اپنی بھانجی کو اس گھر میں میرے حوالے سے لانا چاہتی تھیں۔ مجھے بھی وہ سنجیدہ اور کم گو لڑکی بڑی پسند تھی۔ جسے ہمیشہ دوسروں کی خوشی کا خیال رہا۔"

اس نے آنسو سے اپنے پورے چہرے کو بھیگتا محسوس کیا اور ہاتھ ہولے ہولے کانپنے لگے یہ سب تو وہ پہلے سے اور اس سے زیادہ بہتر جانتی تھی پھر کیوں وہ اسے... کچھ دیر کی توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ امی کی بھانجی مجھے پسند تو تھی پر اس حوالے سے نہیں کہ میری زندگی میں آئے۔ بس اس اچھی لڑکی کے لیے میں نرم جذبات رکھتا تھا۔ میری محبت نے میری محبت کو بڑھاوا دیا۔ کچھ چچا کی بے جا حمایت اور دی گئی آزادی کہ وہ "نہ" سننے کی عادی نہ رہی۔ جائز' ناجائز' اچھا برا اس نے سب سے منوالیا۔ پہلی بار گل کے لیے اس کی ہٹ دھرمی مجھے بہت بری لگی۔ اس نے اس معصوم لڑکی سے خوامخواہ کا بیر باندھ لیا تھا۔ میرے سمجھانے پر بھی وہ باز نہ آئی پر پتا نہیں کیوں میں کبھی اس سے نفرت ہی نہ کرپایا اس کی محبت نے دل میں کسی وسیع سمندر کی طرح گھر کرلیا تھا۔

منگنی کے بعد ہم اور قریب ہوگئے۔ وہ منواتی' لاڈ کرتی' فرمائش کرتی ہی اچھی لگتی تھی۔ پھر ہماری شادی سے صرف سات دن پہلے اس نے کہا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ وہ صرف ایک پسندیدگی تھی۔"

اسے لگا اس کی آواز بھرآئی تھی وہ خود کو رونے سے باز نہ رکھ سکی۔ اس نے اپنا حنائی ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

"اس نے کہا اسے کا آئیڈیل اب ملا ہے۔ اور محض جذباتیت میں وہ اسے گنوا نہیں سکتی۔ چچا کا سر جھک گیا پر ایک بیٹی نے سر جھکایا تھا تو دوسری نے ان کی عزت کی لاج رکھ لی تھی۔ مہد احمد بھی ٹوٹ گیا ہے دعا! اسے سمیٹ لو دعا۔" اس بار وہ اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا۔

"میں اس سے نفرت کرنا چاہتا ہوں دعا۔ تو کیوں پھر یہ دل اس کی طرف ہمک رہا ہے۔ اتنی ذلت اور ٹھکرائے جانے کا اذیت ناک احساس بھی اس کی محبت کو کم نہیں کررہا۔ دعا' مجھے اس ساحرہ کے حصار سے نکال لو۔ خدا کے لیے۔" اس کے یہ الفاظ دعا کو ساکت کرگئے پر وہ تو ہمیشہ سب کے آنسو پونچھتی آئی تھی یہ تو

وہ ہستی تھی جس سے اس نے محبت نہیں عشق کیا تھا بغیر اسے پانے کی تمنا کیے۔

"آئی ایم سوری دعا! اپنے غم میں، میں نے تمہارے جذبات کا بھی خیال نہیں رکھا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری، میرے والدین کی جس عزت کو تم نے سنبھالا دیا ہے، وہ سود سمیت لوٹاؤں گا۔"

"اور محبت؟" اس کی آہستہ سے کہی گئی بات کے جواب میں دعا کے منہ سے نکلی بات اسے چونکا گئی۔ وہ ایک مجروح سے ہنسی ہنس دیا اور آہستہ سے اسے اپنے قریب کرلیا۔

"تم اتنی اچھی ہو دعا کہ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی مجھے تم سے محبت بھی ہو جائے گی۔ بس مجھ سے بے وفائی کبھی مت کرنا کہ زندگی کا یہ امتحان بڑی آزمائش ہوتا ہے انسان کے لیے۔"

"پتا ہے مہد! میں نے آپ کو کبھی اپنی دعاؤں میں نہیں مانگا کہ آپ مجھے اپنی اوقات سے باہر لگتے تھے۔ لیکن ملیحہ پر رشک ضرور آتا تھا۔ میں نے ہمیشہ یہ دعا کہ اپنی بہن سے کبھی حسد نہ کرنے لگ جاؤں، پر میرے اللہ کو میں اتنی عزیز ہوں کہ اس نے مجھے اس بیماری سے تو محفوظ رکھا ہی پر مجھے بن مانگے وہ سب بھی دے دیا جو میں نے مانگا ہی نہیں۔

میرے لیے آپ کے نام کی چھت ہی میرے مقدر کا اوج ہے۔ آپ جب چاہیں مجھ سے ملیحہ کی بات کرسکتے ہیں۔ اسے یاد کرنے کے لیے میرا کندھا اور اپنا بوجھ بانٹنے کو میرا دل ہمیشہ حاضر ملے گا کیونکہ میں خود محبت کی راہ کی مسافر ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ محبت چیز ہی ایسی ہے انسان کو بے بس کردینے والی۔" نم آنکھوں کے ساتھ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہتی وہ مہد کو کسی اور دنیا کی باسی لگی جو راستہ بھٹک کر اس خودغرض دنیا میں آنکلی تھی۔

اسے اندازہ ہوا کہ اللہ اس پر کتنا مہربان تھا کہ شفاف سوچوں والی وہ لڑکی اس کے حصے میں لکھ دی تھی۔ دعا کا قد اس کی نظر میں کچھ اور اونچا ہوا۔ آنے والے دنوں میں ان کے چہروں کی طمانیت اور آسودگی نے ان کے اپنوں کو احساس دلایا تھا کہ مجبوری میں اٹھائے جانے والے قدم نے نہ صرف ان کی عزت کو سنبھالا دیا تھا بلکہ یوں سکون بھی بخشا تھا ورنہ عین وقت پر ملیحہ کی ہٹ دھرمی اور شادی سے انکار نے ان سب کو خصوصاً "توقیر احمد" کو ہلا ڈالا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ بیٹی پر چلائے، غصہ ہوئے اور جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی بھی دے۔ پر اس کی ناں ہاں میں نہ بدلی تھی۔ تھک کر انہوں نے اسے اس کے حصے کی جائیداد دے کر فرہاد کے ساتھ اس کا نکاح پڑھوایا تھا، اس شرط پر کہ ان کا تعلق اس سے ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا تھا۔ وہاں پروا کسے تھی، وہ یہی سمجھ رہی کہ ہمیشہ کی طرح اپنی منوانے کے بعد ضد کرکے، رو دھو کر انہیں منالے گی پر یہ اس کی خام خیالی تھی۔

شمالی علاقہ جات سے واپس آنے کے ہفتے بعد اس کی کینیڈا کے لیے فلائٹ تھی، جب وہ ان کو منانے ان کے آفس پہنچی تھی۔ انہوں نے ملنے سے انکار کردیا تھا۔ وہ وہاں دو گھنٹے ان کے انتظار میں بیٹھی رہی تھی۔ پر وہ پچھلے دروازے سے چلے گئے تھے۔ ملیحہ کو یقین نہ آیا کہ وہ وہی توقیر احمد تھے جو اس کی ایک مسکراہٹ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجایا کرتے تھے۔ وہ فرہاد کو بغیر بتائے وہاں آئی تھی سو اس کی بار بار آنے والی کال پر اسے واپس گھر جانا پڑا۔ ورنہ وہ ان کے پیچھے گھر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اسے اپنے کسی بھی اقدام پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ اس کے خیال میں یہ اس کا مذہبی اور معاشرتی حق تھا پھر توقیر احمد نے ہی اسے یہ بات سکھائی تھی کہ وہ اپنی کوئی بات دل میں نہ رکھے۔ اظہار کرے کہ اس کا باپ اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی، جائز اور ناجائز کا فرق بھلا کر۔ پھر وہ کیوں باپ کو اپنے دل کی بات نہ بتاتی۔

یونیورسٹی کی ڈگری یافتہ وہ لڑکی یہ بات بھول گئی تھی کہ ہر بات اور عمل کے لیے ایک مناسب وقت ہوتا ہے، وہ گزر جائے تو پھر شر اپنی پوری فتنہ سازیوں کے

ہمراہ آتا ہے اور دے کر جاتا ہے خسارہ اور نہ ختم ہونے والا پچھتاوا۔ اس کی انگلیاں نمبر ملا ملا کر تھک گئیں۔

انہوں نے کوئی بیسویں کوشش پر اس کے کچھ کہنے سے پہلے اتنا کہا تھا کہ ان کی صرف ایک بیٹی ہے دعا توقیر احمد جو کہ اب دعا مہد احمد ہے اور وہ ان کے لیے مر چکی ہے۔ ان کے گھر آنے کی غلطی کبھی نہ کرے کہ وہ ایسی صورت میں خود کو شوٹ کرلیں گے اور اسے بھی۔ دعا کی مہد سے شادی پر ملیحہ نے ایک عجیب سا خالی پن تو محسوس کیا ہی تھا پر باپ کا سخت رویہ اور باتیں زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئے تھے۔

کتنی دیر موبائل ہاتھ میں پکڑے وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس بار خالہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی جا رہی تھیں۔ دل میں پاپا کی ناراضی کی پھانس لیے وہ فرہاد کے ہمراہ کینیڈا سدھار گئی۔

رفعت بیگم کو لگتا کہ ان کی قربانیاں رنگ لے آئی ہیں۔ انہیں توقیر احمد جیسے اب پورے کے پورے ملے تھے۔ اگرچہ انہوں نے زبان سے اپنے ناروا سلوک پر شرمندگی کا اظہار نہیں کیا تھا' لیکن عمل سے اور انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شرمندہ ہیں۔ اب آفس سے آنے کے بعد ان کا سارا وقت رفعت بیگم کے لیے ہوتا۔ وہ باقاعدگی سے ڈاکٹر سے ان کا چیک اپ کرانے لے جاتے۔ دعا اور مہد شام کو اکثر چکر لگا لیتے۔ بیٹی کو خوش دیکھ کر رفعت بیگم گویا جی اٹھتی تھیں۔ دعا اکثر دن کو بھی چکر لگا لیا کرتی۔ کبھی وہ خود چلی جاتیں یوں زندگی ایک پرسکون ندی کی مانند سبک خرامی سے رواں دواں تھی۔

ان ہی دنوں دعا کی طرف سے ملنے والی خوش خبری نے دونوں گھروں میں خوشی کی لہر سی دوڑا دی تھی۔ مہد محبت تو پہلے بھی کرتا تھا اس سے اب اس کی توجہ کا اندازہ ہی بدل گیا تھا۔ خالہ نے اس کا کام کاج بند کرا دیا تھا۔ ٹھیک نو ماہ بعد جہاں دعا نے ایک خوب صورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا۔ سات سمندر دور بستی ملیحہ کے ہاں ایک ابنارمل بچی پیدا ہوئی۔ اس کی زندگی جو کچھ ماہ سے تناؤ کا شکار تھی کہ مادر پدر آزاد اس

آزاد معاشرے میں فرہاد کا اپنی پہلی بیوی سے ایک بار پھر تعلق استوار ہو چلا تھا۔ وہ جو اس کو دکھانے کے لیے کہ دنیا صرف اسی پر ختم نہیں ہوتی وہ اس سے زیادہ خوب صورت اور زیادہ مالدار عورت کو اب بھی اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا ہے' کامیاب ہوا تھا۔

جینیفر ایک بار پھر اس کی زندگی میں لوٹ آئی تھی۔ شادی کے صرف شروع کے چند ماہ ہی ملیحہ کے اچھے گزرے تھے۔ خالہ کے واپس پاکستان لوٹ آنے کے بعد جینی کا آزادانہ ان کے فلیٹ میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی بازپرس پر فرہاد کی ایک ہی بات اسے چپ کرا گئی تھی کہ وہ جینی فر سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کو رقابت میں مبتلا کرنے کو ہی اسے بیاہ لایا ہے ورنہ اسے عورتوں کی کمی تھوڑی ہے۔ وہ جیسے رہ رہی ہے' ویسے ہی رہنا چاہے تو ٹھیک ورنہ وہ اسے جلد از جلد طلاق دے کر پاکستان بھجوا دے گا۔

پاپا کی طرف سے ملنے والا سارا کیش وہ شروع دنوں میں ہی اس کے حوالے کر چکی تھی کہ اپنے بزنس میں انویسٹ کرے' بس اب چند لاکھ کا زیور ہی اس پردیس میں اس کی کل متاع تھا۔ اس نے فون پر رو رو کر ساری داستان خالہ کو سنائی تھی' پر اتنی دور بیٹھے وہ کیا کر سکتی تھیں ہاں بیٹے سے ضرور بازپرس کی' جس کا خمیازہ بھی ملیحہ کو بھگتنا پڑا تھا۔ وہ اس سے بالکل ہی لاپروا ہو گیا تھا۔

جینی اس بار اپنا سامان اٹھا کے لے آئی تھی۔ ان دونوں کی بے شرمیاں' بے باکی کے مظاہرے اسے اندر تک جلا ڈالتے۔ پتا نہیں کیوں اب ہر بار فرہاد کا چہرہ دیکھتے ہی اسے مہد کا بے ریا چہرہ یاد آتا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ ہو سکتا ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد فرہاد کا دل بدل جائے پر وہ بھول گئی تھی کہ برائی کا بیج ڈال کر ہم اچھائی کی فصل کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں۔

بالکل گل کی ہی شکل والی اس عجیب الخلقت بچی کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ اسے بے اختیار گل' دعا اور رفعت بیگم یاد آئی تھیں۔ مکافات عمل تو ہر ذی روح کے ساتھ ہے۔ جلد یا بدیر۔ آج یا کل بس اس

کی حکمت ہے کہ اس کی ڈھیل کو انسان اپنا فخر سمجھ لیتا ہے یہ جانے بغیر کہ اس سے بہتر مصنف تو کوئی ہے ہی نہیں۔

فرہاد کا رویہ بچی کے ساتھ ویسا ہی ہوتا جیسا کبھی وہ گل کے ساتھ روا رکھتی تھی۔ اس بچی کو دیکھ کر کراہیت کا ویسا ہی مظاہرہ ہوتا جیسا وہ اپنے گھر کیا کرتی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی چیخ اٹھتا کہ اس کی نظروں سے دور لے جایا جائے۔ اس کے رونے کی آواز پر شامت ملیحہ کی آجاتی۔ پھر تابوت میں آخری کیل جینی کے مشورے نے ٹھونکی جب اس نے فرہاد سے کہا کہ ایسے بچے گھروں میں تھوڑی رکھے جاتے ہیں بلکہ ان ذہنی' جسمانی معذور بچوں کے لیے تو جگہ جگہ سینٹرز اور اسپتالز ہیں۔ ملیحہ زور زور سے روتے ہوئے ان دونوں کی منتیں کرنے لگی کہ وہ ایسا ظلم نہ کریں۔ وہ اپنی بچی کے ساتھ ایک کونے میں پڑی رہے گی ان کے سامنے نہیں آئے گی۔ ایسے ہی ایک پل میں اسے اپنی آواز کسی اور کی آواز میں ڈھلتی محسوس ہوئی۔

"مت میرے کلیجے پر ہاتھ مار ملیحہ! تو بھی کبھی خوش نہیں رہے گی۔" وہ ایسے چپ ہوگئی جیسے کسی چابی سے چلنے والی گڑیا کا بٹن کسی نے اچانک بند کر دیا ہو۔

جب کہ جینی کہہ رہی تھی کہ چونکہ وہ پریگننٹ ہے تو ایسی حالت میں ایسی عجیب و غریب بچی کا دن رات کا سامنا کل کو اس کو ایسی ہی کسی مشکل میں گرفتار نہ کرا دے۔ وہ فرہاد سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی کہ اس سلسلے میں "فوراً" ہی کوئی قدم ضرور اٹھا لے۔ ملیحہ کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ "فوراً" ہی اپنی بچی سمیت اپنے کمرے میں مقید ہوگئی۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جیسے سلب ہوگئی تھیں۔

اس نے خالہ کو "فوراً" فون ملا کر سسکتے ہوئے ساری بات بتائی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے جو کچھ کہا وہ اس کی سماعت پر بم گرا گیا۔

"دیکھو ملیحہ! کینیڈا جیسے تیز رفتار ملک میں تم کب تک ایک معذور بچی کے ساتھ سروائیو کر سکتی ہو۔ فرہاد ٹھیک کہتا ہے اسے سینٹر میں ڈلوا دو۔ تم اس سے مل آیا کرنا۔ وہاں نرسز بہترین ڈاکٹرز موجود ہوتے ہیں بچے کی کیئر کے لیے پھر تم کب تک گھر بیٹھوگی بچے! فرہاد بتا رہا تھا ایک اسٹور پر تمہارے لیے اس نے جاب کی بات کی ہے۔ اب تم اس بچی میں لگی رہوگی تو کھاؤ گی کہاں سے' رہوگی کہاں پر مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو کہ ایسے ممالک میں زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے ہر انسان کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔

فرہاد کے ہاتھ میں اپنا کچھ نہیں ہے' وہ جینی کے ہوٹل کا سپروائزر ہے۔ پھر بھول گئیں ملیحہ تمہارے پاپا نے بھی تو تمہاری پاگل بہن کو پاگل خانے داخل کرا دیا تھا نا بچے! تمہاری ضد پر تو۔ اب کی بار تم کیوں نہیں چاہتیں ایسا۔ دیکھو ملیحہ! میں تمہاری دشمن نہیں۔..."

آگے پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ الفاظ تو سب عام سے ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال انہیں کبھی شہد سے بھی میٹھا بنا دیتا ہے اور کبھی زہر سے بھی کڑوا۔ اس نے ٹھک سے ریسیور کریڈل کے اوپر رکھا اور مڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔

جو دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی گوشت کا ایک لوتھڑا تھی۔ رات کے کسی پہر اس کی بیٹی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے۔

اس نے فرہاد کا دروازہ جا کر بجایا تھا۔ جینی نے مندی مندی آنکھوں کے ساتھ دروازہ آکر کھولا تھا اور اس کا مدعا جان کر کہ رعنا کی طبیعت خراب ہے (رعنا اس کی بیٹی کا نام تھا) اس نے کہا تھا کہ ان کے پاس اتنا فالتو ٹائم ہرگز نہیں ہے کہ ایک معذور بچی کو لے کر آدھی رات کو خوار ہوتے پھریں۔ ویسے بھی ایسی بچی کا مر جانا ہی ان سب کے لیے بہتر ہے۔ جب تک اس نے خود ہمت کر کے اسپتال جانے کا قصد کیا تب تک اس کی بچی نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا تھا۔

بچی کی تدفین کے تیسرے دن اس کی طرف سے کیے جانے والے مطالبے نے فرہاد کو پریشان کم حیران زیادہ کیا تھا اس نے کہا تھا کہ اسے طلاق دے کر جلد از جلد

پاکستان بھجوا دیا جائے' وہ ایسی زندگی مزید نہیں جی سکتی۔ فرہاد کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے اس کی فرمائش پوری کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ احسن کو چمچے سے سیریل کھلا رہی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کھلکھلا زیادہ رہا تھا اور کھا کم رہا تھا۔ اس کی ایسی معصومانہ حرکتوں پر دعا کی کھنکتی ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی۔ ایک بھرپور گھر کا ایک بھرپور منظر تھا۔ خالہ کسی کام سے ان کے کمرے کے سامنے سے گزری تھیں جب وہ احسن کو چومتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

''دعا! ماشاء اللہ پڑھ لیا کرو بیٹا! بچوں کو سب سے پہلی نظر اپنی ماں کی ہی لگتی ہے۔'' ان کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا کر ایک بار پھر اس کو گدگدایا تھا۔

ابھی کچھ ہی دیر بعد جب وہ احسن کو سلا کر دروازہ بند کر کے باہر آئی۔ امی اسی وقت ہی آئی تھیں۔ ان کے چہرے سے ہی وہ بھانپ گئی کہ کوئی بات ہو گئی ہے کیونکہ کچھ ایسا ہی تھا ان کے چہرے پر۔

''وہ آ گئی ہے دعا! ایک بار پھر آ گئی ہے ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے۔'' ان کی سرگوشی نما بات پر وہ اور خالہ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر ان کو دیکھا۔

''کون آ گئی ہے رفعت! کس کی بات کر رہی ہو؟'' خالہ برآمدے میں بچھے تخت پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''ملیحہ آ گئی ہے آپا۔ توقیر تو شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے' لیکن اولاد ہے آخر ان کی دل پسیج گیا اپنے خالہ زاد سے طلاق لے کر آئی ہے۔ اپنی خالہ کے گھر ہے' عدت میں ہے۔ عدت ختم ہونے میں بس چند ہی دن رہ گئے ہیں اس کے۔ توقیر بتا رہے تھے کہ ایک ایب نارمل بچی بھی پیدا ہوئی تھی۔ چند دن زندہ رہی وہ۔ توقیر احمد کہہ رہے تھے کہ اس کا کیا آگے آیا ہے میری بددعا لگی ہے اسے۔ انہوں نے مجھے دوش نہیں دیا' بس ایسے ایک بات کی ہے' پر میں کیسے یقین دلاؤں ان کو کہ چند الفاظ جو اس دن میرے منہ سے نکلے تھے وہ اس غم کا ردعمل تھے جو مجھے میری جوان بچی کی موت سے ملا تھا۔ بعد میں کتنی بار میں نے اپنے اللہ سے اپنے الفاظ کے لیے معافی مانگی۔ میری دعا کا گھر بس گیا۔ میری بچی خوش ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے بس اس کا آنا دل میں ہزاروں خدشات پیدا کر رہا ہے۔ اس کا اس گھر میں آنا اور جانا کبھی کوئی اچھائی نہیں لایا اس گھر کے لیے۔ بس اس لیے پریشان ہوں۔'' وہ ہولے ہولے بتاتی رہیں۔

''امی! آپ خوامخواہ پریشان ہو گئی ہیں۔ اتنا تو مانتی ہیں نا کہ نصیب سے کوئی لڑ نہیں سکا آج تک۔ میرا جو نصیب تھا مجھے مل گیا۔ اس کی قسمت کا لکھا اس نے سہا۔ وہ اگر آ رہی ہے تو اس کا گھر ہے' وہ سو بار آئے۔'' دعا نے نرمی سے ماں کو تسلی دلائی تو وہ پھیکا سا مسکرا دیں۔

پھر خالہ نے بھی دعا کی تائید کی۔ ''ہاں رفی' تم خوامخواہ پریشان ہو گئی ہو۔ اب کس بات کا ڈر ہے تمہیں' میرا بیٹا اور بہو ماشاء اللہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ توقیر احمد کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ ان کا تم سے رویہ ہی اس بات کا ثبوت ہے۔ ملیحہ کسی غیر کے نہیں اپنے باپ کے گھر آئے گی اور پھر جو حالات تم نے بتائے ہیں انہوں نے کیا اس پر اثر نہ ڈالا ہو گا۔ بس اللہ ہر بچی کا نصیب اچھا اور روشن لکھے آمین۔'' رفعت بیگم کو بہن کے الفاظ سے زیادہ ڈھارس ملی تھی۔

ایک دو باتوں کے بعد موضوع گفتگو کچھ اور ہو گیا تھا ورنہ رفعت بیگم کل سے بہت پریشان تھیں' جب سے توقیر احمد نے ان سے ذکر کیا تھا۔ شام کو معد سے دعا کی اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ بغور دیکھنے پر بھی اسے خوشی یا غصے کا کوئی تاثر نظر نہ آ سکا تھا۔

''چھوڑو بھی دعا یہ بے کار باتیں۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے ولی عہد کہاں ہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔'' اس نے شگفتگی سے کہا۔

"آپ کے ولی عہد اس وقت ملکہ اول یعنی اپنی دادی اماں کے پاس ہیں۔" جواباً" اس نے اسی انداز میں کہا۔

"گڈ! اس کا مطلب ہے کہ ملکہ دوم اس وقت اپنے بادشاہ کا دل بہلانے کو موجود ہیں۔" وہ کہتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

"ارے ارے مہد! کیا ہو گیا ہے۔" ابھی خالہ مہد کو لے کر آجائیں گی۔ وہ فوراً" ہی دور جا کھڑی ہوئی۔

"کیا ہے یار بیوی...! میرا سارا وقت تو تم اپنے بیٹے کو دینے لگی ہو۔" وہ مصنوعی خفگی سے کہتا بیڈ پر جا بیٹھا۔

"ارے سرتاج! ناراض ہو کر کنیز کی جان پر ظلم مت ڈھایئے۔ کنیز اپنی ہر خطا کی سزا بھگتنے کو تیار ہے۔" وہ فوراً" ہی اس کے قریب آئی اور ایک ادا سے ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ہمیں کنیز کا یہ انداز پسند آیا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا اور اپنی پینٹ کی جیب ٹٹول کر کچھ کاغذات نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑائے۔

"کیا ہے یہ؟" دعا نے پکڑتے ہی حیرت سے پوچھا۔

"شادی سے لے کر اب تک تمہیں کوئی تحفہ ایسا دے ہی نہیں سکا جو تمہارے شایان شان ہو۔ اب ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے اپنی ملکہ کے لیے' اس کے نام کا ایک گھر خریدا ہے۔" اس کا ایسے کہنا دعا کو آسمانوں پر لے گیا۔ شدت جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔

"مہد' میرے لیے میری زندگی میں قدرت کا دیا ہوا سب سے بڑا تحفہ تو آپ ہیں۔ باقی دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔" وہ اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا کر بولی۔

صرف تین دن بعد ان دونوں کی توقیر احمد کے گھر ملیحہ سے ملاقات بھی ہو ہی گئی۔ کھانے کی میز پر جب وہ سب موجود تھے تب توقیر احمد نے ملازمہ سے کہا تھا کہ وہ ملیحہ کو بلا لائے۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ آگئی تھی۔

دعا تو تھی ہی محبت و ایثار کا پیکر۔ اٹھ کر پورے جوش و خروش سے اسے گلے سے لگایا ہاں مہد نے اس کے آہستہ سے کیے گئے سلام کا جواب ——— دے کر سرسری سا اس کی خیریت پوچھی اور اس کا جواب سنے بغیر توقیر احمد سے کوئی دفتری معاملہ ڈسکس کرنے لگا۔

نجانے کیوں ملیحہ سے اس کا اس قدر اجنبی رویہ برداشت نہ ہو سکا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ مہد تو تھوڑی ہی دیر میں کھانا کھا کر اٹھ گیا جب کہ دعا کافی دیر تک ملیحہ کے ساتھ بیٹھ کر بڑی محبت سے اس کا حال احوال دریافت کرتی رہی۔ پھر رفعت بیگم نے ہی اسے ٹوکا کہ احسن سو چکا ہے۔ اسے اپنے گھر جانا چاہیے کیونکہ مہد بھی آچکا ہو گا۔ ورنہ اس کا ملیحہ کے لیے تسلی بر پروگرام ابھی اور چلنا تھا۔

اگلے روز توقیر احمد کے کہنے پر ملیحہ' مہد کے امی ابو سے بھی ملنے آئی تھی۔ تایا نے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ تائی بھی گلے لگا کر ملی تھیں۔ ویسے بھی وہ سب اپنی زندگی میں مگن تھے۔ اب ان کو اس سے کوئی پرخاش نہیں رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کا وقت تھا۔ مہد کا بار بار دعا کو اپنے ہر کام کے لیے بلانا نجانے کیوں اندر ہی اندر اسے گھٹن میں مبتلا کرنے لگا۔ کاش آج سے کچھ عرصہ پہلے وہ اگر نفس کی لپیٹ میں نہ آئی ہوتی تو دعا کی جگہ وہ ہوتی۔ اس نے مہد کے اردگرد پھرتی مسکراتی دعا کو دیکھ کر اپنی خالی ہتھیلیوں کی جانب نگاہ کی۔

"یہ برخوردار! باپ بننے کے بعد کچھ زیادہ ہی لاڈ نہیں اٹھوانے لگے بیوی سے۔ مجال ہے جو ٹک کر دو گھڑی بچی کو بیٹھنے دیا ہو۔" تایا' مہد کا دعا کو بوکھلائے دیتا کافی دیر سے دیکھ رہے تھے سو بیوی کو مخاطب کر کے بولے۔

"یہ بھی توجہ حاصل کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے جناب۔ خود آپ کون سا کم ہیں۔ آج بھی جب تک میں موجود نہ ہوں موصوف کو نہ سامنے پڑی ٹائی رکھی نظر آتی ہے نہ ہینگ کیا ہوا سوٹ۔ ورنہ میری بہو تو ماشاء اللہ اتنی سگھڑ ہے کہ رات کو ہی اس کی ساری

تیاری کر کے رکھتی ہے پھر بھی آپ کا بیٹا صبح صبح ایسی ہڑبونگ مچاتا ہے کہ وہ بے چاری بھی گھبرا جاتی ہے۔"
ملیحہ کی آنکھوں میں مرچیں سی لگیں اور دل دھواں دینے لگا۔

وہ اس مکمل منظر میں خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے اٹھ گئی اور اندر آکر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ان سب کا محبت بھرا رویہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ دل نے محسوس کی تھی تو اس ستمگر کی بے رخی' وہ اسے دیکھ کر نارمل سا ایسے کلام کرتا جیسے کسی اجنبی سے راہ چلتے خیریت پوچھ لی جاتی ہے۔

بہت دن سے دعا شاپنگ کے لیے جانا چاہ رہی تھی۔ وہ عموماً مہد کے ساتھ ہی جاتی تھی' لیکن آج کل وہ کچھ مصروف تھا تو اس نے صبح اس کو یاد دہانی کروائی تھی کہ وہ دوپہر تک گاڑی بھیج دے۔ وہ لگے ہاتھوں یہی کام ہی نبٹا آئے۔ سو احسن کو خالہ کے حوالے کر کے وہ مارکیٹ چلی آئی تھی۔ پیاس محسوس ہونے پر نزدیکی ریسٹورنٹ میں اس نے فریش جوس کا آرڈر دیا اور ادھر ادھر دیکھنے پر جو منظر دیکھنے میں آیا اس نے اس کی ہستی تک کو ہلا ڈالا۔

بائیں جانب انتہائی کونے میں پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ کچھ بولتی ملیحہ تھی اور اسے انتہائی سنجیدگی اور غور سے دیکھتا مہد ہی تھا۔ درمیان کا پورا سال جیسے دھواں بن کر اڑ سا گیا تھا۔

رفعت بیگم کے خدشات صحیح تھے۔ وہ ایک بار پھر ان کی زندگیوں میں زہر گھولنے آئی تھی۔

"تو یہ مصروفیت تھی مہد آپ کی۔" اس نے واپسی کے سفر میں سوچا۔

واپسی پر مہد کا رویہ اس کی توجہ' محبت سب کچھ ویسا تھا تو دن کا منظر کیا میری نظر کا دھوکا تھا۔ بہت دیر وہ الجھن میں رہی کہ اس سے پوچھے یا نہ پوچھے۔ امی نے کہا تھا "محبت کے سلسلے میں مرد کو آزاد چھوڑ دو۔ اگر وہ تمہاری محبت میں سچا ہے تو درمیان میں آئی ہر چیز راستے کا پتھر ہے۔ مرد کی غلطیوں کی نشاندہی اس کو مزید شیر بنا دیتی ہے۔" سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

اگلے دن امی کے کسی کزن کی اچانک وفات پر ان سب کو جانا پڑا تھا۔ صرف ملیحہ گھر پر تھی۔ دل میں لگی آگ کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ کل اس نے مہد کو ہوٹل میں بلا کر اپنے گناہ کی معافی مانگی تھی اس نے کہا تھا کہ وہ اسے بہت پہلے معاف کر چکا ہے۔ خوش گمانی کی نئی راہ گزر پر قدم رکھے وہ گھر لوٹ آئی تھی۔

آج صبح جب سب لوگ جا رہے تھے تو وہ قصداً رک گئی تھی کہ مہد نے کہا تھا وہ نماز جنازہ کے فوراً بعد گھر آجائے گا کیوں کہ ایک بجے اسے ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی۔ بارہ بجے اس کی گاڑی کا ہارن سن کر وہ دھڑلے سے تائی کے گھر چلی آئی تھی۔ وہ شاید اپنے کمرے میں تھا اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ نہا کر واش روم سے نکلتا دکھائی دیا۔

"تم۔" حیرت سے مہد کی زبان سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔

ملیحہ بھاگ کے اس سے لپٹ گئی۔ "مجھے یقین نہیں آتا مہد کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں دعا کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔ کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ تم۔ تم اسے طلاق دے دو۔ ہم شادی کر لیتے ہیں مہد...... ہم......" ابھی اس کا فقرہ منہ ہی تھا کہ مہد نے جھٹکے سے اسے کھینچ کر خود سے دور کیا باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

مہد کا چہرہ اور آنکھیں بے حد سرخ ہو گئیں۔ ضبط سے اس کی ماتھے کی نس ابھر آئی تھی۔ چند قدم مضبوطی سے چلتا وہ اس کے قریب آیا۔

"تم ملیحہ توقیر احمد! جتنی گھٹیا کل تھیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ آج ہو' میں سمجھ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ ہونے والے حادثات نے تمہیں بدل دیا ہو گا پر ہدایت بھی انہیں ہی ملتی ہے جو اس کی طلب کرتے ہیں۔ ہاں میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا' اس لیے کہ تمہارے

انکار پر مجھے دنیا کی حسین ترین عورت ملی۔ حسین جانتی ہو کون ہوتا ہے؟ جس کا دل حسین ہو۔ دعا کا باطن خوب صورت ہے۔ تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وہ سات دن میں نے رب سے شکووں میں گزارے' پر دعا سے شادی کے بعد میں شکر کی نعمت سے مالا مال ہو گیا۔ پر میں تمہیں کبھی بھول نہیں پایا۔

تم جیسی عورتوں کو چاہنے کے باوجود بھی بھلایا نہیں جاتا' جانتی ہو کیوں؟ عبرت کے طور پر۔ تم تو سکھ کے دنوں میں ہی کسی اور کی اسیر ہو گئیں۔ اس نے دکھ میں میرا ساتھ نبھایا۔ میں دعا سے آج تک شرمندہ تھا کہ وہ میرے پورے دل پر قابض ہو تو گئی اپنے ایثار سے' محبت سے سوائے ایک کونے کے جس میں تمہاری محبت نے پنجے جمار کھے تھے اور آج تمہاری باتوں نے تمہارے عمل نے وہ کونا بھی دعا کے لیے خالی کر دیا ہے۔ آئندہ میرے پورے دل کی مکین وہی ہوگی۔ اپنا آپ اتنا مت گراؤ ملیحہ کہ کبھی ایسا وقت آئے کہ خود سے آنکھ ہی نہ ملا سکو۔

توقیر انکل نے تمہارے لیے اپنے آفس کا ایک لڑکا دیکھا ہے۔ اگر ذرا برابر بھی تمہیں ہم میں سے کسی کا احساس ہو تو فوراً" شادی کر کے یہاں سے چلی جانا ہماری زندگیوں سے کہیں دور۔" ملیحہ ساکت کھڑی آگ جیسے وہ لفظ اپنی سماعت میں اتارتی رہی اور جب اس نے مہد کو رخ موڑ کر دوسری جانب دیکھتے پایا تو برداشت نہ کر سکی اور منہ پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے بھاگتی چلی گئی کہ اس بار زندگی نے جو ٹھوکر اسے لگائی تھی وہ بہت شدید تھی۔

یہ دیکھے بغیر کہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی دعا نے مہد کا حرف حرف اپنے کانوں میں اتار کر اس کی مٹھاس اپنے دل میں محسوس کی تھی۔ بچے کے بے حد تنگ کرنے پر اس نے تایا سے کہا تھا اسے واپس گھر بھجوا دیں۔ بچے کو آہستہ سے لٹا کر وہ اس کے پیچھے آئی اور پھر ـــــ اس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

اس کی چوڑیاں' مخصوص خوشبو کو وہ پہچان تو گیا پر پیار سے بولا۔۔۔۔ "کون۔۔۔۔؟"

"آپ کے پورے دل کی مکین۔" اس کی سرگوشی نما آواز پر وہ دھیرے سے مسکرایا اور اس کے بازو اپنی گردن سے نرمی سے ہٹا کر اسے اپنے سامنے لے آیا اور نرمی سے اپنے اندر سمیٹ لیا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ان دونوں کی گفتگو سن چکی تھی اور اپنے شوہر کے پورے دل کی مکین ہونے کی سند پا گئی تھی۔

فاطمہ اسحاق

ڈھیٹ

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے اماں، یہ آنیہ تو اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ایسے ملاتی ہے کہ جیسے گونگی بہری اور عقل سے پیدل ہے۔" ناعمہ آپا نے اپنی عادت کے مطابق تبصرہ کیا۔

"ہاں تو وہ اس کا شوہر ہے اور ابھی شادی کو اتنے دن ہی کہاں ہوئے ہیں جو وہ شوہر سامنے زبان چلائے۔"

اماں نے اس کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری نہیں سمجھا۔

"دیکھو اماں، مجھے تو سب جانتے ہیں۔ میں تو تبھی بھی غلط بات برداشت نہیں کرتی، چاہے سامنے میرا شوہر ہو یا پھر میرا باپ، منہ پہ سناتی ہوں۔" انہوں نے فخریہ کالر جھاڑے۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ ان کی چھوٹی بہن آنیہ شادی کے ہفتے بعد اماں اور ان سے ملنے میکے آئی تھی۔ ناعمہ

آپا چاہتی تھیں کہ وہ تین چار دن ان کے پاس گزار کر جائے مگر عمران (آنیہ کا شوہر) بضد تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جائے گا اور آنیہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑی' جس کے بعد سے ناعمہ آپا بھری بیٹھی تھیں' کیونکہ آج تک ان کے سامنے انکار کرنے کی کسی نے ہمت نہیں کی تھی اور آج بقول ان کے ان کی لاڈلی بہن ان کی برسوں کی محبت فراموش کر کے شوہر کے سنگ رخصت ہو گئی۔ لاوا ابلنا تو بنتا تھا نا' سو اب انہیں اس دن کا دوبارہ سے انتظار تھا کہ جب آنیہ' عمران میاں کو لے کر دوبارہ میکے کے درشن کرے تاکہ وہ اس کا مزاج درست کریں اور بالآخر وہ دن آ ہی گیا۔

☆ ☆ ☆

"ارے ناعمہ' دیکھ لینا ذرا کھانے میں کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے۔ آج میری آنیہ آ رہی ہے۔" اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آنیہ کی آمد پر پر لگا کے اڑنے لگیں۔

"بس اماں بس فکر نہ کرو کوئی کمی نہیں رہے گی۔ آج تو سب کچھ ضرورت سے زیادہ اچھا ہو گا۔" آج ان کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی' جو کہ اگر اماں غور سے دیکھتیں تو کبھی ان سے مخفی نہ رہتی' ناعمہ آپا کو بڑے ہونے کی وجہ سے بچپن سے ہی خاص پروٹوکول ملتا آیا تھا' اماں نے کبھی ان کی بات کی نفی نہیں کی تھی اور خاندان بھر میں بھی یہی مشہور تھا کہ ناعمہ آپا کبھی بھی غلط بات برداشت نہیں کر سکتیں۔ دوسروں معنوں میں یہ کہنا زیادہ بہتر رہے گا کہ وہ دوسروں کی "بے عزتی کرنے میں ماہر تھیں" جس کی وجہ سے ان کے گھر میں ان کے لیے رشتے آنا ہی بند ہو گئے۔ جو بھی آتا وہ دھیمی مسکراہٹ والی معصوم سی آنیہ کو پسند کر لیتا اور پھر یہاں پہ اماں نے سوچا کہ کیوں نہ سمجھ داری سے کام لیں اور پہلے آنیہ کو ہی رخصت کر دیں کیونکہ ناعمہ کا جب نصیب کھلے گا تو کہیں پر بات بن ہی جائے گی سو انہوں نے آنیہ کو ہی رخصت کر دیا۔

اماں کی یہ بات ناعمہ آپا کو تو بہت بری لگی مگر انہوں نے سب کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ویسے یہ بات اتنی بھی معمولی نہیں تھی کہ اماں نے ان پر آنیہ کو فوقیت دی تھی۔ سو اب ان کے نزدیک وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ سکون سے رواں دواں ندی میں اپنے پھینکے گئے کنکر سے ہلچل مچائیں۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم آپا' میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی مگر آپ باہر نہیں آئیں تو سوچا کمرے میں ہی آپ سے مل آؤں۔" آنیہ کو آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی مگر ناعمہ آپی کا فی الحال کوئی موڈ نہیں تھا عمران کے منہ لگنے کا' سو وہ ابھی تک کمرے سے ہی نہیں نکلی تھیں۔ ناچار آنیہ کو ہی ان سے ملنے کے لیے آنا پڑا۔

"وعلیکم السلام۔" کیسی ہو؟ باہر کیوں انتظار کر رہی تھیں' اسی وقت عمران کو لے کر مجھ سے ملوانے نہیں لا سکتی تھیں' خود سے تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ اپنی بڑی بہن کی کیسے عزت کروانی ہے' ہر بات تمہیں بتانا پڑتی ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اففوہ آپا' خدا کے لیے' کبھی تو کسی دوسرے کی بھی عزت کا خیال کر لیا کریں۔" آنیہ نے قدرے چڑ کر کہا۔

"اوہو بس کرو بنو' ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں سسرال گئے ہوئے اور مجھے سکھا رہی ہو کہ دوسروں کی عزت کا خیال کیسے رکھا جاتا ہے۔" جو بھی تھا آپا کو بہت غصہ آیا کہ جو آنیہ ان کی کہی ہر بات برداشت کر جاتی تھی' آج وہ ان کے سامنے زبان چلا رہی ہے۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہے آپا! میں آپ کو سکھا نہیں رہی صرف موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آج آپ عمران کے سامنے اپنی انا کی دیوار کو گرا دیں گی تو کچھ بھی برا نہیں ہو گا بلکہ آپ کی ہی عزت

میں اضافہ ہوگا۔" آنیہ نہیں چاہتی تھی کہ عمران کو کسی بھی بات کا علم ہو، سواس کی آواز بہ نسبت آپا کے قدرے دھیمی تھی۔

"ارے بنو! یہ تمہاری بھول ہے کہ میں اسے آج کوئی عزت دینے والی ہوں۔ اسے تم نے بتایا نہیں کہ کس طرح سارا خاندان میری عزت کرتا ہے۔ آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی میری سامنے بولنے کی اور اس میں اتنی جرأت آگئی کہ میری بات ٹال دے۔" انہیں اس دن سے قلق تھا کہ انہوں نے اسی دن اسے کھری کھری سنائی کیوں نہیں اور اب جب انہیں موقع ملا تھا تو وہ کیونکر خاموش رہتیں۔

"یہ آپ کی غلط فہمی ہے آپا کہ سارا خاندان آپ کی عزت کرتا ہے، وہ سب آپ کی عزت نہیں کرتے بلکہ آپ کی زبان درازی سے بچنے کے لیے آپ کے سامنے نہیں بولتے۔ ارے آپ کو اگر اتنا ہی زعم ہے کہ سارا خاندان آپ کی عزت کرتا ہے تو آپ خود سوچیں، ابھی تک آپ کنواری کیوں ہیں؟ ان سب میں سے کسی نے بھی آپ جیسی "عزت کی دیوی" کو اپنے گھر کا چراغ کیوں نہیں بنایا، آپ کو اس بات کا غرور ہے نا آپا کہ آپ دوسروں کی عزت اتارنے میں ماہر ہیں تو اگر آپ ایک دفعہ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو آپ کا دل کانپ جائے، خوف سے۔ ہم ناچیز بندوں کی اتنی اوقات کہاں آپا، یہ عزّت و ذلّت دینا تو اللہ ہی کو زیب دیتا ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر آپا کے چہرے کی جانب دیکھا، ان کے چہرے پر کسی بھی قسم کا غصہ نہیں تھا اب، مگر شرمندگی کے بھی آثار نہیں تھے۔ اسے لگا کہ جیسے اگر آج بھی وہ اماں کی طرح خاموش رہی تو ان کے ساتھ غلط ہوگا، کیونکہ آج تک انہیں ان کی غلطیوں کا کسی نے احساس دلایا ہی نہیں تھا۔

شاید اس میں اماں کی بھی غلطی شامل تھی۔ ماں ہی تو وہ فرد ہوتی ہے جو اولاد کو پروان چڑھاتی ہے۔ اس کی اچھی یا بری شخصیت کی ذمہ داری بھی ماں پر آتی ہے۔ اگر آپا نے پہلی دفعہ اپنی زبان کے جوہر دکھائے تھے تو اماں کو چاہیے تھا کہ وہ انہیں سمجھاتیں نہ کہ انہیں مزید حوصلہ دیتیں، حوصلہ افزائی ہوئی تھی تب ہی تو ان کی شخصیت ایسی بن گئی تھی۔

"میں نے عمران کے سامنے آپ کی بہت تعریفیں کی تھیں اور اب میں نہیں چاہتی کہ آپ ایسی کوئی بھی بات کریں جس سے میرا "مان" اور آپ کا "بھرم" ٹوٹ جائے۔" وہ کہتے ہی چلی گئی اور اگر رک کر دیکھتی ان کی طرف تو اسے پتا چلتا کہ "بھرم" تو اس کی آپا کا ٹوٹ گیا تھا۔ ناعمہ آپا کو اپنی چھوٹی بہن پر زندگی میں پہلی دفعہ غصہ نہیں آیا بلکہ اس وقت ان کے دل نے شدت سے خواہش کی کہ کاش اس کے ماں باپ اسے گھر کا پہلا بچہ ہونے کی حیثیت سے اتنا پیار نہ دیتے اور نہ ہی اس کی خامیوں کو نظرانداز کرتے تو آج کا منظر بہت مختلف ہوتا۔

نبیلہ عزیز

اور تیمور نے اسی محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا جس پہ عزت کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اور تیمور نے مسکراتے ہوئے وہ آنسو اپنی پوروں پہ چن لیے تھے۔

"پاگل! میرے ہوتے ہوئے یہ کیوں؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے گال تھپکتے ہوئے کہا۔

"بھائی!" عزت بے اختیار اس سے لپٹ کر رو پڑی تھی۔ "ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ؟ پہلے ہی حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں۔ آپ یہ رسک نہ لیں یہ تو سب سے ٹکر لینے والی بات ہے۔ سب پہلے ہی دشمن ہو رہے ہیں۔ آپ ایسا کچھ مت کریں ابھی بہت وقت پڑا ہے' ہو جائے گا سب کچھ' زندگی ہونی چاہیے بس۔۔۔ میں نے تو بابا سے صرف آپ کے لیے جھگڑا کیا تھا' اپنے لیے نہیں۔"

وہ مسلسل روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور تیمور کے چہرے پہ اب بھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔ تم میرے لیے جھگڑا کر رہی تھیں' اسی لیے تو اب میں بھی تمہارے لیے جھگڑا مول لے رہا ہوں۔" اس نے عزت کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔

"مت لیں جھگڑا مول' جھگڑوں میں کچھ نہیں رکھا' جھگڑے نقصان دیتے ہیں۔" عزت نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن کبھی کبھی جھگڑوں کے بعد بہت کچھ کلیئر ہو جاتا ہے۔ بہت کچھ سمٹ جاتا ہے۔ ہر چیز' ہر بات واضح

اڑتیسویں قسط

ہو جاتی ہے۔ جھگڑے فائدہ بھی دیتے ہیں۔" تیمور کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا۔

"بھائی! بابا جان غصے میں ہیں اور وہ خبیث مونس مرزا ان کے ساتھ ہے۔ اپنی خود غرضی میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" عزت اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو کیا ہم ڈرتے ہی رہیں اور زندگی یوں ہی گزر جائے؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لیکن بھائی! ابھی۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر تیمور نے بات کاٹ دی۔

"نہیں عزت! اب نہیں۔۔۔ اب جو بھی ہوگا سر عام ڈنکے کی چوٹ پہ ہوگا۔ کسی بھی ڈر اور خوف کے بغیر۔" تیمور کا لہجہ انتہائی مضبوط تھا اور عزت اس کے تیور دیکھ کے رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیمور کے اگلے دو دن انتہائی مصروفیت میں گزرے تھے۔

مہمانوں کو مدعو کرنے اور ہوٹل کی ارینج منٹ کی بھاگ دوڑ نے اسے تھکا کے رکھ دیا تھا۔ وہ ہر کام اکیلے اور خود کر رہا تھا۔

عزت کی ضروری شاپنگ کا بھی اسے اچھی طرح خیال تھا۔ اسی لیے ساشا اور اس کی امی کو عزت کے ساتھ شاپنگ کے لیے مارکیٹ بھیج دیا تھا اور خود ماورا کے لیے کپڑے پسند کرنے کے لیے آ گیا تھا۔ اس نے ایک ڈارک گرین کلر کا سوٹ پسند کیا تھا جس پہ ملٹی دھاگے کی کڑھائی کا کام تھا اور اسی کی میچنگ کے سینڈل بھی لیے اور جیولری بھی اور وہاں سے سیدھا گھر آ گیا۔

شاپنگ بیگ اٹھائے وہ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا اور اس کے پیچھے رابعہ بیگم بھی چلی گئیں۔ رضا حیدر اس کی مصروفیت اور بھاگ دوڑ کو بہت گہری اور کڑی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے کیوں کہ انہیں بھی تیمور کی طرح کل کے دن کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

تیمور کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی چوڑیاں تھیں۔

اور انتہائی خوب صورت لباس میں ملبوس، سجی سنوری سی ماورا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

تیمور نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے چوڑیاں پہنانے لگا۔

چوڑیاں تنگ تھیں، اسی لیے پہنانے میں مسئلہ ہو رہا تھا اور اسی مسئلے کی وجہ سے یک دم دو چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور اچانک ٹوٹنے کی وجہ سے کانچ تیمور کے ہاتھ میں پیوست ہو گیا اور خون بہہ نکلا۔

"تیمور۔۔۔!" ماورا اس کی ذرا سی تکلیف پہ یک دم تڑپ کر اٹھ بیٹھی تھی اور بے ساختہ اٹھنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا تو تیمور کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ نہ چوڑیاں تھیں نہ خوب صورت لباس اور نہ ہی بناؤ سنگھار تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں اپنے بستر پہ اکیلی بیٹھی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی اور خواب بھی ایسا جو اسے گہری نیند سے جگا کر تکلیف میں مبتلا کر گیا تھا۔

ماورا نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر تیمور کا نمبر ملایا تھا اور چند لمحوں کے توقف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

"السلام علیکم۔۔۔!" تیمور نے بڑے تحمل سے کال ریسیو کی تھی۔

"تیمور! آپ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ ٹھیک تو ہیں نا؟" وہ کافی گھبرائی اور بوکھلائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

"فی الحال تو ٹھیک ہی ہوں، کیوں خیریت؟ کیا ہوا؟" وہ بڑے سکون سے پوچھ رہا تھا۔

"کہاں ہیں؟" ماورا کا دل بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔
"اسی دنیا میں ہوں ابھی تک تو۔" وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔
"تیمور پلیز۔ مجھے یہ رسم نہیں کرنی، پلیز کینسل کردیں سب کچھ ایسے فنکشن بعد میں بھی ہوسکتے ہیں۔" ماورا نے دل کی گھبراہٹ کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے اسے اس تقریب سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔
"بعد کس نے دیکھا ہے؟ بس جو بھی ہے وہ آج ہے اور ابھی ہے۔ کل کو بھلا کون دیکھ پایا ہے؟ کسی کو کیا پتا؟ ہم آج ہیں کل نہیں ہوں گے، کل پہ بھروسا نہیں کرتے مسز تیمور حیدر! جو بھی کرنا ہے آج کرنا ہے۔" تیمور سارے انتظام کرنے کے بعد ملتوی کیسے کرسکتا تھا بھلا....؟"
"لیکن تیمور! میری طبیعت نہیں ٹھیک..." اس نے بہانہ کرنا چاہا۔
"ہوجائے گی ٹھیک... ابھی پورا دن پڑا ہے۔" وہ مطمئن تھا۔
"مگر میرا دل گھبرا رہا ہے۔" وہ رہ نہ سکی اور بالآخر کہہ ہی گئی۔
"کیوں؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس کی عجلت، گھبراہٹ اور گریز پہ اب تیمور کو بھی تشویش سی ہوئی تھی۔
"ہاں، سب خیریت ہے۔ سب ٹھیک ہے... لیکن..." وہ کہتے کہتے اٹک گئی تھی۔
"کیا لیکن؟ جو بھی کہنا ہے۔ صاف صاف کہو کہ یہ مسئلہ ہے۔" تیمور نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا اور وہ تھی کہ کھل کے بول ہی نہیں پا رہی تھی۔
"بتاؤ کیا بات ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔
"وہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بہت برا خواب دیکھا ہے۔ آپ کو چوٹ لگ گئی اور..." ماورا اپنی گھبراہٹ اور گریز کی وجہ بتا رہی تھی اور تیمور یک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
"ہاہاہا... !عورت بھی کیا چیز ہے یار! کبھی کبھی مرد اس کی آنکھوں کے سامنے گھائل ہو رہا ہو، تب بھی اسے ذرا تکلیف اور پروا نہیں ہوتی اور کبھی کبھی خواب میں اس کی ذرا سی چوٹ دیکھ کر ہی تڑپ جاتی ہے، گھائل ہوجاتی ہے، واہ کیا مخلوق ہے یہ عورت بھی!" تیمور اس کی بات سے بہت محظوظ ہوا تھا۔
"تیمور! میں مذاق نہیں کررہی، میرا رات سے دل گھبرا رہا ہے۔ عجیب بے چینی اور بے کلی سی ہے، میرا دم گھٹ رہا ہے۔" ماورا کافی خفگی سے بولی تھی۔
"تم ٹینشن لے رہی ہو، اس لیے ایسا محسوس ہورہا ہے۔ ٹینشن مت لو، ان شاء اللہ سب بہتر ہوگا۔ کچھ اچھا سوچو، ذہن فریش رہے گا۔" تیمور نے اسے نارمل انداز میں مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔
اور ماورا اس کی لاپروائی پہ چپ سی ہوگئی تھی۔
"چار بجے پک کرنے آؤں گا۔ تیار رہنا۔ تمہارے لیے پالر سے ٹائم لے چکا ہوں۔ ابھی بزی ہوں، فون بند کرتا ہوں، اللہ حافظ۔" تیمور نے کہہ کر فون بند کردیا تھا اور ماورا بند موبائل کو دیکھتی رہ گئی۔
وہ ہر کام خود ہی کیے جا رہا تھا؟ ہر طرف دھیان تھا اس کا؟

✲ ✲ ✲

"امی! آپ جانے کے لیے تیار ہیں؟" ماورا، عافیہ بیگم کے موڈ سے ہی جان چکی تھی کہ وہ بھی فنکشن میں جانے کے لیے رضامند ہیں۔
"کیوں؟ کیا مجھے نہیں جانا چاہیے؟" انہوں نے الٹا سوال داغ دیا۔

"نہیں! میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" ماورا نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تو پھر پوچھا کیوں؟ جب ہم سب انوائیٹ ہیں تو پھر سب ہی جائیں گے نا؟" عافیہ بیگم کافی مطمئن نظر آرہی تھیں۔

"وہاں رضا حیدر بھی ہوگا۔" ماورا بس کسی بھی طرح یہ پروگرام ملتوی کروا دینا چاہتی تھی۔ کیوں کہ اس کے سینے میں دھڑکتا دل خوش نہیں تھا' عجیب سے وہم اور وسوسوں میں گھرا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

"اب رضا حیدر کا کوئی ڈر نہیں۔ اس نے جو کرنا تھا کرلیا' اب وقت پلٹ چکا ہے۔" عافیہ بیگم پرسکون تھیں اور ماورا جھنجلا گئی تھی۔

"اب آپ کو کوئی ڈر نہیں لیکن مجھے تو ہے نا۔ سب مطمئن ہیں سوائے میرے' پتا نہیں کیوں' میں مطمئن نہیں ہو پارہی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔

"کیا بات ہے ہم کیوں پریشان ہو؟" لی گل بھی پاس چلی آئیں۔

"نہیں' کچھ نہیں۔" ماورا سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور وہ دونوں اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

ماورا پورا دن بے چین سی پھرتی رہی۔ کسی پل سکون نہیں تھا اور ٹھیک چار بجے تیمور اسے لینے کے لیے پہنچ گیا تھا۔

"بیگم صاحبہ! صاحب آپ کو لینے آئے ہیں۔" چوکیدار نے اطلاع دی۔

اور ماورا کا دل مٹھی میں آگیا۔ وہ جب سے اس گھر سے گیا تھا' دوبارہ لوٹ کے نہیں آیا تھا اور آج اسے لینے بھی آیا تو صرف باہر گیٹ تک اور ماورا تھی کہ اسے اندر بھی نہیں بلا سکتی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو؟ جاؤ نا وہ انتظار کررہا ہے باہر۔" عافیہ بیگم نے اسے متوجہ کیا تھا اور ماورا کو اپنی الجھی بکھری سی سوچوں کو سمیٹنا ہی پڑا تھا۔

✡ ✡ ✡

تیمور گاڑی چلا رہا تھا اور ماورا اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں تیمور کے چہرے سے لپٹی جارہی تھیں اور تیمور کی نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ تھیں۔

"کیا زیادہ اچھا لگ رہا ہوں یا پھر پیار آرہا ہے۔۔۔؟" تیمور اس کی محویت بھانپ چکا تھا۔

"محبت ہوگئی ہے۔ پیار آرہا ہے۔ بس دیکھتی رہوں' یہ دل چاہ رہا ہے۔"

ماورا کے منہ سے نکلنے والے اظہار کے الفاظ بہت بے ساختہ تھے اور اس کے ایسے بے اختیار اظہار پہ تیمور کی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اور ماورا نے گیئر پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تیمور نے یک دم جیسے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا تھا' ماورا کے چہرے کے ایک ایک نقش سے محبت چھلک رہی تھی۔

اتنی گہری محبت کہ تیمور آسانی سے نظریں نہیں ہٹا پایا تھا مگر "وقت" کم تھا' اس لیے اس نے نظریں بھی ہٹالی تھیں اور اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ بھی کھینچ لیا تھا اور گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

"نہیں یہ میری زندگی کا آخری دن تو نہیں کہ میں ماورا مرتضیٰ کے چہرے پہ تیمور حیدر کے لیے محبت کی شدت دیکھ رہا ہوں۔"

"پلیز تیمور!" ماورا بری طرح تڑپ گئی تھی۔

"آج تو تڑپ بھی عروج پہ ہے۔" وہ استہزائیہ سا ہنسا۔

"پلیز خاموش ہو جائیں۔" وہ غصے سے زچ ہو کر بولی۔
"ہو جاؤں گا خاموش مگر آج تو بولنے دو۔" وہ اسے بھرپور طریقے سے تنگ کر رہا تھا۔ ماورا نے سختی سے لب بھینچ لیے تھے اور تیمور اس کی چپ پہ مسکرا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ماورا بھابی!" عزت ماورا کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی تھی۔
"کیسی ہو؟" ماورا نے اس کے ماتھے پہ پیار کیا تھا۔
"ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟ بہت مبارک ہو آپ کو، میں بہت خوش ہوں، میں پھوپھی بننے والی ہوں۔" عزت بہت پرجوش ہو رہی تھی۔
"خیر مبارک، لیکن یہ کیا؟ یہ ڈریس؟" ماورا عزت کو عروسی لباس پہنے دیکھ کر ٹھٹکی۔
"آپ کی گود بھرائی اور میری رخصتی ارینج کی گئی ہے۔ آپ کو پتا نہیں شاید؟" عزت کے انکشاف پہ ماورا ہکا بکا سی رہ گئی۔
"تیمور نے مجھے بتایا ہی نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔
"شکر ہے کہ مجھے بتا دیا کہ تمہاری رخصتی ہے ورنہ اچانک رخصت کرنے کا پروگرام بھی بنا سکتے تھے وہ۔" عزت نے تیمور کی عجلت پہ چوٹ کی تھی لیکن نارمل انداز میں۔
"میم! ہمیں جو ٹائم دیا گیا ہے، وہ اب بہت کم رہ گیا ہے۔ پلیز، آپ اپنی سیٹ پر آجائیں۔" پارلر کی انچارج بیوٹیشن نے ان دونوں کو مزید گفتگو سے روکا۔
ماورا چپ چاپ کرسی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کے دل میں اٹھنے والے خدشات میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی پارلر میں ایک ہی جگہ پر تیار ہو رہی تھیں لیکن اندر سے دونوں ہی خوش نہیں تھیں۔ خدشات ان کا خون چوس رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

دو گھنٹے بعد تیمور اسے لینے کے لیے پارلر پہنچا تو سامنے کھڑی سجی سنوری ماورا کو دیکھ کر قدم ٹھٹک گئے۔ وہ اس کا لایا گیا لباس پہنے تیار کھڑی تھی۔ ہر رنگ اس پہ بہت کھل رہا تھا، سارا سنگھار تھا صرف اس کی کلائیوں میں چوڑیاں نہیں تھیں اور اس کی سونی کلائیاں دیکھ کر تیمور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ چوڑیاں لانا بھول گیا تھا۔
"چلیں!" ماورا نے اس کی محویت کا سلسلہ توڑا۔
"ہوں! ہاں۔" وہ چونکا پھر اثبات میں سر ہلایا تھا اور جیسے ہی واپسی کے لیے پلٹا اس کی عزت پہ نظر پڑی۔ وہ بھی تیار تھی۔
"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔" تیمور نے آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے ماتھے پہ پیار کیا۔
"بھائی! ایک وعدہ کریں کہ آپ مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے نا؟" عزت نے یک دم تیمور کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔
"ارے پاگل، جس کے ہاتھ میں میں تمہارا ہاتھ دے رہا ہوں نا اس کے ہوتے ہوئے تمہیں کبھی میری ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بہت خوش رکھے گا تمہیں۔" تیمور نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔
"نہیں بھائی! جو آپ ہو وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ آپ کی جگہ کوئی کیسے لے سکتا ہے۔" اس نے بچوں کی طرح نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"بے شک کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ لیکن انسان کی زندگی میں کوئی ایک ایسا بھی ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔" تیمور اسے پرسکون اور مطمئن کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"جو بھی ہو' آپ نے مجھے اکیلا چھوڑا تو دیکھنا اچھا نہیں ہوگا۔ بہت روؤں گی اور سب کو بتاؤں گی بھابھی سے شکایت کروں گی' ناراض ہو جاؤں گی۔"

عزت بالکل بچوں کی طرح منہ پھلائے دھمکی دے رہی تھی اور تیمور اس کی بات پہ ہنس پڑا تھا اور کن اکھیوں سے ماورا کو دیکھا۔

"نہیں' اپنی بھابھی سے شکایت مت کرنا' وہ سزا دینے کے معاملے میں بہت سخت ہے۔ ہو سکتا ہے میری ذرا سی غلطی پہ وہ مجھے قبر تک معاف نہ کرے۔" تیمور نے جیسے التجا کی تھی اور ماورا روح تک کانپ گئی تھی۔

"میں تھک گئی ہوں' چلیں۔" اس نے تیمور کو خفگی سے دیکھا۔

"ابھی سے تھک گئیں۔ ابھی تو بہت وقت پڑا ہے تھکنے کے لیے۔" وہ بڑے خوش گوار موڈ سے کہتا ان دونوں کو ساتھ لیے باہر نکل آیا تھا۔

اور ان دونوں کو ہوٹل کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ کسی کام کا کہہ کر دوبارہ چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سبز رنگ کی چوڑیاں تھیں اور ان چوڑیوں کو دیکھ کر ماورا کے ذہن میں ایک سایہ سا لہرا گیا تھا۔

"لاؤ' چوڑیاں پہنا دوں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں۔" وہ یک دم بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"کیوں؟" تیمور اس کے ایسے انکار پہ چونک گیا تھا کہ اچانک اسے کیا ہوا ہے؟

"بس' میں نہیں پہن سکتی۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"لیکن کیوں؟ میں صرف ان چوڑیوں کے لیے دوبارہ مارکیٹ گیا ہوں اور تم کہہ رہی ہو کہ نہیں پہن سکتیں؟" تیمور کو جیسے دکھ ہوا تھا۔ کیوں کہ وہ اتنے چاؤ سے لے کر آیا تھا۔

"آج نہیں تیمور! کل پہن لوں گی۔" اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"اگر کل میں ہی نہ رہا تو؟" اس نے سلگ کر کہا۔

"اللہ نہ کرے' میں نے ایک برا خواب دیکھا تھا۔ بالکل ایسا ہی' سیم سچویشن' تب سے دل پریشان ہے ورنہ انکار کی کوئی اور وجہ نہیں ہے اور چوڑیاں بھی بہت پیاری ہیں۔ میں ضرور پہنوں گی۔" ماورا نے کوشش کی کہ تیمور کا دل نہ ٹوٹے' وہ ہرٹ نہ ہو۔

"چوڑیاں پہننی ہیں تو ابھی پہنو۔ ایک برے خواب کی وجہ سے حقیقت کو خراب مت کرو۔ تمہارے سنگھار میں ایک بھی کمی رہ گئی تو سمجھو میری تمام تیاری اور تمام خوشی میں کمی رہ جائے گی۔ ادھورا پن آجائے گا۔" تیمور کی خواہش اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

اور ماورا مزید انکار نہ کر سکی اس لیے خاموشی سے ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور تیمور اسے چوڑیاں پہنانے لگا۔

لیکن دس چوڑیاں پہنانے کے بعد تین چوڑیاں ایک ساتھ ہی ٹوٹ گئیں اور تیمور کا ہاتھ زخمی کر گئیں۔

"تیمور!" ماورا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ ایسے زخم ایسی چوٹ ہی سے تو ڈر رہی تھی' اس نے فوراً" تیمور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دوپٹے سے پونچھنا چاہا۔

"نہیں.... اپنے دوپٹے کو خون سے داغ دار نہ کرو۔ ابھی تو رسم بھی نہیں ہوئی۔" تیمور نے جھک کے میز پر سے ٹشو اٹھالیا تھا۔

"لیکن تیمور! خون زیادہ بہہ رہا ہے۔" وہ گھبرا چکی تھی۔

"ماورا! کیا ہوگیا ہے تم کو' کیوں ذرا ذرا سی بات پہ اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟ معمولی سا کانچ چبھا ہے.... ٹھیک ہوجائے گا۔" وہ پرسکون تھا' نارمل تھا۔ مگر ماورا عافیہ بیگم کی طرح عجیب عجیب وسوسوں میں پڑچکی تھی۔

"دیکھو ماورا! تم میری محبت ہو اور ہمیشہ میری محبت ہی رہوگی۔ میں تم سے دور چلا جاؤں یا تم مجھ سے دور چلی جاؤ لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے کے ہی رہیں گے۔ ہمارے بیچ جو بھی ہوا' مجھے پتا ہے اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔ تم نے ہمیشہ مجھے اپنی ذات سے' اپنے آپ سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ بس میں ہی محبت کی دُھن میں سمجھ نہیں سکا لیکن میری محبت سچی تھی' اسی لیے تمہاری نفرت ہار گئی اور میں اس ہاری ہوئی نفرت کو دوبارہ سے جگانا نہیں چاہتا۔ میں محبت سے محبتیں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے اپنی سوچ' اپنے عزم کے مطابق اپنا حق لے لیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم میری ذمہ داری ہو۔ میرا یہ بچہ میری ذمہ داری ہے۔ تم دونوں کے لیے محنت کروں گا' مقام بناؤں گا اور آج سب کے سامنے نام دوں گا۔ عزت دوں گا۔ اپنی پہچان دوں گا اور اس وقت ان کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتا۔ جمع پونجی سب لگا چکا ہوں' بالکل مفلس ہوں۔ لیکن محبت کا خزانہ بہت ہے میرے پاس' ابھی سے لٹانا شروع کردوں تو قیامت تک ختم نہیں ہوگا۔"

تیمور نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ماورا کی پلکیں لرز کر جھک گئی تھیں۔

تیمور نے دل میں لگی تمام گرہیں کھولتے ہوئے اس کے ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور ماورا کی روح شانت ہونے کے بجائے اور بے قرار ہوگئی تھی۔

"آئی لو یو ماورا... آئی رئیلی لو یو' آئی لو یو سو مچ۔" وہ بڑی شدت سے اظہار کررہا تھا۔

"میں اپنے بابا کے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ انہیں معاف کردو.... پلیز! محبت کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے.... بڑے سے بڑا گناہ بھی معاف کردیتی ہے۔" تیمور نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور ماورا نے یک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"پلیز تیمور! ایسا تو مت کہیں۔ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔ معاف کرچکی ہوں' جب امی نے سب کچھ بھلا دیا ہے تو میں کیا چیز ہوں؟ زندگی کا یہ باب شاید اسی طرح لکھا تھا لیکن اب اور نہیں' میرا دل بالکل صاف ہے' کورے کاغذ کی طرح۔" ماورا نے اسے یقین دلایا تھا اور تیمور مزید پرسکون ہوگیا۔

"تھینک یو' تھینک یو سو مچ۔" اس نے ماورا کو دوبارہ سے اپنے حصار میں لے لیا اور وہ اس کی حرکت پہ مسکرا اٹھی تھی۔

اچانک کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی اور وہ دونوں چونک گئے تھے۔

عافیہ بیگم اور بی گل آئی تھیں اور ان کے ساتھ رابعہ بیگم بھی۔

"یہاں کیا کررہے تم ہو؟ باہر آؤ دونوں' مہمان آچکے ہیں اور بارات بھی پہنچنے والی ہے بس۔"

تیمور اور ماورا مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کمرے سے نکل کر ہال کی طرف آگئے تھے۔ جہاں کافی تعداد میں مہمان آچکے تھے۔ وہ ماورا کو ساتھ لیے اسٹیج پہ آگیا تھا اور ہال کے دوسرے راستے سے ولید اور عزت بھی ایک ساتھ چلتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھے تھے جب کہ وہاں موجود مونس مرزا' قیام مرزا' رضا حیدر اور آنے والے تمام مہمان ہکا بکا سے رہ گئے تھے۔ پورے ہال میں ایک شور سا مچ گیا تھا...!!

(آخری قسط آئندہ ماہ)

عفت سحر طاہر

اس کی دھیمی مگر بے یقین سی پکار پر بے ساختہ مڑ کر دیکھتے ہوئے مہرماہ کے وجود سے جیسے جان نکل گئی۔ وہ طلال نوید تھا' بے ساختگی کی کیفیت میں اس کا نام ہونٹوں پر آ کر رہ گیا' وہ بے یقینی سے دیکھتا ہوا۔

''ایکسکیوز می! یہیں ٹھہرنا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔'' وہ کچھ خیال آنے پر عجلت سے کہتا پلٹ گیا۔

مہرماہ نے بے جان نظروں سے طلال کو اپنے ساتھیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ یقیناً ''ان سے کچھ دیر کی مہلت لینے گیا ہوگا۔ مہرماہ کی نظر دھندلانے لگی۔ تب ہی اس کا سیل فون تھرتھرانے لگا۔ اس نے چونک کر موبائل اٹھایا۔ اوپر نمیر آفندی کا وہی نمبر جگمگا رہا تھا جو شاید ابھی آن کیا گیا ہوگا۔ مہرماہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال اٹینڈ کی اور ساتھ ہی دھیمی آواز میں پھٹ پڑی۔

''کہاں ہو تم؟ اتنی دیر سے میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔ نوکر ہوں کیا تمہاری؟''

''مسز... مسز نمیر آفندی ہیں آپ۔'' دوسری طرف سے بہت رسان سے اسے یاد دلایا گیا۔ مہرماہ کا دماغ گھوما۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

تیرہویں قسط

"شٹ اپ۔ سامنے آؤ اور اس ڈرامے کو ختم کرو۔ کیوں بزدلوں کی طرح چھپ کروار کر رہے ہو۔"

"ایک بار پہلے سامنے آیا تھا تو نکاح ہو گیا تھا تمہارا میرا۔۔۔ اب حکم کرو' دوبارہ آجاتا ہوں۔" وہی مسکراتا لہجہ۔۔۔ مہرماہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کی ذومعنی بات سن کر بہ مشکل تحمل سے بولی۔

"دیکھو۔۔۔ میں یہاں تمہاری بتائی جگہ پر موجود ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ دیکھ لیا ہے میں نے۔ اپنے سابقہ منگیتر کے ساتھ ہو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں بولا تو مہرماہ نے بے اختیار ہال میں نظر گھمائی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں تھا تب ہی تو طلال کو اس کے پاس کھڑا دیکھ چکا تھا۔

"وہ میرے ساتھ نہیں ہے نمیر اور میرا دماغ خراب تھا کہ ساتھ اسے لے کر آتی جس سے تم نے مجھے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ یہ ڈراما چھوڑو' سامنے آؤ۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔" وہ تیزی سے بولی مبادا وہ فون کاٹ دے۔

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے دھوکا دینے والی عورتیں پسند نہیں ہیں۔" وہ سرد مہری سے جتا کر بولا تو مہرماہ کو دھیما ہونا پڑا۔

"وہ میرے ساتھ نہیں ہے نمیر اور میں روز روز اس طرح بہانے سے تمہارے بلانے پر نہیں آسکتی۔ جو طے ہونا ہے وہ آج ہی کرلو آکر۔" وہ طلال کو یکسر بھولی ہوئی تھی۔ اس وقت تو اہم ترین مسئلہ نمیر کے ساتھ معاملہ نبٹانے کا تھا۔

"ہاہ۔۔۔ بھول ہے تمہاری مسز نمیر آفندی!" وہ جیسے محظوظ ہو کر بولا۔

"اب تو ایسے بندھن میں باندھ لیا ہے کہ جب بھی بلاؤں گا' کچے دھاگے سے بندھے سرکار چلے آئیں گے۔" وہ جیسے اپنے اس کارنامے سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ مسکراتے لہجے میں بولا تو اس کی کمینگی سمجھ کر مہرماہ کی کنپٹیاں تپ اٹھیں۔ رگوں میں شرارے دوڑ گئے۔ وہ سامنے ہوتا تو گولیوں سے اڑا دیتی اسے۔

"تمہارا مسئلہ جائیداد ہے نمیر!"

"میرا مسئلہ اب مہرماہ آفندی بھی ہے ڈیئر۔" وہ برجستہ بول کر اسے گم صم کر گیا۔ (کمینہ نہ ہو تو)

"اس بندے کو دفع کرو یہاں سے۔ مجھے یہ تم سے دس فٹ کے فاصلے پر بھی نظر نہیں آنا چاہیے ورنہ ساری عمر نمیر آفندی کو ڈھونڈتی ہی رہو گی' اسی پنجرے میں قید۔ مگر تمہیں آزادی کا پروانہ دینے والا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ لہجہ بدل کر سفاکی سے بولا اور لائن بے جان ہو گئی۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔" وہ بے چینی سے بولے گئی۔

"مہرو۔۔۔" طلال کی آواز پر اس نے چونک کر موبائل کان سے ہٹایا۔ وہ اس کے بالمقابل کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہا تھا۔ مہرماہ نے لب بھینچتے ہوئے اپنا موبائل بیگ میں ڈالا اور اٹھ گئی۔

"مہرو۔۔۔ کیا ہوا؟ بیٹھو تو۔" طلال نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔ مہرماہ کا گلا رندھنے لگا مگر اس وقت کمزوری دکھانے کا مطلب تھا' طلال کو خوش فہمی میں مبتلا کر کے تزئین اور طلال کا رشتہ خراب کرنا۔ اس نے سرد نظروں سے طلال کی طرف دیکھا۔

"میں یہاں تم سے ملنے یا تمہارے بلاوے پر نہیں آئی تھی۔ ایکسکیوز می! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے بیگ شانے پر ڈالا۔ ہال میں ادھر ادھر دیکھا۔ یہیں کہیں نمیر آفندی بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

مہرماہ نے ٹھہر کر طلال کی طرف دیکھا تو اسے اپنے دل کو ٹٹول کر ذرا سی حیرت بھی ہوئی۔ اسے اب طلال کو سامنے

دیکھ کر دکھ تو بہت تھا مگر زیاں اور کچھ کھو دینے کا "وہ" احساس نہیں ہو رہا تھا جو کچھ روز پہلے تھا۔ یقیناً "طلال کے تزئین سے شادی کے فیصلے نے اس کے دل میں بھی طلال کی پہلے والی جگہ نہیں رہنے دی تھی۔ وہ آہستہ سے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں نے اگر غلط فیصلہ کیا تھا تو اللہ گواہ ہے کہ اس کا ایک مضبوط جواز تھا میرے پاس۔ اب تم بتاؤ، تم نے تزئین سے شادی کر کے کون سا محبت کا ثبوت دیا؟" اس نے تلخ لہجے میں پوچھا تو آنکھوں میں مرچیں سی اپنے آپ گھل گئیں۔

"انکار تمہاری طرف سے ہوا تھا مہو۔۔۔ شادی سے محض تین روز پہلے تمہارے انکار نے کیا میری ذہنی حالت تباہ نہیں کی ہو گی؟" وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولا تو مہماہ کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔

"چہ۔۔۔ خوب۔۔۔ تو یہ شادی میرے اس انکار کی خوشی میں کی ہے تم نے؟"

"میری فیملی کی عزت کا سوال تھا مہو!" وہ تڑپ ہی تو اٹھا اس طعنے پر۔

"اور میری عزت؟ تم نے یہ نہیں سوچا طلال۔۔۔ ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میری ذہنی کیفیت کیا ہو گی تمہیں تزئین کے ساتھ اس رشتے میں منسلک دیکھ کر۔" مہماہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ (اس شخص کو چاہتی رہی میں)۔

"اتنا ہی دکھ ہے تمہیں میری شادی کا اور تم مجھے کسی اور کے ساتھ دیکھنا پسند نہیں کرتیں تو کیوں انکار کیا تھا شادی سے مہو۔ بولو۔۔۔ بتاؤ مجھے؟" وہ لہجے میں تلخی سمو کر بولا۔ اس دشمن جان کو سامنے پاتے ہی زندگی کا سب سے بڑا نقصان یاد آ کر جان کا عذاب بن گیا تھا۔

"تم اپنے لیے، میرے اس انکار کا مداوا بہت اچھے سے کر چکے ہو مسٹر طلال نوید۔ میرا نہیں خیال کہ اب میں تمہیں کسی بھی قسم کی صفائیاں پیش کرنے کی پابند ہوں۔" مہماہ نے طنزیہ کہا تو وہ لب کچلتا اضطرابی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر ضبط سے لال ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب سب لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ تم اغوا ہو چکی ہو تب میرے گھر والوں کی بھی سوچ تمہارے بارے میں بدل چکی تھی مہو۔ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں اغوا شدہ لڑکی سے شادی کروں لیکن صرف ایک میں ہی تھا جس کی محبت تمہارے اغوا ہونے کے باوجود بھی کم نہیں ہوئی تھی۔"

وہ بے بسی سے پُر لہجے میں بولتا مہماہ کے دل میں دراڑیں ڈالنے لگا مگر آج طلال نوید کو یہاں سے نامراد بھیجنے کا مطلب تھا' طلال اور تزئین کے بہتر مستقبل کی بنیاد رکھنا۔

"مان لیا طلال کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔۔۔ مگر میں صرف یہ پوچھتی ہوں کہ تزئین آفندی ہی کیوں؟" اس نے سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے سرد نظروں سے طلال کو دیکھا تو چند لمحے مہماہ کی آنکھوں میں براہ راست دیکھنے کے بعد وہ ہارے ہوئے انداز میں بولا۔

"تمہارے پاس رہنے کے لیے مہو۔۔۔ فقط تمہیں دیکھتے رہنے کی چاہ میں یہ غلط فیصلہ کیا ہے میں نے۔"

مہماہ کا وجود سنسنا اٹھا۔ وہ بہ مشکل بول پائی تھی۔ "دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟"

"وہی تو ٹھیک نہیں رہنے دیا تم نے مہو۔" وہ استہزاء سے ہنسا۔ جانے مہماہ پر یا خود پر۔

"انسان کی اصل شخصیت ناموافق حالت میں ہی سامنے آتی ہے طلال۔ اور مجھے افسوس ہے تمہارے اس عمل پر تمہارے لیے کوئی اچھی سوچ میرے سامنے نہیں آئی۔"

"یعنی تم شادی سے محض چند روز پہلے انکار کر دو تو وہ حق ہے اور میں تمہارے اس انکار کی سزا بھگتنے اور اپنی

فیملی کی عزت بچانے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاؤں تو وہ غلط ہے۔" اس نے میز کی سطح پر ہاتھ مارا۔
"تم دس شادیاں کرتے طلال۔۔۔ مگر تزئین ان میں سے ایک بھی نہ ہوتی۔ تم مجھے کبھی دکھائی نہ دیتے۔" وہ لہجے کو بھیگنے سے بہ مشکل بچا پائی۔ طلال دم بخود تھا۔
"اتنی نفرت؟" اس نے مدھم سا بڑبڑا کر جیسے خود کلامی کی تھی۔ پھر اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "تم نفرت کرتی تھیں مجھ سے۔ تم چاہتی تھیں کہ میں تمہیں دکھائی نہ دوں اور تم۔۔۔ تم اس موحد آفندی کے ساتھ عیاشی کرتی پھرو؟" بات کرتے کرتے اس کا گویا دماغ الٹ گیا تھا۔ اور اس کا یہ آخری اہانت بھرا جملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ مہراہ کے اعصاب ٹھٹھر گئے۔
"بالکل صحیح کہا تھا تزئین نے تمہارے بارے میں کہ تم مجھ سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ تمہاری زندگی میں موحد آفندی آچکا تھا۔" وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "میں ہی بے وقوف تھا جو سمجھ نہیں پایا تمہارے اس ذہنی خرابی والے ڈرامے کو۔۔۔ وہ خرابی جو میرے شادی کرتے ہی ٹھیک ہو گئی۔"
"یہ سب تم سے تزئین نے کہا؟" مہراہ کو اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔
"تو کیا غلط ہے اس میں؟" وہ نتھنے پھلائے تنفر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی کے بل گنے نہ جاتے تھے۔
مہراہ ایک دم سے اپنا بیگ اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا موبائل بج رہا تھا۔ یقیناً کبیر اسے لینے آپہنچا تھا۔ طلال نے اب کی بار اسے جانے سے نہیں روکا۔ مگر اس سے دو قدم دور جا کر کچھ خیال آنے پر وہ ہمت مجتمع کر کے پلٹی۔ اور اسے دیکھ کر مضبوطی سے بولی۔
"تزئین نے بالکل سچ کہا تھا تم سے۔" اور پھر تیز قدموں سے چلتی اس سے دور ہوتی ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔
طلال نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی سے نکلتے دیکھا۔ مگر بے جان بیٹھا رہا۔ مہراہ کے اعتراف نے اس کے وجود سے جیسے آدھی جان نکال لی تھی۔ کبیر کو اس نے اسی ریسٹورنٹ کے باہر بلا لیا۔ اب جبکہ وہ اسے لینے آہی چکا تھا تو رکشہ کر کے لائبریری جانے کا کیا فائدہ تھا۔ وہ چند منٹوں میں وہاں موجود تھا۔
مہراہ تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔
"آپ تو لائبریری میں تھیں مہرو بی بی؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا آپ کی کال سن کر کہ آپ یہاں کیسے پہنچ گئیں۔" کبیر خان واقعی پریشان تھا۔
"ایسے ہی۔۔۔ کسی سے ملنا تھا تو یہاں چلی آئی خان!" وہ سر سیٹ پر ٹکائے تکان زدہ لہجے میں بولی تھی۔ کبیر چپ چاپ گاڑی چلانے لگا۔
"کبیر۔۔۔ اس روز تم مجھے ٹائم پر پک کرنے کیوں نہیں آئے تھے؟" وہ یوں ہی آنکھیں موندے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ کبیر نے بے ساختہ لب بھینچے۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ یہ وہ موضوع تھا جس پر وہ کبھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بالخصوص مہراہ سے تو کبھی بھی نہیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ وقت کا رخ واپس موڑ دیتا۔ اسی شام کی طرف۔ جب وہ مہراہ کو پارلر چھوڑ کر گیا تھا اور وہ موحد کی نافرمانی کی پرواہ کیے بنا کبھی بھی فیکٹری نہ جاتا اور وہیں پارلر کے باہر کھڑا رہتا۔ جب تک کہ مہراہ نہ واپس آجاتی۔ کاش!!
"میں معذرت چاہتا ہوں مہرو بی بی! آپ دیے ہوئے وقت سے دس منٹ پہلے پارلر سے باہر آگئی تھیں۔ اگر میں سارا وقت باہر کھڑا انتظار کرتا رہتا تو شاید کچھ بھی غلط نہ ہوتا۔" اس کا لہجہ دکھ سے بوجھل تھا۔
مہراہ کی بند آنکھوں کے کونے نم ہونے لگے۔ اس کی زندگی میں آنے والے وہ دس منٹ اس کی پوری زندگی کا

رخ بدل گئے تھے۔ ان دس منٹوں نے اس کی زندگی سے طلال نوید کو باہر پھینک دیا تھا۔ نمیر آفندی کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے اس کا سب کچھ بن کر ناگہانی آفت کی طرح اس کی زندگی میں نازل ہوگیا تھا۔ اور وہ طلال نوید سے چند روز کے فاصلے پر کھڑی اسے کسی اور کا ہوتا دیکھنے پر مجبور ہوگئی۔ کبیر کی بات کا کوئی جواب دیے بنا وہ یوں ہی خاموشی سے آنکھیں بند کیے سیٹ سے سر ٹکائے بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ وہ آفندی ہاؤس پہنچ گئے۔ مہ ماہ گاڑی سے اتر کر اندر چلی گئی۔

کبیر اسٹیئرنگ تھامے کسی نقصان کے حصار میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

طلال کے انتظار میں وہ جلے پاؤں کی بلی بنی گھوم رہی تھی۔ سب کھانا کھانے بیٹھے تو تزئین نے پہلے تو اس کا انتظار کرنا چاہا، بار بار کال کرنے پر جب طلال نے اس کی کال منقطع کر کے موبائل ہی بند کر دیا تو اس نے تلملاتے ہوئے مجبوراً گھر والوں کے ساتھ ہی کھانا کھالیا۔ مگر اندر ہی اندر ایک آگ اسے سلگا رہی تھی۔ طلال کا رویہ بہت تذلیل آمیز تھا۔ اپنی نفی کون برداشت کرپاتا ہے بھلا۔ تزئین بھی اب پھٹ پڑنے کے مقام پر تھی۔

"دیکھ رہی ہیں آنٹی آپ طلال کا رویہ۔۔۔ اب تو آدھی رات کو گھر آنے لگا ہے۔" تزئین نے ماما سے شکایت کی تھی۔ رمشہ بھابھی اپنا چائے کا مگ سنبھالتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھیں تو ان کے چہرے پر بہت محظوظ ہوتی مسکراہٹ تھی مگر بظاہر بڑی ہمدردی سے بولیں۔

"میں نے بھی نوٹس کیا ہے طلال حد سے گزر رہا ہے۔ اگر اسے مہ ماہ کی یاد میں ہی زندگی گزارنی تھی تو تمہاری زندگی کیوں کانٹوں پر گھسیٹی بلکہ اسے تو قدر کرنی چاہیے جس نے اتنے مشکل وقت میں ہمارا اتنا ساتھ دیا ہے۔"

"جن حالات میں یہ شادی ہوئی ہے تزئین، وہ تم بھی جانتی ہو۔" ماما نے رمشہ بھابھی کے مزہ لیتے انداز کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ اس لیے قدرے تحمل سے بولیں۔ "طلال نے مہ ماہ کے علاوہ کسی کو نہیں سوچا تھا۔ اب اسے اپنا دل بدلنے اور موڑنے کے لیے وقت تو دو۔"

"تو یہ وقت۔ آپ لوگ دیتے نا اسے آنٹی۔ شادی ملتوی کر کے۔۔۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا تو یہی نتیجہ نکلنا تھا۔" وہ بدلحاظی سے بولی تو اب کی بار انہیں بھی غصہ آیا۔

"تو بیٹا! تم ہی سوچ کر فیصلہ کر لیتیں۔ تمہارے سامنے ہی تھے سارے حالات، پھر بھی تم نے اسے گرین سگنل دیا۔ حالانکہ تم جانتی تھیں کہ طلال کے لیے فی الوقت مہ ماہ کو بھلانا بہت مشکل ہے۔" ان کا لب و لہجہ خشک تھا۔ تزئین پہلو بدل کر رہ گئی پھر وہاں سے اٹھ کر ہی چلی گئی۔ رمشہ بھابھی کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت لمبی زبان ہے دیورانی جی کی، ماما! ذرا دھیان سے بات کیجئے گا۔"

"اچھی بہوویں قسمت والوں کو ہی ملا کرتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ منہ بنا کر چائے پینے لگیں۔

طلال گھر آیا تو ماما اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ انہیں ۔۔۔۔ جاگتا دیکھ کر حیران ہوا۔ گیارہ بجنے والے تھے۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟"

"جن ماں باپ کی اولاد آدھی رات کو گھر آئے، وہ جاگا ہی کرتے ہیں بیٹا۔" وہ رسان بھرے طنز سے بولیں۔

"تو چلیں اب جا کر سو جائیں۔ اب تو آگئی ہے آپ کی اولاد۔" وہ انہیں قدرے مضطرب سا نظر آیا۔

"خیریت تھی طلال۔۔۔ تمہارا موبائل کیوں آف آرہا تھا؟ اور کہاں تھے تم اب تک۔" انہوں نے یکے بعد دیگرے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"موبائل کی چارجنگ ختم ہوگئی تھی ماما اور آج ایک میٹنگ تھی۔" وہ جان چھڑانے کو تھا۔

"پتا ہے مجھے' تمہارے پاپا نے بتایا ہے جیسی میٹنگ تم نے اٹینڈ کی ہے آج۔ ڈیلی گیشن کے لوگوں سے بات ہوئی تھی ان کی۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ تم وہاں میٹنگ میں بھی غیر حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے رہے ہو۔" انہوں نے تفکر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھ کر بے اختیار ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"وہاں ریسٹورنٹ میں مجھے مہرماہ مل گئی تھی' ماما۔"

اس نے گویا دھماکا کیا تھا۔ تزئین کے قدم لاؤنج کے باہر ہی ٹھٹکے۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے آج صحیح معنوں میں احساس ہوا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کھو دی ہے۔" (وہ مجھ سے محبت ہی نہیں کرتی ماما) وہ اندر ہی اندر کرلایا۔

ماما کا دل کسی نے مٹھی میں کرلیا۔ انہوں نے کب سوچا تھا کہ ان کا اتنا لاڈلا بیٹا زندگی کے اس مقام پر نامراد رہے گا۔ مگر جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ اب لکیر پیٹنا دانش مندی نہیں تھی سو انہوں نے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا۔

"تم بھول رہے ہو کہ مہرماہ بھی اسی دنیا میں رہتی ہے۔ اب کہیں نہ کہیں اس سے سامنا ہونا ایک معمولی سی بات ہے۔ تم اپنی زندگی کی طرف دھیان کرو' تمہاری بیوی ہے گھر بار ہے۔ ان کو تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔"

وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھا رہا تو ان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"بھول جاؤ طلال! جو ہوا اللہ کو ایسے ہی ہونا منظور تھا۔ میں نے شادی کے فنکشن میں اسے دیکھا تھا۔ وہ واقعی بیمار لگی مجھے' ہوسکتا ہے کل کو دماغی بیماری بڑھ جاتی اس کی۔ کوما پیشنٹ کے ساتھ کبھی بھی دوبارہ ایسا ہوسکتا ہے۔"

وہ گہری سانس بھرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ماما نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تزئین اس گھر میں تمہاری مرضی سے آئی ہے طلال۔ اور تم پر اس کی ذمہ داری ہے بیٹا! یہ مت بھولو کہ مشکل وقت میں اس نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔"

تزئین کو اپنے لیے ماما کا بھیک مانگنے والا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ وہ فوں فاں کرتی' وہیں سے واپس اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔

"چلیں' اب آپ بھی جاکر سوجائیں۔ کافی ٹائم ہوگیا ہے۔" وہ ان کی التجا نظر انداز کرتے ہوئے لاؤنج سے نکل گیا۔

کمرے میں داخل ہوا تو بتی جل رہی تھی اور تزئین سامنے ہی شب خوابی کے لباس میں ملبوس مسہری پر۔ نیم دراز اپنے موبائل پر مصروف دکھائی دی۔ سلام کرتے ہوئے وہ اپنا موبائل اور کی چین مسہری کے ایک طرف ڈال کر بستر کے کنارے بیٹھ کر جوتے اور جرابیں اتارنے لگا۔

"بالآخر تمہیں یاد آہی گیا کہ تمہارا ایک گھر بھی ہے۔" تزئین کے طنز نے لمحے بھر کو اس کے ہاتھ روکے پھر وہ اسے قطعاً نظر انداز کرتا ہوا سلیپر پہن کر اٹھ کر الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ اتنی سی دیر میں تزئین کا دماغ ابلنے لگا۔

وہ جان بوجھ کر واش روم سے دیر سے نکلا تو تزئین کا بس نہ چلا کہ بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ ہی پڑتی۔

"تو مل آئے آج اپنی پرانی محبوبہ سے؟" اس کا جملہ بہت اچانک تھا طلال کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔

"واٹ ڈا ہیل... کیا مطلب ہے تمہارا؟" شرٹ کے بٹن بند کرتا وہ اسے گھورنے لگا۔

"ہوش کے ناخن لو طلال... اگر تم مہرماہ کے دوست تھے تو میرے بھی تھے۔ اس نے کس طرح تمہیں اپنی زندگی سے نکال کر باہر پھینکا ہے' وہ تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ میرا نہیں تو اپنی سیلف ریسپیکٹ (عزت نفس) کا

ہی خیال کرلو۔" وہ تلخ و ترش لہجے میں بولتی طلال کی کنپٹیاں سلگا گئی۔

"شٹ اپ۔" وہ غرایا۔

مگر تزئین ڈرنے کے بجائے اس کے پاس چلی آئی۔ نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اور پرانی والی تزئین بن گئی جو یونیورسٹی میں اس کی دوست ہوا کرتی تھی۔

"اس نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے طلال! تم حق رکھتے ہو کہ اس سے بازپرس کرو مگر اپنی اور میری زندگی تو خراب مت کرو ایک کرپٹ انسان کے پیچھے۔"

طلال چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا پھر اسے احساس ہوا کہ تزئین کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ آج ریسٹورنٹ میں بھی مہ ماہ کا دل دکھانے والا ہی انداز تھا۔ اور موحد آفندی سے اپنے تعلق کو قبول کرنا..... ؟ یعنی بیماری کو بہانا بنا کر اس نے جان بوجھ کر طلال کو اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔ تزئین نے اس کے انداز سے حوصلہ پا کر اس کے شانے پر دوسرا ہاتھ رکھا اور اس کے سینے پر سر رکھتی تمام فاصلے سمیٹ گئی۔

"میں نے سچے دل سے تمہیں چاہا تھا طلال۔ تب ہی تو شادی کے لیے ہاں کرتے ہوئے ایک پل کو بھی نہیں سوچا کہ تمہارے دل میں کسی اور کا بسیرا ہے۔"

وہ بڑی ہوشیاری سے اس کے قریب آرہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ جائز رشتے میں بندھی ہوئی تھی۔ طلال کب تک اس حقیقت سے پہلو تہی کر سکتا تھا۔ اس نے جیسے ہار کر دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ لیے۔ تزئین کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ جو اس کا تھا..... وہ اسی کا رہنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک گہرے دکھ اور صدمے کی سی کیفیت میں تھی۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تزئین اسے طلال کی نظروں سے گرانے کے لیے اس کی ذات پر کیچڑ بھی اچھال سکتی ہے۔ کوریڈور سے مڑتے موحد سے اس کا ٹکراؤ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اس پر ہی الٹ پڑی۔

"دکھائی نہیں دیتا کیا..... ؟ سامنے سے چپ چاپ چلے آرہے ہو۔ کسی سے ٹکرا کر چاہے کتنا ہی نقصان کر دو اس کا۔"

"اوہ..... سوری مادام..... یاد نہیں رہا۔" وہ جیسے فوراً" ہی اپنی غلطی پر پشیمان ہو گیا۔

"میں بھول گیا تھا کہ میں کون سا انسان ہوں۔ میں تو ایک کار یا موٹر سائیکل ہوں۔ موڑ کاٹتے ہوئے ہارن بجانا چاہیے تھا مجھے..... چچ چچ..... یا کم از کم گھر میں چلتے پھرتے ہر وقت سیٹی تو ضرور ہی بجانی چاہیے مجھے تاکہ کسی سے بھی ٹکرانے والا حادثہ نہ ہو جائے۔"

اس کا انداز طنز و استہزا سے بھرپور تھا۔ تو ادھر مہو بھی تپتی سلگتی سوچوں میں گھرا ہوا دماغ لیے آئی تھی۔

"حادثات تو اسی دن سے ہماری قسمتوں میں لکھ دیے گئے، جب تم نے پاکستان میں قدم رکھا ہو گا۔" وہ کلس کر بولی۔ (منحوس) موحد نے اسے گھورا۔

"کہاں تھیں تم ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھیں اور اب آرہی ہو؟ پورے پندرہ منٹ لیٹ۔" اس کا انداز مہ ماہ کو آگ لگا گیا۔

"میرے دادا بننے کی کوشش مت کرو تم..... ہٹو میرے راستے سے..... میں پہلے ہی بہت غصے میں ہوں۔"

"تو نئی بات کیا ہے اس میں۔" وہ آہستہ سے کہتے ہوئے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ بمشکل اپنے غصے پر قابو پا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم جیسے کو کیا پتا کسی کا دل ٹوٹنا اور اس کی تکلیف سہنا کیا ہوتا ہے۔ تم تو اپنی عیاشیوں میں ہونا۔"

موحد نے ذرا سی آنکھوں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ "ہاں۔۔۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "وہ مجھے کیا پتا۔۔۔ دربدری کا دکھ جھیلا ہو میں نے تو پتا ہو مجھے۔۔۔ بنا قصور کے کبھی مجھے سزا ملی ہو تو پتا ہو کہ دل کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔"

مہر ماہ کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ وہ بھی تو چودہ سال کا بن باس کاٹ کر آیا تھا اور پھر اس کا کیا قصور اس قصے میں جو یوں اس کو رگڑا جائے۔ وہ بے بسی سے بولی۔

"نمیر سے ملنے گئی تھی میں۔"

موحد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"افوہ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ اب یہ وکیلوں جیسی نظروں سے مت دیکھو مجھے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"مطلب۔۔۔ تم سیر یسلی اس کے ساتھ رخصت ہونے کا سوچ چکی ہو۔؟" وہ متحیر تھا۔

مہر ماہ کا دل چاہا۔ ایک تھپڑ کھینچ کر اسے دے مارے۔ "تم اس قابل ہو ہی نہیں کہ کبھی میری مدد کر سکو۔ میں ہی بے وقوف ہوں جو تم سے اپنی پرابلم شیئر کر لیتی ہوں۔" وہ غصے سے بولی تو ضبط کرتے ہوئے بھی آواز بھرا ہی گئی۔

"تم بھی تو پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ اور تم۔۔۔ تمہارا واقعی رابطہ ہے نمیر سے؟" وہ جیسے پہلے اس کی بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ اب بے یقینی سے پوچھنے لگا۔ مہر ماہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوہ گاڈ۔۔۔" موحد حیران تھا۔

"اس نے مجھے ملنے کے لیے کہا تھا۔" وہ اضطرابی انداز میں اپنے شولڈر بیگ کا اسٹریپ مسل رہی تھی۔

"تمہارے پاس اس کا رابطہ نمبر ہے تو تم نے کیوں نہیں بتایا؟" وہ جانچتی نظروں سے مہر ماہ کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے چہرے سے اس کے عزائم کا اندازہ لگانا چاہ رہا ہو۔

مہر ماہ نے تھک کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ "مجھے ثمرہ چچی نے کہا تھا۔"

موحد بڑے زور سے چونکا۔ "ماما نے۔۔۔؟ ان کو پتا تھا کہ تم نمیر سے ملنے جا رہی ہو؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن انہوں نے ہی کہا کہ مجھے نمیر سے بات کرنا چاہیے پھر اس کی کال آ گئی تو میں نے سوچا جا کر اس سے خود بات کر دوں۔ اسی چکر میں گھر والوں کو بھی نہیں بتایا۔ مگر کر نہیں سکی۔ وہاں اچانک ہی طلال سے ملاقات ہو گئی۔" مہر ماہ بے چارگی سے بولی۔

"یہ کون سی الف لیلیٰ سنا رہی ہو۔ اتفاقات سے بھری۔" موحد نے اسے گھورا تو وہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتی ٹیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی۔

"تم۔۔۔ اسی لیے میں تمہیں کچھ بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔ تم نے آج تک میری بات سمجھی ہے۔ جو آج سمجھو گے۔"

"اللہ۔۔۔" وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ مہر ماہ سر جھٹکتی چلی گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

موحد سیدھا ثمرہ کے پاس آیا۔ وہ ابھی اپنی الماری ٹھیک کر کے فارغ ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

"تم گئے نہیں ابھی۔۔۔ فیکٹری کا چکر لگانا تھا نا تم نے تو۔"

"جا ہی رہا تھا۔ مگر یوں ہی ایک بات پوچھنے آ گیا واپس۔" وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ ثمرہ چونکیں۔

"خیریت۔۔۔؟"

"مہر ماہ کو آپ گائیڈ کر رہی ہیں نمیر کے معاملے میں؟" اس نے سیدھے سبھاؤ پوچھ لیا۔

انہوں نے گہری سانس بھری اور اپنے بستر پر آ بیٹھیں۔ "تو اس میں اعتراض والی بات کیا ہے؟" وہ پرسکون تھیں۔

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ غلط کریں ماما!" موحد کے احساسات عجیب سے ہونے لگے۔

"اگر وہ نمیر کو سیدھے راستے پر لا سکتی ہے تو وائے ناٹ موحد؟" انہوں نے زور دے کر کہا تھا۔

"جو کچھ یہ لوگ اس کے ساتھ کر چکے ہیں اس کے بعد بھی آپ کا خیال ہے کہ وہ مہر ماہ کی باتوں میں آجائے گا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"محبت بڑے بڑوں کو بدل دیتی ہے موحد۔ اگر مہر ماہ نے دل سے چاہا تو ضرور۔" وہ پُر یقین تھیں۔

"فار گاڈ سیک ماما۔ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ کا خیال ہے کہ زبردستی کے نکاح کے بعد ڈرامائی انداز میں مہر ماہ نمیر کے لیے اچھا اچھا سوچنے لگے گی۔" اسے نہ چاہتے بھی ہنسی آگئی۔

"تو ڈرامے بھی حقیقت سے بنتے ہیں۔ ان کی کہانیاں کون سا آسمان سے اترتی ہیں۔" وہ برا مان گئیں۔

"تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ مہر ماہ اگر چاہنے لگے کہ اس کے اور نمیر کے درمیان یہ رشتہ برقرار رہے تو میں یا تم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔"

وہ مسکرا دیں۔ موحد کو ان کی خوش فہمی (بلکہ غلط فہمی) پر ہنسی آئی۔

"آپ کے کہنے میں آکر وہ جال بچھا کر نمیر آفندی کو پکڑنے کے چکروں میں ہے میری معصوم ماما۔ اور یہ نکاح اس نے بدلہ لینے کے لیے کیا ہے نا کہ مہر ماہ کو باعزت رخصت کروانے کے لیے۔"

"بدلہ تو وہ آغا جان سے لے گا نا..... مہر ماہ بے چاری تو بس ایک مہوبنی ہے اس کا۔" ثمرہ نے اسے جتایا تو چند لمحے انہیں دیکھنے کے بعد وہ جیسے مایوس ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

مہر ماہ کا دل چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دے۔ اس کا ذہن شدید صدمے کی گرفت میں تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ تزئین اپنی خوش حال زندگی کے لیے اس کی کردار کشی کرنے سے بھی نہیں چوکے گی۔

"کیا ہوا آپی!" ملاحہ اس کی شکل دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ (اف یہ ماں جائیوں کی نظر)

"کچھ نہیں ہوا بس تھکاوٹ سی ہے..... کیا پکایا ہے آج۔" اس نے بات بدل دی۔

"قیمہ مٹر ہے اور ساتھ ماش کی دال چکن۔" وہ کہتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ ہو رہے تھے اور ناک کی نوک بھی۔ بیگ رکھتی' وہ بستر پر گر سی گئی۔

"کیا ہوا ہے آپی؟ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

مہر ماہ نے لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"آپی' تمہاری آنکھوں سے لگ رہا ہے جیسے رو کر آئی ہو۔"

"ان آنکھوں کو کچھ تو سزا ملنی چاہیے شیشے کے خواب دیکھنے کی۔ جو ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو ملاحہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ہر انسان کو خواب دیکھنے کا حق ہے آپی!" اس کی آواز گلے میں گھٹ سی گئی۔ اپنے خواب ذہن میں گھوم گئے تھے۔

مہر ماہ نے بازو ہٹایا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ "خواب دیکھنے والوں کو ان کا تاوان بھرنے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے ملی۔ تم نے دیکھا..... میں نے کتنا عظیم تاوان بھرا ہے ان خوابوں کا جن کی تعبیر میرے حصے میں آئی ہی نہیں۔ شیشے کے خواب..... جو ٹوٹیں تو کرچیاں تا عمر آنکھوں میں کھبی رہیں۔" اس کے حد درجہ دل گرفتہ انداز پر ملاحہ کا دل گداز ہونے لگا۔ آنسو مہر ماہ کی آنکھوں کے کونوں سے بہہ نکلے۔ وہ چھت پر کھلی آنکھیں جمائے تھی۔ ملاحہ کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔

"سائرہ چچی نے بھی اچھا نہیں کیا ہمارے ساتھ۔"
"ان کا کوئی قصور نہیں۔ بس قسمت نے ہی اچھا نہیں کیا۔" مہواہ نے تھک کر آنکھیں موندیں تو آنسو اس کی کنپٹیوں پر پھسلنے لگے۔
"لائٹ آف کردو ملی... میں سونا چاہتی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔"
ملاحہ بھیگتی آنکھوں کے ساتھ بتی بند کرتی باہر نکل آئی۔ آغا جان کے اسٹڈی روم سے نکلتے کبیر کی نظر، آنکھیں رگڑتی ملاحہ پر پڑی تو لحظہ بھر کو وہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوا۔ آج بہت سارے دنوں کے بعد وہ سرپھری دکھائی دی تھی۔ تو ہمیشہ کی طرح نظر بچا کر اس کے پاس سے گزر جانے کو دل نہ چاہا مگر آج جب اس سے ایک نگاہ ملنے کے باوجود ملاحہ سپاٹ چہرہ لیے اس کے قریب سے گزر گئی تو وہ متحیر سا گردن موڑے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
(تو کیا محبت کے پرندے نے اپنے خوشنما پر سمیٹ لیے تھے؟) کبیر خان کو تو ہاتھ جھاڑنے چاہئیں تھے۔ خس کم جہاں پاک۔
مگر دل تھا کہ دور جاتی موڑ مڑتی ملاحہ آفندی کے قدموں سے لپٹا جاتا تھا۔ وہ دل کی اس بے ایمانی پر ششدر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ سرد تاثرات لیے شرٹ کے بٹن بند کرتا آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ گیلے بال بے ترتیبی سے پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ تزئین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہیئر برش اٹھایا اور طلال کے بالوں کو سنوارنے لگی۔ وہ لمحہ بھر کو ساکت ہوا پھر اس نے جھپٹ کر تزئین کے ہاتھ سے برش چھینا۔
"جاؤ، جا کر اپنا کام کرو... ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ کبھی گھر کے معاملات بھی دیکھ لیا کرو۔" اس کا انداز اس قدر حقارت آمیز تھا کہ تزئین سُن رہ گئی۔
ابھی تو گزری رات کے جگنو، مٹھی میں بند، زندہ تھے۔ ابھی تو وہ قرب کے اسی فسوں کے حصار میں تھی۔
تو طلال نے وہ حصار اتنی جلدی کیسے توڑ دیا؟
"طلال... کیا ہوا ہے؟"
وہ پریشان ہونے لگی۔ وہ تو سمجھی تھی کہ مہواہ کو طلال کی نظر سے گرا کر وہ اپنا راستہ صاف کر چکی ہے۔ مگر وہ تو پھر سے اسی سیڑھی پر جا کھڑا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا تزئین... پلیز ابھی میں کچھ دیر تک تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔" وہ صفاچٹ انداز میں کہتا اسے اس کی نگاہوں میں گرا رہا تھا۔
"ہاہ... ٹھیک..." وہ سلگ کر تمسخرانہ ہنسی۔ "تو مسٹر طلال نوید... تمہارا شمار بھی ان ہی اصیل مردوں میں ہوتا ہے، جنہیں بیوی صرف رات کے اندھیرے میں اچھی لگتی ہے۔"
اس کے الفاظ نے طلال کے تن بدن میں آگ لگادی۔ "شٹ اپ... گیٹ آؤٹ فرام مائے آئیز (میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔)"
اس کی آنکھوں میں غصے کی لالی اترنے لگی تھی۔
"تو کیا غلط کہا ہے میں نے... تمہارا ابھی کا رویہ بتا رہا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔" وہ ڈرے بغیر بولی۔
"جب تمہیں پتا ہے سب کچھ تو پھر کیوں بحث کر رہی ہو، جاؤ اور دماغ خراب مت کرو میرا۔" وہ بے رخی سے بولا تو تزئین لب بھینچتی پیچھے ہٹ گئی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی جلد بازی کام خراب بھی کر سکتی تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ دونوں اکٹھے پہنچے۔ طلال کم از کم رمشہ بھابھی کو اپنے "اندرون خانہ" حالات کی بھنک بھی پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ پاپا نے رات دیر سے گھر آنے پر اس سے بازپرس کی۔ مگر وہ سر جھکائے توس کے ساتھ فرائی انڈہ ختم کر رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں انکل۔۔۔! ابھی کبھار دوستوں میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" تزئین نے مسکرا کر کہا۔ چائے کا کپ خالی کرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تزئین اچھی بیویوں کی طرح گاڑی تک اس کے ساتھ گئی۔

"شام کو جلدی آنا۔ امی کی طرف چلیں گے۔" تزئین نے نکلتے ہوئے اسے یاد دہانی کروائی۔ طلال کا دماغ جھنجھنایا۔

بے وقوف عورت زخموں کو بھرنے ہی نہیں دیتی تھی۔

✡ ✡ ✡

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آغا جان نے کیا سوچ کر اکاؤنٹس کا شعبہ اس کل کے بچے کے حوالے کیا ہے۔ دو' دو' تین' تین روز چیک اس کی ٹیبل پر پڑا رہتا ہے۔ اپروول کے انتظار میں۔" سدا کے ٹھنڈے مزاج سہیل آفندی اس وقت تپے ہوئے تھے۔

"میں اس سلسلے میں آغا جان سے بات کر چکا ہوں سہیل! کوئی فائدہ نہیں۔ آغا جان کے دماغ میں جو بات سما جائے' وہ بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" ہبین صاحب نے لب کشائی کی۔

"ساری عمر لگائی ہے اس کاروبار میں ہم نے۔ محنت سے یہ بزنس ایمپائر کھڑا کیا ہے۔ سر توڑ محنت سے اس مقام تک پہنچے ہیں۔ اور وہ آکر پکی پکائی پر بیٹھ گیا ہے۔" ان کے منہ میں بیوی کی زبان بول رہی تھی۔

چپڑاسی کے ذریعے بلائے جانے والا موحد ان کے آفس میں داخل ہوا تو اس کے کان بہ خوبی ان کا آخری جملہ سن چکے تھے۔

"اگر آپ نے محنت کی تو ہمارے جانے کے بعد چودہ سال تک اس کا صلہ بھی تو اکیلے ہی وصول کرتے رہے ہیں آپ۔۔۔ اگر میں اسی میں سے حساب مانگوں اپنے حصے کا تو کوئی ریکارڈ نہیں ملے گا مجھے۔" وہ خوش دلی سے کہتا انہیں جتاتے ہوئے کرسی میں دھنس گیا۔ کہ وہ ان کی بات سن چکا ہے۔

"جی فرمایئے۔۔۔" وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ پوری طرح سہیل آفندی کی طرف متوجہ تھا۔ انہوں نے گڑبڑا کر بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ انداز یہی تھا کہ اب وہ بات شروع کریں۔ مگر وہ خاموشی سے بیٹھے رہے۔ جانتے تھے کہ موحد کے پیچھے آغا جان کی شہ ہے۔ مجبوراً" سہیل صاحب کو ہی بات شروع کرنی پڑی۔

"دیکھو برخوردار! ہم نے اس بزنس کو ساری عمر دی ہے اپنی اور اسے بڑے اصولوں کے ساتھ چلایا ہے۔" انہوں نے تمہید باندھی۔ تو وہ آنکھوں کو خفیف سی جنبش دے کر لاپروائی سے بولا۔

"وہ دن تو لد گئے اب نیا زمانہ' نئے اصول ہیں چچا جان۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہمارے دن گزر گئے اب؟ اور یہ جو بزنس ایمپائر کھڑی کی ہے ہم نے اس کے والی وارث صرف تم ہی ہو۔" انہیں غصہ آنے لگا۔

"الحمدللہ۔۔۔" وہ بشاشت بھرے لہجے میں بولا۔ آرام سے سیٹ پر نیم دراز کیفیت میں بیٹھا ہلکے ہلکے آگے پیچھے کرسی جھلا تا وہ اس وقت سکون کی سب سے بلند سطح پر تھا۔

"گھر کا بیٹا ہی تمام پراپرٹی کا وارث ہوا کرتا ہے۔"

"تم بیٹے بنتے تو ہم اف بھی نہ کرتے موحد! مگر تم نے آفس مینجمنٹ میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان کے لیے ہم

دونوں میں سے کسی سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا۔" وہ اندر ہی اندر تلملا رہے تھے۔

"ایسا کیا کردیا میں نے؟ پیسہ کہاں جارہا ہے اور کہاں خرچ ہورہا ہے' اگر چیک کے ساتھ اس کی ڈیٹیلز مانگ لیں تو کیا کوئی جرم ہوگیا ہے؟" وہ اسی پرسکون انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"اب ہم تمہیں حساب کتاب دیا کریں گے؟" مبین آفندی کو لب کشائی کرنا ہی پڑی۔ ناگواری سے پوچھا۔

"میں کون سا کسی کو لائن حاضر کررہا ہوں۔ بس چیک کے ساتھ ڈیٹیلز بھی ٹائپ کرواکر بھیج دیا کریں۔ تاکہ اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کلیئر رہے۔ ماہانہ یا سالانہ جمع خرچ کے رجسٹرز نہ بنانے پڑیں۔" وہ کہہ رہا تھا اور دونوں بھائی اس کی باتوں پر بل کھا رہے تھے۔

"پھر بھی اگر آپ مطمئن نہیں ہیں تو آغا جان سے بات کرلیں۔ میں تو انہی کی اجازت سے یہ چینجز لایا ہوں۔" وہ اٹھنے کو تھا۔

"چلو ڈیٹیلز بھی بندہ بتادے' مگر چیک کو دو' دو' تین' تین دن تک رکھنا۔۔۔ یہ کہاں کا بزنس ہے؟" سہیل آفندی تلملائے۔ مگر اب کی بار کوئی وضاحت پیش کیے بنا وہ کرسی پیچھے دھکیلتا اٹھ گیا۔

"امید ہے کہ ساری بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب میں چلتا ہوں' ایک امپورٹنٹ میٹنگ ہے میری۔" وہ مسکرا کر کہتا دروازہ کھول کر نکل گیا۔

"یا اللہ۔۔۔ کیا مصیبت ڈال دی ہے آغا جان نے ہمارے سر پہ۔۔۔" سہیل آفندی نے سر ہاتھوں میں تھاما۔

"میرے خیال میں تو یہ سارا بزنس برباد کرکے ہی چھوڑے گا۔۔۔ یا پھر قبضہ کرکے۔" مبین آفندی کو بھی آنے والے وقت کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ موحد اب ان میں جتنا بھی گھل مل گیا ہو' اس کی آنکھوں کا سرد سا تاثر اس کی شخصیت کے پوشیدہ اسرار کو ظاہر کرتا تھا۔

"آغا جان سے بات کرنا پڑے گی کھل کر بھائی صاحب ورنہ حالات کا رخ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔" سہیل آفندی متفکر تھے اور مبین صاحب سوچوں میں گم۔

"اوپر سے وقار کے بیٹے والا مسئلہ بھی شروع ہوچکا ہے۔ اگر کل کلاں کو وہ بھی اپنا حصہ مانگنے پر آگیا تو ہم دونوں بھائی تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔" انہوں نے بروقت ایک تلخ و تاریک حقیقت ان کے سامنے لا رکھی تھی۔ وہ سن سے بیٹھے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

طلال اور تزئین آئے ہوئے تھے۔

وہ کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھی نروس سی' ناخن چبا رہی تھی۔ جو کچھ طلال اسے کہہ چکا تھا اور تزئین نے جو کیچڑ اس پر اچھالی تھی' اس کے بعد کیا اسے یونہی منہ چھپائے بیٹھے رہنا چاہیے یا سب کا سامنا کرنا چاہیے؟

کھانے کا وقت ہورہا تھا۔ یقیناً" ملاحہ اس کا کھانا کمرے میں ہی دے جاتی۔ لیکن درحقیقت مہاہ کو خود اپنا اس طرح بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر بیٹھنا پسند نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچ کر جوتوں میں پیر ڈالتی اٹھی اور شانوں پر دوپٹا درست کرتی کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا رخ کوریڈور کی طرف تھا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی اندر سے "یس" کی آواز نے اسے اطمینان کا احساس دلایا۔ وہ بلا جھجک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو موحد بھی شاید باہر آنے کی تیاری میں ہی تھا۔ آئینے میں اس کا عکس دیکھ کر پلٹا۔

"جی فرمائیے۔۔۔ طنز کے جو تیر رہ گئے تھے وہ تو نہیں چلانے آئیں؟" وہ اس کے گزشتہ رویے پر چوٹ کررہا تھا۔ مہاہ نے سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو' بول لو جو بولنا ہے' میں سن رہی ہوں۔ اس کا یہ

انداز موحد نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔ بالوں کو کیچو میں جکڑ کر ایک شانے پر دوپٹے ڈالے تیوہ کھانے والی وہ کچھ کچھ پرانی والی مہواہ لگ رہی تھی۔

"تم کھانا کھانے جا رہے ہو؟" وہ خاموش ہوا تو مہواہ نے پوچھا۔

"جا تو رہا تھا' کیوں۔۔۔ کوئی مسئلہ ہے کھانے میں۔۔۔ ٹھیک نہیں پکا؟" وہ تو گویا فکر مند ہی ہو گیا۔ مہواہ نے دانت دل ہی دل میں کچکچا لیے۔ مگر بظاہر نرمی سے مسکرا کر بولی۔

"بس یونہی۔۔۔ میں چاہ رہی تھی کہ تمہارے ساتھ جاؤں۔" موحد ٹھٹکا۔

"تزئین آئی ہوئی ہے۔"

وہ زیرک تھا' فوراً" معاملے کی تہہ تک پہنچا۔ مہواہ نے سینے میں کب سے دبی سانس نکالی اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اب تم نے ڈرنا شروع کر دیا ہے اس سے۔۔۔" وہ شرم دلانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"میں کسی سے نہیں ڈرتی۔۔۔ بس تزئین کا گھر میری وجہ سے خراب نہ ہو۔" مہواہ نے بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ چنے۔

"تمہاری وجہ سے خراب ہونا ہوتا تو بستا ہی نا ہے۔ طلال نے اپنی مرضی سے پروپوزل دیا تھا' تزئین کے لیے اور اس نے بھی مکمل رضامندی سے ایکسپٹ کیا تھا۔"

"تم نہیں جانتے' وہ کیا کر رہی ہے' اس گھر کو بسائے رکھنے کے لیے۔" ٹینشن کے مارے مہواہ کی زبان پھسل ہی گئی۔ موحد نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ جیسے کچھ اندازہ لگایا ہو۔

"تمہیں طلال نے کچھ بتایا ہو گا۔" وہ فوراً" بولا تو مہواہ گڑبڑائی۔ پھر جلدی مچادی۔

"اوفوہ! میں بھی کہاں باتوں میں لگ گئی۔ چلو جلدی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کیا بتایا ہے تمہیں طلال نے؟" وہ سنجیدہ تھا۔ "بلکہ تم نے کیا' کیا بتایا اسے؟"

"میں تمہیں بے وقوف نظر آتی ہوں۔" وہ سخت برا مان کر بولی۔

"نہیں' خیر دیکھنے میں تو بالکل بھی نہیں لگتی ہو۔" موحد نے جیسے اس کا دل رکھا تھا۔ مگر اس کے الفاظ اف۔ مہواہ نے اسے گھورا۔

"تم چل رہے ہو یا میں جاؤں؟"

"تم بتا رہی تھیں جو طلال نے تم سے کہا تھا۔" اس کا انداز سراسر بلیک میلر زدہ تھا۔

"میں نے کب کہا کہ میں بتا رہی ہوں؟"

"تو پھر جاؤ۔ میں نے بھی کب کہا کہ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔" وہ شانے اچکا کر بڑی بے مروتی سے بولا تو مہواہ نے دانت کچکچائے۔

"مائنڈ مت کرنا! ویسے بہت ڈھیٹ ہو تم۔ بنا بات جانے بھی تو تم میرے ساتھ چل سکتے ہو۔" اس کے انداز پر موحد نے بہ مشکل مسکراہٹ دبائی اور منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ یعنی وہ منتظر تھا اور بات جانے بغیر ٹلنے والا نہیں تھا۔ مہواہ کھنکھاری۔

"دراصل! تزئین نے تمہیں' میرے انکار کی وجہ بنا کر پیش کیا ہے' طلال کے سامنے۔" وہ مدھم مگر مجرمانہ انداز میں بولی' تو اسے جھٹکا لگا۔

"کیا مطلب؟" فوری طور پر وہ سمجھا نہیں تھا۔

"مطلب یہ کہ طلال سمجھ رہا ہے کہ شادی سے انکار کی وجہ تم ہو۔" وہ مجرمانہ انداز میں بولی۔

"اور یہ اسے تزئین نے کہا ہو گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ مہماہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"یعنی اب میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں۔ تزئین کے کہے پر مہر ثبت کرنے؟" وہ طنزیہ بولا۔
"کیا فرق پڑتا ہے موحد.....! میں اگر تھوڑی سی اور بری بن کر تزئین کی زندگی کو بہتر بنا دوں۔" مہماہ نے اپنی بات پر زور دیا۔
"اب بات ہمارے کریکٹر پر آ رہی ہے مہو....."
"سو وات.....؟ تمہارے خیال میں جو کچھ نمیر آفندی نے میرے ساتھ کیا ہے' وہ معاشرے کی نظروں میں میرا کردار خراب کرنے کو کافی نہیں؟" تلخی سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔
"مکان گر جائے تو ہر کوئی اسے گزرگاہ بنا لیتا ہے موحد! تو جو کوئی کچھ بھی کہے۔ اتنا دکھ نہیں ہوتا' جتنا برا اس شخص نے کیا ہے میرے ساتھ....."
"اچھا..... کیا کرنا ہے وہ بتاؤ مجھے۔" لمحہ بھر گنگ رہنے کے بعد وہ بہ مشکل بات بدل پایا۔ مہماہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور بولی۔
"بس تم اور میں اکٹھے جائیں گے ڈائننگ ٹیبل پر۔ طلال کو تزئین کی بات سچ لگنی چاہیے۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔ موحد نے گہری سانس لی۔
"لیکن تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا..... زبردستی ہی سہی مگر نکاح ہو چکا ہے میرا۔" دروازے سے نکلتے ہوئے وہ مسکرا کر کہتی شاید اپنے آپ کو نارمل کر رہی تھی۔ موحد لب بھینچ کر رہ گیا۔
ان دونوں کو اکٹھے اندر آتے دیکھ کر تزئین اور طلال کے تاثرات الگ تھے۔ تزئین کے دل میں تو ٹھنڈ سی اتری مگر طلال کی رگوں میں تو کھولتا لاوا دوڑا تھا۔ موحد بہ آواز بلند سلام کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ طلال کو لفٹ تو اس نے تب بھی نہیں کروائی تھی جب وہ مہماہ کا منگیتر تھا۔ اب بھی دور ہی سے سلام.....
مہماہ آگے بڑھ کر تزئین سے گلے ملی۔ اس کا احوال پوچھا اور پھر موحد کے ساتھ والی کرسی پر ہی بیٹھ گئی۔ مہماہ کے اس قدر کھلے دل کے مظاہرے نے ٹیبل پر ماحول اچھا رکھا۔ مگر طلال..... تزئین کو اس کے چہرے کا تناؤ صاف نظر آ رہا تھا۔
(اتنا کچھ مہماہ کے خلاف بتایا' پھر بھی منہ بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔)
تزئین کھانے کے لوازمات اٹھا اٹھا کر طلال کے آگے کر رہی تھی۔ مگر طلال کا سارا دھیان موحد کی پلیٹ میں بریانی پر فورک کے ساتھ شامی کباب رکھتی مہماہ کی طرف تھا۔
موحد کا مسکراتا ہوا تھینکس اور مہماہ کا مدھم سا ویلکم کہنا.....

طلال کا پورا وجود ہی کان بن چکا تھا۔
اس نے اس پل سامنے بیٹھی اس پیاری اور نفیس سی لڑکی سے سخت نفرت محسوس کی تھی۔ جو اس کی زندگی کو اجاڑ کر کسی اور کے باغ میں کھل رہی تھی۔ مہک رہی تھی۔ اس سے ڈھنگ سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔
اور مہماہ۔ وہ اپنا دل مضبوط بنائے' بہت لاپروائی کا تاثر دے رہی تھی..... اسے یہ تاثر دینا ہی تھا۔
"بھئی' ہمارے لیے چائے تو مہو ہی بنائے گی۔" کھانے کے بعد تزئین نے اونچی آواز میں کہا۔
تائی جان نے سرد نگاہ اس پر ڈالی۔ طلال کے ساتھ خوش دکھائی دینے کی کوشش میں نڈھال ہوتی یہ لڑکی ان کی بیٹی کا دل دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے جتا رہی تھی کہ جو تم نہ پا سکیں' وہ میں نے حاصل کر لیا ہے۔ ان کا تو دل تھا کہ مہماہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھا لیتی' مگر پھر خیال آیا کہ کتنا عرصہ وہ یونہی چھپ چھپ کر زندگی گزارے

گی۔ مہماہ مسکراتے ہوئے چائے بنانے اٹھ گئی۔

"میں بھی آتا ہوں۔ تمہاری ہیلپ ہو جائے گی۔" موحد جس طرح اچانک اس کی تقلید میں اٹھا تھا۔ اس نے مہماہ کو جز بز کیا۔ شکر کہ مرد حضرات طلال سے باتوں میں مصروف تھے۔ البتہ طلال کے حواس اسی طرف متوجہ تھے۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

"دماغ تو خراب نہیں تمہارا۔۔۔" کچن میں آتے ہی مہماہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ موحد نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا۔۔۔ ایکٹنگ اچھی نہیں لگی میری؟" معصومیت سے پوچھا۔ "خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ طلال کو یقین دلانا ہے ہمارے چکر کا۔"

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم طلال کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہی ہو؟" وہ سنجیدہ ہوا۔ مہماہ پر خود ترسی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"اب تو دکھ والی وہ کیفیت ختم ہی ہوئی ہے' موحد کچھ میرے ساتھ ہونے والا حادثہ اور کچھ طلال کا اٹھایا ہوا قدم۔۔۔"

وہ خاموشی سے چائے کے ابلتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی۔ موحد چپ چاپ پلٹ کر کچن سے باہر نکل گیا۔

وہ چائے لے کر آئی تو سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مہماہ نے ہی سب کے لیے چائے بنائی۔ موحد نہ جانے کہاں تھا۔

"یہ موحد کی چائے ہے۔۔۔" مہماہ نے اس کا کپ بھر کر الگ رکھ دیا۔ آغا جان چائے پی کر اسٹڈی روم میں جانے کے لیے اٹھے تو سہیل آفندی اور مبین صاحب بھی ان کے ساتھ ہو لیے کہ آج وہ ہر صورت موحد کی شکایت ان کے کانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ طلال اور تزئین کا رات گئے تک رکنے کا ارادہ تھا۔ تائی جان تو مروّت نبھا کر بس کھانے تک ہی ساتھ بیٹھیں اور چائے اپنے کمرے ہی میں پی۔ اب وہاں صرف ینگ جنریشن ہی موجود تھی۔ مہماہ دل مضبوط کرتی تزئین کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیسی گزر رہی ہے؟" مہماہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا' انداز دوستانہ تھا۔

"جس کے پاس طلال ہو۔۔۔ اس کی لائف کیسی گزر سکتی ہے؟" تزئین نے جواباً "بڑے تفاخر بھرے انداز میں سوال کیا تھا۔ مہماہ کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ طلال کے سامنے تو وہ خوش ہونے کی اداکاری کر سکتی تھی۔ مگر تزئین تو اس کے ساتھ گزرا سارا احوال جانتی تھی۔ اس کے سامنے اب کیا اداکاری کرتی جو دل کے سارے زخموں سے واقف تھی۔ مہماہ خود کو سنبھال کر بہ مشکل مسکرائی۔

"دل کی چور خواہشیں غیر متوقع طور پر پوری ہو جائیں تو ایسی ہی حالت ہوتی ہے انسان کی۔" اس نے رسان سے کہتے ہوئے ادھار نہیں رکھا تھا۔ تزئین نے تلملا کر پہلو بدلا۔

"اللہ جسے جس قابل سمجھتا ہے' اسے اسی طرح نوازتا ہے۔" وہ بہت سلگ کر بولی۔

ملاحہ اور فرزین طلال کو کمپنی دے رہی تھیں۔ طلال نے مہماہ کا سوال بھی سنا اور تزئین کا جواب بھی۔ اس نے چہرا موڑ کر مہماہ کی طرف دیکھا اور تزئین ہی کے انداز میں لفظوں کو چبا کر بولا۔

"اور بعض اوقات اللہ آپ کو بچا لیتا ہے' مصنوعی جذبوں اور کھوٹے اعترافات کرنے والوں سے۔۔۔"

ڈرائنگ روم میں ایک دم سے خاموشی پھیلی۔

"جب انسان کو بہتر کے بدلے بہترین مل جائے تو واقعی اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" مہماہ نے بڑے حوصلے سے جواب دیا تھا۔

"چلو بھئی۔۔۔ میری چائے کہاں ہے؟" موحد ہاتھ آپس میں رگڑتا اندر داخل ہوا اور آ کر مہماہ کے ساتھ ٹوسیٹر پر بیٹھ گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس قدر بے تکلفی کے مظاہرے پر مہماہ اس کی خوب خبر لیتی، مگر اس وقت تو جیسے مہماہ کی سانس آسان ہوئی تھی۔

"مجھے پتا تھا۔ تم آتے ہی شور مچاؤ گے۔ اسی لیے تمہارے لیے الگ نکال دی تھی۔۔۔ ملی، جاؤ ذرا چائے گرم کر کے لاؤ اپنے بھائی کے لیے۔" اس نے مسکرا کر موحد کو دیکھا تو ملاحہ فوراً اٹھ گئی۔

"واہ۔۔۔ دل خوش کر دیتی ہو مہو۔ کتنا خیال رہتا ہے تمہیں۔" موحد تو فدا ہی ہو گیا تھا اتنی "خبر گیری" پر۔

طلال بد مزا ہو کر رہ گیا۔ اب موحد، تزئین سے باتیں کر رہا تھا اور مہماہ بس مسکراتے ہوئے سن رہی تھی۔ وقت کی چاپ نہیں ہوتی، مگر وہ بنا چاپ کے بھی گزرتا چلا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"یعنی تم دونوں اب مل کر مجھے اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے ہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور غلط فیصلے کرنے لگا ہوں؟" آغا جان کو سہیل آفندی کی بات سنتے ہی غصہ آ گیا تھا۔

"آغا جان! آپ تحمل سے بات پر غور کریں۔ سہیل غلط نہیں کہہ رہا۔ آپ سب کچھ موحد کے حوالے کرتے جا رہے ہیں۔ اسے یہ سب سنبھالے وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ اتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں یہ۔" مبین صاحب چونکہ پہلے بھی اس موضوع پر آغا جان سے بات کر کے مایوس ہو چکے تھے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر گفتگو میں شامل ہوئے۔

آغا جان نے سرد نظروں سے انہیں دیکھا۔

"اور اگر موحد کی جگہ تم میں سے کسی کا بیٹا ہوتا۔۔۔ تب بھی تمہیں یہی اعتراض ہوتا؟"

لمحہ بھر کو وہ چپ رہ گئے۔ پھر مبین صاحب نے ہی ہمت کی۔

"اس کے کام کا طریقہ ہم سے الگ ہے آغا جان۔ چیک تک اس کی اپروول کے بعد کیش ہوتا ہے۔ ساری عمر اس کاروبار پر لگانے کے بعد آج حال یہ ہے کہ ایک ایک روپے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ کس لیے لیا، کہاں خرچ ہونا ہے۔"

"مجھ سے اجازت لے کر ہی اس نے یہ طریقہ لاگو کیا ہے۔ اور دو ماہ ہو گئے ایک ایک روپے کا حساب کلیئر ہے۔" وہ موحد کی طرف سے سو فیصد مطمئن تھے۔

مبین صاحب لب بھینچ کر رہ گئے۔

دونوں بھائی ان کے جواب سے بالکل بھی مطمئن نہ تھے۔ مگر موحد کے پیچھے چونکہ آغا جان کا ہاتھ تھا، تو وہ مزید کچھ کہہ کر صرف آغا جان کی نظروں میں اور برے ہی بن سکتے تھے اور بس۔ سو عافیت اسی میں تھی کہ بات یہیں ختم کر دی جاتی۔

☆ ☆ ☆

تزئین اور طلال کی واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ مہماہ تو اندر ہی رہی، جبکہ باقی سب انہیں پورچ تک سی آف کرنے گئے۔

"ایسے ہی دن کے دن چکر لگا لیا کرو تزئین کے ساتھ بیٹا۔ ہمارا بھی دل خوش ہو جاتا ہے۔" سائرہ چچی نے طلال کے سر پر ہاتھ پھیر کر محبت سے کہا۔ وہ مسکرا دیا۔

پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک دم چونکا۔

"اوہ۔۔۔ میرا موبائل وہیں رہ گیا، میں لے کر آتا ہوں۔" وہ واپس پلٹ آیا تھا۔ چچی جان اب لپٹا لپٹا کر تزئین کو

پیار کر رہی تھیں۔

مہپاہ ڈرائنگ روم سے نکل رہی تھی جب طلال کی غیر متوقع واپسی ہوگئی۔

وہ کترا کر ایک طرف ہوئی مگر طلال کے سر میں نہ جانے کیا سمائی۔ مہپاہ کا ہاتھ تھام کر زبردستی اسے واپس اندر گھسیٹ لایا۔

"طلا... لال..." مہپاہ کے اعصاب ٹھٹھر گئے۔

"کیوں... کیوں کر رہی ہو تم میرے ساتھ ایسے 'کب کہاں کیسے راہ بدل لی تم نے اپنی مہو... میں اندھا بنا صرف تم پر اعتماد کے سہارے... مجھے پتا ہی نہیں چلا اور تم نے راستے میں ہی کوئی موڑ بدل لیا۔"

اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا تو وہ دفعتاً ہوش میں آئی اور مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت میں سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت سخت اور بہیمانہ تھی۔

"روپیہ پیسہ 'جائیداد... یہ ہے تمہارا ایمان؟"

اسی وقت موحد... اندر آیا تو بے یقین سا منظر اس کا منتظر تھا۔ مہپاہ کے وحشت زدہ سے چہرے نے پل بھر میں اسے ساری کہانی بتادی۔ اس نے مشتعل ہو کر طلال کے شانے پر ایک ہاتھ رکھ کر اسے مہپاہ سے پرے دھکیل دیا تھا۔

"اٹس نن آف یور بزنس موحد! (یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے)۔" طلال کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ انگشت شہادت اٹھا کر وہ غصے سے بولا۔

"شٹ اپ... اینڈ گیٹ لاسٹ۔" موحد غرایا تھا۔ "میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھ سے یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتے تم۔"

"تم کون ہوتے ہو اس کے جو..." وہ غصے سے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ موحد اس کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں بولا۔

"سب کچھ... سب کچھ ہوتا ہوں میں اس کا... اور تم اس پر ایک میلی نظر بھی ڈالو' میں برداشت نہیں کروں گا۔" وہ بات ختم کرتا تھرتھر کانپتی مہپاہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گیا۔ طلال جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا تو وہاں اکیلا کھڑا تھا۔ اس نے اپنے پسینے سے تر ہوتے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

فرزین اس کے پیچھے آئی۔ "طلال بھائی! موبائل ملا؟"

"اوہ... ہاں... وہ... یہ رہا۔" اس نے بری طرح چونکتے ہوئے کہا۔ صوفے کے پاس تپائی پر اس کا سیل فون پڑا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا کر باہر نکلا تو اس کی پیشانی چمک رہی تھی۔

واپسی پر تزئین شروع ہوگئی۔ "دیکھ لیا تم نے... میں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ مہو تمہارے ساتھ کبھی مخلص تھی ہی نہیں۔ اور بالفرض اگر کبھی تھی بھی تو اب موحد کے پاس پراپرٹی اور بزنس دیکھ کر اس کی رال موحد پر ٹپک پڑی ہے۔" وہ حقارت سے مہپاہ کا ذکر کر رہی تھی۔ طلال کے سر میں درد شروع ہوگیا۔

"شٹ اپ یو... اب بس بھی کردو مہرنامہ... دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔" وہ جھلا کر بولا تزئین کو ایک دم جھٹکا لگا۔

"ہی ہیو یو طلال..." وہ برا مان گئی۔ "تم سے بات نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی۔"

"تو کیا ضروری ہے کہ بات مہپاہ ہی کی ہو؟" وہ زچ ہو کر بولا۔ ابھی تو مہپاہ زہر اور موحد آفندی سب سے بڑا دشمن لگ رہا تھا۔

"تو ہماری بات ہوتی ہی کب ہے آپس میں... جو میں اپنی یا تمہاری بات کروں۔" تزئین آزردہ ہوئی۔

"تو پھر بس چپ کر جاؤ۔ مجھے سکون سے ڈرائیونگ کرنے دو۔" وہ تند لہجے میں بولا تھا۔ تزئین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر کچھ سوچ کے لب بھینچ لیے۔

☼ ☼ ☼

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم طلال پر ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟ ایک بار اسے پتا چل گیا کہ تم اسے پسند نہیں کرتیں، بس کافی ہے۔ بار بار اسے یہ بات جتانے کا کیا مطلب ہے؟" وہ سر جھکائے ٹیرس کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی اور موحد پشت پر ہاتھ باندھے 'سلگتا ادھر ادھر ٹہلتا اس پر برس رہا تھا۔

"تو کیا کروں..... کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں۔ تزئین کی تمسخرانہ نظروں کو برداشت کروں۔ وہ تو یہی سمجھتی رہے گی کہ میں ابھی تک طلال کو کھونے کا غم..." وہ برداشت کھو کر پھٹ پڑی پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

"اسے کیسے بتاؤں کہ مجھے تو نمیر آفندی نے ایسا دکھ دیا ہے کہ طلال کی جدائی کا غم محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ میری تو پوری زندگی سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔" "اب بس کردو مہہ..... بہت ہو گئیں یہ وضاحتیں۔ تمہاری اسی پالیسی کی وجہ سے اس شخص کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ طلال کا انداز یاد آتا تو خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگتا۔

"تم مجھے ایک فیور دے دو موحد..... پلیز....." وہ رونے لگی اور یوں ہی روتے ہوئے بولی۔ "کہیں سے نمیر کا پتا کرو..... میرے پاس اس کا نمبر ہے۔ اس کے ذریعے ٹریس کراؤ اسے۔ وہ شخص میری زندگی برباد کر رہا ہے۔"

موحد نے غصے سے اسے دیکھا۔

"تم لوگوں کو بس اپنی ہی بربادی پہ دکھ ہوتا ہے..... کبھی آغا جان نے سوچا ہے کہ اس سے رابطہ کرکے اس سے بات کی جائے۔ اس کے کیا دکھ ہیں، وہ سنے جائیں۔ مگر یہاں تو سب اسے 'اس کے ماں باپ کے ساتھ ہی مار چکے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ نجانے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔" وہ شعلہ بار لہجے میں بولتا مہہ ماہ کو..... ہراساں کرنے لگا۔

"مگر میرا کیا قصور تھا موحد! وہ شخص مجھے ملے تو میں اس سے پوچھوں۔ اسے کیا حق تھا کہ مجھے اپنی من پسند زندگی گزارنے سے محروم کرتا۔" وہ بے بسی سے بولی تو وہ اس کے بالمقابل آکر پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

"انسان دکھ میں مبتلا ہو تو اسے دوسروں کے دکھوں کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ مگر میں نے یہاں نمیر کے نام کے ساتھ ہمیشہ گالی ہی سنی ہے۔ چلو مان لیا کہ اس کی ماں غلط تھی 'اس کا باپ غلط تھا مگر نمیر کو غلط بنانے والے آفندی ہاؤس والے ہیں۔"

"مگر میرا قصور کیا تھا موحد..... کیا مل گیا اسے یہ قدم اٹھا کر؟" وہ گلابی ہوتی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"سکون....." لمحہ بھر مہہ ماہ کو دیکھ کر اس نے یک لفظی جواب دیا پھر توقف سے پوچھا۔ "تم سب کو بے سکونی دے کر کیا اسے خوشی نہیں ملتی ہو گی؟"

وہ گھٹنوں پر ماتھا ٹکا کر بیٹھ گئی۔

موحد اٹھ کھڑا ہوا اور قطعی انداز میں بولا۔ "بہر حال آئندہ طلال کے سامنے تمہیں اس قدر مجبور اور بے بس بننے کی ضرورت نہیں بلکہ تمہاری طرف سے ایک تھپڑ تو وہ آج بھی ڈیزرو کرتا تھا۔"

"تمہارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے۔ مجھ سے پوچھو' مجھے اپنی زندگی کس قدر قابل رحم لگتی ہے۔ ہر ارادہ' ہر عزم ختم ہو گیا ہے میری زندگی سے'۔ بس اٹھتے بیٹھتے ایک ہی سوچ..... نمیر آفندی مل جائے کہیں سے۔" وہ دل گرفتی سے کہہ رہی تھی۔

"مل جائے گا تو کون سا اسے تخت پر بٹھانا ہے تم لوگوں نے۔" وہ طنز سے کہہ کر مسکرایا تو مہماہ کو دھیان آیا۔
"تم اور چچی جان بہت حمایت کرتے ہو نمیر کی۔" اس کا انداز مشکوک تھا۔ موحد کھل کر مسکرایا۔
"کیونکہ اتفاق سے ہم لوگ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی عادت میں مبتلا ہیں۔"
مہماہ سر جھٹکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب پہلے سے کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی۔
"کتنا بولتے ہو تم موحد، سر میں درد کر دیا۔ اب بس کرو اور سو جاکر۔"
اس کے انداز پر وہ ہنسا۔ "ہاں چھاپہ بھی پڑ سکتا ہے ٹیرس پر۔" مہماہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور جتانے والے انداز میں بولی۔
"اپنی بہن کو بتا کر آئی ہوں میں، ہونہہ!" وہ سر جھٹکتی سیڑھیوں کی طرف چل پڑی جبکہ موحد جنگلے کی طرف آ گیا۔ اندھیرے کو کھوجتی اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ کا پتا دیتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ آغا جان کو اپنی چہیتی بہو اور پوتے سے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔" تائی جان سلگ کر بولیں۔ "ساری عمر ہم نے اس گھر کی چاکری کرتے گزار دی اور وہ دونوں پکی پکائی پر آکر بیٹھ گئے۔"
جب سے مبین صاحب آغا جان سے مل کر ناامید لوٹے تھے تب سے صدیقہ بیگم سلگ رہی تھیں۔ کبھی اٹھتیں کبھی بیٹھتیں مگر کسی پہلو چین نہیں آ رہا تھا۔ کبھی چپ کرتیں اور کبھی پھر کوئی بات یاد آجاتی تو شروع ہو جاتیں۔
"بس کرو نیک بخت! اس طرح ٹینشن لینے سے صرف تمہارا بی پی ہی ہائی ہو گا اور کچھ نہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ آغا جان کو دنیا کی کوئی طاقت ان کے ارادوں سے ہٹا نہیں سکتی۔"
اور واقعی وہ جانتی تھیں۔ اس لیے خاموش ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے۔
تائی جان نے ان کی طرف دیکھا۔
"اور مہماہ کا کیا سوچا ہے آپ نے؟" دھیمی آواز میں پوچھا۔
انہوں نے بے اختیار گہری سانس بھری۔ اس لمحے وہ صدیقہ بیگم کو بہت بوڑھے محسوس ہوئے۔
"اس صدمے سے تو میری ساری ہمت اور عقل جواب دے گئی ہے۔"
اس بے وقوف لڑکی نے تو اپنے لیے خود مسئلے کھڑے کر لیے ہیں۔ کیا ضرورت تھی آکر سب کو بتانے کی کہ اس بے غیرت انسان نے کیا زہر گھولا ہے اس کی زندگی میں۔" وہ مہماہ سے برگشتہ تھیں۔
"نہ بتانا بھی تو مسئلے کا حل نہیں تھا۔ نکاح پر نکاح واقعی حرام ہوتا ہے۔" انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔
"مگر وہ کیا ساری عمر اسی قید میں گزار دے گی؟" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مبین صاحب اٹھ بیٹھے اور ان کا ہاتھ تھام کر حوصلہ دیا۔
"میں اس انتظار میں ہوں کہ نمیر رابطہ کرے تو میں تسلی سے اس سے بات کروں۔ پہلے اگر تم اس کے ساتھ اتنے اکھڑ لہجے میں بات نہ کرتیں تو اسے مذاکرات پر آمادہ کر سکتے تھے ہم۔"
"میرا تو دل کرتا ہے زندہ جلا ڈالوں اس کمینے کو جو بے غیرتی کا خون دوڑ رہا ہے اس کی رگوں میں۔" وہ نفرت سے بولیں۔
"اپنے رویے میں تھوڑی لچک لاؤ صدیقہ! وہ صرف زرنگار کا ہی نہیں وقار کا بھی خون ہے۔ اسی وجہ سے پہلے بھی معاملہ خراب ہوا ہے کہ تم نے ٹھنڈے دل و دماغ سے بات نہیں کی۔" مبین صاحب نے تادیبی انداز میں کہا

تو انہوں نے تنفر سے سر جھٹکا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئیں۔ اس لڑکے سے تو ان کو بن دیکھے نفرت ہو چکی تھی۔
اگلے روز مبین آفندی اسی سلسلے میں آفس سے پہلے آغا جان کے پاس گئے۔ تو وہاں ثمو بھی موجود تھیں۔ مجبوراً انہیں ان کے سامنے ہی بات کرنی پڑی۔

"میں مہواہ کی طرف سے بہت پریشان ہوں آغا جان!"

آغا جان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے پریشان ہونے کی۔"

"بات تو پریشانی ہی کی ہے آغا جان... ساری عمر تو وہ اس گھر میں نمیر کے نام پر بیٹھ کر نہیں گزار سکتی نا... وہ سامنے آئے تو کچھ فیصلہ ہو۔" وہ آزردہ ہوئے۔

"اس رذیل شخص کے نام پر کیوں بیٹھے... پاگل ہو گئی ہے وہ۔" آغا جان گرج پھر زرا دھیمے لہجے میں بولے۔

"بات کو یہیں دبا دو گے تو بات بڑھنے سے پہلے مر جائے گی مبین! لڑکی کا رشتہ ڈھونڈو اور اسے دو بول پڑھا کر رخصت کرو۔"

ان کا مشورہ سن کر مبین صاحب تو جز بز ہوئے ہی تھے' غیر جانب داری سے ان کی گفتگو سنتی ثمو بھی چونکیں اور انہیں لب کشائی کرنا پڑی۔

"ایسا ہو سکتا تو وہ طلال کو انکار نہ کرتی آغا جان۔"

"ہونہہ!" انہوں نے سر جھٹکا۔ "وہ بھی اس کی اپنی بے وقوفی ہے۔ نہ کوئی نکاح نامہ' نہ گواہ نہ ثبوت... اسے تو پتا بھی نہیں کہ وہ نکاح تھا یا ڈراما۔"

"کچھ بھی ہو آغا جان! یہ تو اب نمیر کے سامنے آنے پر ہی پتا چلے گا۔" مبین صاحب دل گرفتہ تھے۔

"میرے گھر میں ڈرامے مت کرو مبین! ایک بار جو بات میں نے کہہ دی وہ سمجھو' پتھر پر لکیر ہو گئی۔ مہواہ کو بھی اچھے سے سمجھا دو۔ اب وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔ اس نے جو کرنا تھا وہ طلال سے شادی سے انکار کر کے کر چکی ہے بس۔"

آغا جان غصے بھرے انداز میں بولے تو مبین صاحب کا دل چاہا کسی دیوار میں سر مار لیں۔ ثمو کے چہرے پر بھی تاسف بھرے تاثرات تھے۔ آغا جان اس گھر کے بزرگ تو تھے مگر انہوں نے کبھی سب کی رضا کے ساتھ کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ مبین صاحب چپ کر کے اٹھ گئے۔

✲ ✲ ✲

وہ ملاحہ کے ساتھ بہت عرصے کے بعد بازار جانے کا پروگرام بنا رہی تھی موسم بدل رہا تھا۔ لان کے کپڑے خریدنے تھے۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔

ملاحہ برآمدے میں آئی۔ ملازمہ کے ہاتھ کبیر کو پیغام بھیجا تھا۔ وہ سوتے سے اٹھ کر آیا تھا۔ ملاحہ کو دیکھ کر رک گیا۔

"اوہ... سوری... تم سو رہے تھے؟" اس کی آنکھوں میں کچی نیند سے بیداری کا گلابی پن دیکھ کر وہ خفیف ہو کر بولی۔

"اب تو اٹھ گیا... حکم کریں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"ہم... گاڑی تیار کرو' شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ مجھے اور آپی کو۔" ابھی اس بے چاری کے دل میں وہ سختی نہ آئی تھی ورنہ ملازمہ کے ذریعے اسے بلانے کا پیغام بھیجا تھا تو گاڑی نکالنے کا بھی کہلوا دیتی۔

مگر پھر بھی اس کا لیا دیا سا انداز کبیر کو بہت بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ورنہ تو وہ ہر وقت ملتفت نظر آتی تھی اور

بجائے نظر انداز کردینے کے کبیر کی شامت اعمال کہ بلا ارادہ بے ساختہ پوچھ بھی لیا۔

"آپ خفا ہیں کسی بات پر؟"

ملاحہ کا دل غوطہ کھا کر ابھرا۔

اللہ اللہ۔۔۔ یہ کبیر بھی انسان تھا۔۔۔ مشین نہیں۔

مگر بظاہر بڑی بے رخی سے بولی۔

"میری تم سے کون سا بہت دوستی تھی جو اب ناراضی ہو گئی۔"

"میں معافی مانگ لیتا ہوں۔" وہ پریشان سا دکھائی دیا۔ ملاحہ کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔

"مانگو۔۔۔" سینے پر بازو لپیٹے راج ہنس کی طرح گردن اٹھا کر فراخ دلی سے کہتے ہوئے وہ دیکھنے کی چیز لگی۔ اور یہی یہی وہ ایک پل تھا جب کبیر خان کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ وہ نظر جو آفندیز کی عورتوں کے چہروں کی طرف اٹھتی ہی نہ تھی۔

ملاحہ آفندی کے چہرے پر سے پہلی بار ہٹنے کو تیار نہ ہوئی۔

"معاف کردیں ملاحہ بی بی۔۔۔" وہ بے اختیار بولا۔ (اپنی ہر بے رخی پر شرمسار ہوں میں) نظر نے باقی بات مکمل کی۔

"ہم۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ سوچوں گی معاف کرنا چاہیے یا نہیں۔ ابھی تو گاڑی نکالو۔"

وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے چلی گئی تھی۔۔۔ اور کبیر خان کا دل اس کے پیروں سے لپٹا جاتا تھا۔۔۔ مگر شاید زلیخا کا دل بدل دیا گیا تھا۔ کبیر خان متحیر سا دل کی جگہ کے خالی پن پر غور کرتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ آدھی شاپنگ کر کے ہی تھک گئی۔ شاپنگ بیگز اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

"تم اپنے لیے پسند کرو' میں یہ بیگز گاڑی میں رکھ آؤں۔" مہواہ نے اسے جوتوں کی دکان میں گھستے دیکھ کر کہا تو وہ سر ہلاتی اندر چلی گئی۔ مہواہ سارے ہی شاپنگ بیگز تھام کر شاپنگ مال سے باہر نکلی۔ اسے ایک دھکا سا لگا تو وہ لڑکھڑائی اور بمشکل گرنے سے بچی۔ مگر سارے شاپنگ بیگز ہاتھوں سے پھسلتے چلے گئے۔

"اوہ سوری۔۔۔" کوئی شرمسار ہوا اور وہیں پنجوں کے بل بیٹھ کر اس کے بیگز اٹھانے لگا۔ مہواہ نے ایک سخت سی نگاہ اس ٹکرانے والے پر ڈالی اور وہیں سن رہ گئی۔

وہ نمیر آفندی تھا۔ یہ شکل تو وہ اب زندگی بھر نہیں بھول سکتی تھی۔

"نمیر۔" وہ بے یقینی سے اونچی آواز میں بول گئی۔ تو وہ بری طرح چونکا اور اس کو پہلی بار دیکھا۔

"اوشٹ۔۔۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مہواہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ وہ پلٹ رہا تھا۔

"نمیر۔۔۔" مہواہ نے دوبارہ سے اسے پکارا۔ اب کی بار غصے سے۔ اب اگر وہ دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتا تو شاید کبھی نہ ملتا اور وہ انتظار اور کرب کی سولی پر لٹکتی رہتی۔ مگر اس کا رکنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مہواہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر پیچھے سے اس کا کالر پکڑ کر کھینچا تو وہ لڑکھڑا کر رکا۔۔۔ ایک تماشا سا لگنے لگا۔

"ایکسکیوزمی۔" وہ مڑ کر دھیمے مگر غرانے والے تادیبی انداز میں بولا۔ مگر مہواہ کا دماغ اس وقت تک اتنا خراب ہو چکا تھا کہ نفرت کی آگ میں سلگتا ایک زوردار تھپڑ اس نے نمیر کے منہ پر دے مارا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ثنائلہ دلعباد

امی کے بار بار اٹھانے پر وہ اٹھ تو گئی تھی، مگر ابھی بھی جھولتی پھر رہی تھی، نیند کم بخت سر پر چڑھ کر ناچ رہی تھی۔ اگر ماموں، مامی شادی کی تاریخ لینے نہ آرہے ہوتے تو وہ کبھی بھی نہ اٹھتی۔

ماموں کی عادت تھی وہ دوپہر کا کھانا جلدی کھا لیتے تھے پھر ظہر پڑھتے، کچھ دیر آرام کرتے اور پھر دوبارہ اسٹور چلے جاتے۔ آج اسٹور پر جانے کے بجائے شادی کے معاملات طے کرنے تھے اس لیے امی نے حکم جاری کیا تھا کھانا ہر حال میں ایک بجے تک تیار کرنا ہے۔ کچن میں آکر ہاتھ بٹاؤ ویسے تو اسے کچھ خاص بنانا نہیں آتا تھا، مگر سلاد اور چیزیں اٹھا اٹھا کر دینا اور ساتھ ساتھ برتن سمیٹنا اس کی ذمہ داری تھی، مگر یہ نیند کچھ کرنے دے تو نا، ابھی خود بھی تیار ہونا تھا ذرا خاص سا کیونکہ عاصم بھی ساتھ آرہا تھا۔

وہ اور عاصم گزشتہ چار سال سے ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ عاصم اس کے بڑے ماموں کا بیٹا تھا۔ اس سے بڑے کاظم اور ناظم شادی شدہ تھے پھر عاصم اور عاصم کے بعد گڑیا۔ مہوش اپنے گھر میں سب سے بڑی تھی باقی بہن بھائی ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

آج وہ بہت دن بعد عاصم کو دیکھ رہی تھی دوسری طرف عاصم بھی نگاہوں کے شعلے برسا برسا کر اسے بھسم کیے جا رہا تھا۔ آپ غلط سمجھے، یہ شعلے جذبات کے تھے، غصے ناراضی کے نہیں مہوش کو لگا اس کی گھنٹہ لگا کر تیار ہونے کی محنت وصول ہو گئی اور پھر بائیس دن بعد شادی طے پا گئی۔

✡ ✡ ✡

جب وہ کھانا کھا کر، کپڑے تبدیل کر کے اپنے بیڈ پر لیٹی تو حسب توقع عاصم کی اٹھائیس مسڈ کال اور لاتعداد واٹس ایپ میسج آچکے تھے اس نے فوراً "جی" لکھ کر سینڈ کر دیا جواباً "کال آ گئی۔

"کب سے کال کر رہا ہوں۔"

"میں کھانا کھا کر امی کو بتا کر آئی ہوں کہ اب مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے مجھے سونا ہے۔ وہ تو بہت ڈانٹ رہی تھیں کہ شام پانچ بجے سونے کا کون سا وقت ہے۔"

"تو پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں، یہ سونے کا وقت تو نہیں ہے۔"

"جی نہیں سونے کا نہیں آپ سے بات کرنے کا وقت ہے۔ اب سے اسٹارٹ کریں گے تو رات دس بجے تک ختم کر سکیں گے، نہیں تو پھر کل رات کی طرح چار بجے جان چھوڑیں گے آپ جناب تو پھر میری نیند پوری نہیں ہوتی۔ ابھی بھی رات دیر تک جاگنے سے سر میں درد ہے۔"

"اوہ تو پہلے کیوں نہیں بتایا، میں دبا دوں؟ کوئی ٹیبلٹ لو، ایسا کرو پہلے پھپھو کو بولو تمہیں کافی بنا کر دے دیں۔" وہ حسب معمول شروع ہو چکا تھا اور مشو مزے لے کر سن رہی تھی۔ اٹھلا رہی تھی، ناز دکھا رہی تھی۔

گزشتہ ڈیڑھ سال سے ان کا یہی معمول تھا، ہر وقت کال، ہر وقت ٹیکسٹ اور واٹس ایپ، محبت کا اظہار۔ تعریف و توصیف سے نکل کر اب تو باتیں بے باکی کے رنگوں میں ڈھل گئی تھیں۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی تھی کب باتوں نے رنگ بدلا، کب بے باکی غالب آئی ماضی، حال، مستقبل وہ کب کا کھنگال چکے تھے۔ شادی میں رہتے بائیس دنوں میں وہ باتوں کے ذریعے سے ایک دوجے کو تسخیر کر رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

مہوش سلیم، مہوش عاصم بن گئی۔ چاہتوں کا سورج

سوا نیزے پر تھا لیکن آخر کب تک....؟ آخر کو ڈھلنا تھا' سو ڈھل گیا۔ دعوتیں بھی اختتام پذیر ہوئیں۔ تو مہوش بی بی جو کبھی مشی جانو اور کبھی مشو جان ہوا کرتی تھی۔ مہوش بن گئی۔

اس مہوش کا سلیقے سے تو دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ نہ کھانا بنانا آتا نہ صفائی ستھرائی ڈھنگ سے کر پاتی۔ کاظم' ناظم کی بیویاں اس کے کیے کام کو نئے سرے سے کرتیں تو وہ شرم سے زمین میں گڑ جاتی۔ آج بھی کچھ خاص معاملہ لگ رہا تھا۔ عاصم جب سے آیا تھا ماں نے کمرے میں بلا لیا تھا' بند کمرہ مشی کو جلے پیر کی بلی بنائے ہوئے تھا۔ وہ چڑھی ہوئی تیوری لیے باہر نکلا تھا۔

"صبح برتن کس نے دھوئے تھے؟"

"عاصم! میں نے ہی واش کیے تھے۔"

"دودھ کس نے پھینکا تھا؟"

"میں نے۔ اصل میں عاصم دودھ پھٹ گیا تھا۔ بھابھی نے شاید دیکھا نہیں تھا اس لیے میں نے پھینک کر برتن صاف کر دیے تھے تاکہ دوسرا دودھ بوائل کر سکوں۔"

"جاہل عورت! دودھ پھٹا نہیں تھا پھاڑا گیا تھا پنیر بنانے کے لیے' خود تمہیں کوئی کام آتا نہیں' دوسرے سے پوچھنے میں بڑی شرم آتی ہے۔" وہ چلا رہا تھا۔ وہ سن کھڑی تھی۔

"زبیدہ خود تو سوئی سے لے کر جہاز تک گھر میں بناتی ہے بیٹی کو ایک گن بھی نہ سکھا سکی۔" ماں بھلا چپ کیوں رہتیں۔

"اب سر پر کیا کھڑی ہو آفس کے لیے کپڑے پریس کر کے رکھ دو اور ہاں صبح جیسے نہ کرنا ڈھنگ سے کرنا' گڑیا کی طرح۔" اس کے آنسو دل پر گرے تھے' کچھ بھولے بسرے منظر ہر وقت آنکھوں میں کھٹکا کرتے تھے۔

"مہوش! اٹھو بیٹا اپنی اور سنی کی یونیفارم پریس کر لو۔"

"میں' اور سنی کی یونیفارم وہ بے یقین ہوئی۔"

"تو اور کیا؟ بھائیوں کے کرو گی تو کل اگلے گھر شوہر کے کرنے آئیں گے ویسے بھی تم بڑی بہن ہو۔"

"امی! بڑی بہن ہوں نوکر نہیں۔ اٹھاؤ سنی اپنا یونیفارم اور سنو یہ میرے بھی کر دو۔ میں نہانے جا رہی ہوں۔" سنی اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

جب یہی بات رات کو فون پر اس نے عاصم کو بتائی تھی تو وہ بولا تھا۔ "اور کیا اب تمہارے ہاتھ کپڑے تھوڑی پریس کرنے کے لیے بنے ہیں یہ تو بس میرے ہاتھ تھامنے کے لیے بنے ہیں۔"

وہ اٹھلا اٹھلا کر سنتی رہتی۔ وقت کیسا ظالم نکلا تھا' کتنی جلدی گزر گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"کیا چپ پڑے رہتے ہو عاصم کوئی بات کرو نا۔" وہ بیڈ پر کھسک کر اس کے نزدیک ہوئی۔

"پیچھے ہٹو یار....." عاصم نے دھکیل کر پیچھے کیا اور کروٹ بدلی۔

"آپ مجھے پریشان لگتے ہیں۔ آفس میں کوئی مسئلہ چل رہا ہے؟"

"ہاں! آفس والوں نے چھٹی کردی میری۔" عاصم نے بم پھوڑا۔

"کیا مطلب 'کیوں؟" اسے دھچکا لگا تھا۔

"ایم۔ ڈی کا کہنا ہے پچھلے کافی عرصے سے میری کارکردگی تسلی بخش نہیں تھی۔ اکاؤنٹس میں غلطیاں اور موبائل فون کا ہروقت استعمال آفس کے لیے ہرگز موزوں نہیں' سوانہوں نے کہا میں گھر بیٹھ کر تسلی سے فون استعمال کروں۔"

وہ جہاں کی تہاں رہ گئی جب کہ عاصم نے آنکھیں موند لیں۔ اسے یاد آیا ابھی چھ ماہ پہلے کی تو بات تھی جب اس نے کہا تھا۔

"عاصم آپ کا باس منع نہیں کرتا فون سے۔"

"میں اپنا باس خود ہوں جانِ عاصم! باس کی کیا جرأت۔" لیکن پھر بھی وہ مزے سے سموسے کھانے اصرار کررہی تھی۔

"یار میں ہینڈ فری سے تم سے بات کرتا ہوں اور ہاتھوں سے اپنا کام۔"

"لو بھلا! آفس ورک ہاتھ سے تھوڑی ہوتا ہے' دماغ سے ہوتا ہے۔" اس نے جرح جاری رکھی۔

"میری جان! میں دماغ سے آفس ورک کرتا ہوں اور دل سے تم سے بات' آئی کچھ سمجھ میں' ویسے بھی میں کوئی تم تھوڑی ہوں جو ایک وقت میں ایک کام بھی نہ کرپاؤں۔"

آج وہ سن رہی تھی جاب نہیں رہی۔ شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی بے روزگار ہوجانا کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زندگی کو ہو کیا گیا ہے' وہ جو ہروقت بات کیا کرتے تھے اب جب بھی بات کرتے تو الجھتے ہی تھے۔ مہوش کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اسے گھر سنبھالنا نہیں آرہا تھا جبکہ دوسری طرف عاصم کو جاب نہیں مل رہی تھی۔ حالات سے گھبرا کر وہ امی کے ہاں چلی آئی تھی عاصم نے بھی اصرار نہ کیا'

چنانچہ وہ مہینے بھر کے کپڑوں سے بھرا سوٹ کیس لیے گھر میں داخل ہوئی تو امی گھبرا اٹھیں۔

"میری پیاری امی! کوئی مسئلہ نہیں۔ بس مہینے بھر کے لیے آئی ہوں۔" تب ان کی تسلی ہوئی تھی۔

سب اسکول کالج گئے تھے گھر کی خاموشی سے گھبرا کر وہ تایا ابا کی طرف نکل آئی۔ ایک وقت تھا وہ اس گھر کی طرف رخ بھی نہیں کرتی تھی اور اب "ہائے رے وقت۔" اس نے لمبی سانس کھینچی اور اندر داخل ہوگئی۔

"ارے مشی بیٹا! کیسی سادی سادی پھر رہی ہو۔ نہ زیور' نہ میک اپ نہ مہندی' کہیں سے نہیں لگ رہا شادی کو دو ماہ ہوئے ہیں۔ بیٹا بن سنور کے رہا کرو۔ یہی تو دن ہیں۔" تائی کی اپنی نصیحتیں تھیں۔ وہ پھیکی ہنسی ہنس دی۔

"مائرہ بھابھی اور حمنٰی کیسی ہے۔ ارباز بھائی تو آفس میں ہوں گے۔" اس نے بات پلٹ دی۔

"جناب! میں بھی ٹھیک ہوں' حمنٰی کو سلا کر آرہی ہوں۔ ارباز آفس میں ہیں۔" خلاف توقع آج تو مائرہ بھابھی بھی نکھری نکھری لگ رہی تھیں۔ بال بھی بنے ہوئے تھے۔ جو اس نے کم ہی بنے دیکھے تھے۔ کبھی کام بہانہ' کبھی بچی کے رونے کا بہانہ۔

مشی کو تو بہانے ہی لگا کرتے تھے' وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر سب شادی شدہ خواتین کو رگیدڈالتی تھی۔

"ایسا بھی کیا کام' بندہ اپنے آپ کو بھول جائے اور شوہر صورت سے ڈر کر پاس آنا ہی بھول جائے۔ اب مائرہ بھابھی کو ہی لے لو گھر' سنوارنے میں ہی پاگل ہوتی رہتی ہیں۔ شوہر بھلے پاس نہ آئے' ہونہہ' سلیقہ شعاری۔ ارباز بھائی کو کبھی ڈھنگ سے ان سے بات کرتے دیکھا ہے کسی نے؟ مجھے دیکھنا تم لوگ شادی کے بعد' میں اور عاصم تو اب ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے شادی کے بعد تو پتا نہیں کیا ہوگا۔"

"کہاں گم ہوگئی ہو؟" مائرہ بھابھی کے ہاتھ ہلانے پر وہ ماضی سے حال میں پلٹی۔

"کچھ نہیں بھابھی۔"

"آؤ کچن میں چلتے ہیں۔ میں کھانا بھی بنالوں گی، تم سے باتیں بھی کرتی رہوں گی۔" وہ چپ چاپ ساتھ ہولی۔

"مشی کوئی مسئلہ ہے کیا؟ بہت الجھی الجھی ہو۔"

"نہیں بھابھی، مسئلہ کیا ہونا ہے۔ آپ بتائیں یہ کس وقت کا کھانا بنارہی ہیں۔"

"رات کے لیے اصل میں آج ویک اینڈ ہے نہ تو ارباز کے آنے تک میں سارا کام ختم کرلیتی ہوں پھر بس سارا وقت ہمارا۔" وہ شریر ہوئیں۔

ہماری عادت بنی ہوئی ہے ویک اینڈ پر پورے ہفتے کی باتیں، اپنی باتیں، ماضی، حال، مستقبل کی باتیں کرتے کرتے بہت لیٹ سوتے ہیں۔ ان کی شرمیلی سی ہنسی دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔" سارا ہفتہ تو روٹین وائز ہی گزرتا ہے۔"

"بھابھی! شادی کے پانچ سال بعد بھی باتیں ختم نہیں ہوئیں۔" مشی نے استفسار کیا۔

"یہ تو ساری زندگی ختم نہیں ہوں گی۔ تم بتاؤ، تمہارے دولہا نے ایک ماہ تک میکے رہنے کی اجازت کیسے دے دی؟"

"پاس رہیں یا دور ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھابھی شادی کون سا ضروری ہے ساتھ رہنے سے تو ایک دوسرے کی اہمیت ہی کم ہوجاتی ہے۔ بس گم صم بیٹھے رہو۔ ہر بات تو پہلے سے معلوم ہوتی ہے۔"

مائرہ کے ہاتھ اس کی الجھی زندگی کا سرا آگیا تھا سو وہ کچن ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ "مشی ایک بات پوچھوں اگر برا نہ مانو۔"

"سچ سچ بتاؤ۔ کیا چل رہا ہے۔ تمہارے اور عاصم کے بیچ، لگتا ہی نہیں نئی نئی شادی ہوئی ہے۔"

تھک ہار کر مہوش بھی شروع ہوگئی۔ "پتا نہیں بھابھی، ہم ایک دوسرے کے ساتھ پہلے کی طرح خوش نہیں ہیں۔ جب بھی وہ کوئی بات کرتے ہیں مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہوتی، جب میں کوئی بات کرتی ہوں وہ ٹوک دیتے ہیں کہ معلوم ہے مجھے۔ فون پر ساری باتیں کر کر کے لگتا ہے باتیں ہی ختم ہوگئی ہیں۔"

جب کام سیکھنے کے دن تھے تب رات دن عاصم کی کالز بند نہ ہوتی تھیں۔ اب مجھے گھر کا کوئی بھی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا تو سب لوگ ناراض ہوتے ہیں۔ میں نے عاصم کو وجہ بتائی تو وہ کہتے ہیں میں کال کرتا تھا تو تم منع بھی کرسکتی تھیں دوسری طرف ان کی جاب بھی ختم ہوگئی ہے ہر وقت فون یوز کرنے پر غلطیاں ہوجاتی تھیں۔ اب آفس والوں نے آخر کار نکال دیا۔" وہ آخر تک آتے آتے رو پڑی تو مائرہ نے بھی رونے دیا۔

"مہوش تم نے کبھی غور کیا کائنات کا سارا دارومدار وقت اور حدود و قیود پر قائم کیا ہے۔ جب کوئی بھی شے اپنی حد سے نکلے گی تو بربادی ہی لائے گی۔

اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا جب تک تم لوگ نامحرم رشتے میں تھے تو اپنے لفظوں سے لذت کشید کرتے رہے۔ یہ گناہ ہے اسی گناہ نے تمہاری نئی زندگی کا حسن چھین لیا ہے۔ کیا تھا اگر تب کی باتیں تب کے فیصلے اب کے لیے اٹھا رکھتے۔ خیر توبہ کرو اور شکر کرو تمہارے پاس توبہ کی مہلت ہے۔

مہوش رہی گھر کے کاموں کی بات تو صاف نیت سے ایک ہفتے میں سیکھے جاسکتے ہیں۔ بس ارادہ ہونا چاہیے۔"

اور مہوش کو لگا تھا مائرہ بھابھی کا لفظ لفظ سچ ہے۔ رب کی طرف پلٹ کر وہ خوشیوں کی طرف پلٹ سکتی ہے۔ اس نے رب کے معتدل بندوں میں شامل ہونے سے پہلے اپنے شوہر کو کال کرنا تھی تاکہ وہ دونوں ایک شاہراہ پر ہم قدم ہوں دونوں جہانوں میں۔

*

تم آ گئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں

خلوص و مہر و وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
میرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں

جُدا ہوئے بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشینوں کا کچھ انتظام کریں

رہِ طلب میں جو گمنام مر گئے ناصر
متاعِ درد ان ہی ساتھیوں کے نام کریں

ناصر کاظمی

کسی دن تجھ سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
چلو کچھ سال پہلے کا زمانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

اندھیرا کتنا ہی گہرا ہو، راتیں کتنی ہی کالی ہوں
پرندے اپنا اپنا آشیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

گلے ہم سے بھی آ لگتا ہے کوئی درد کا مارا
کسی دل سوختہ کا ہم بھی شانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

خدا محفوظ رکھے، ان کی زد پہ ہم نہ آ جائیں
شکاری اپنے مطلب کا نشانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

انا کی جنگ میں آخر بھرم قائم بھی رکھنا ہے
تو یوں کرتے ہیں، رستہ درمیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

اعتبار ساجد

سچ سے کچھ ماورا نہیں ہوتا
کوئی بندہ خدا نہیں ہوتا

کیسے آئے یقین بہاروں کا
زخم جب تک ہرا نہیں ہوتا

خود بناتا ہے آدمی قسمت
ہاتھ پر کچھ لکھا نہیں ہوتا

تُو جو چاہے کرے تیری مرضی
مجھ سے ترکِ وفا نہیں ہوتا

زندگی نام ہے امیدوں کا
موت کا کچھ پتا نہیں ہوتا

عشق کی منزلوں کا اے عابدؔ
کوئی اک راستہ نہیں ہوتا

عابد معروف

میں نے خواب بہت دیکھے تھے تم کو بھی دکھلائے تھے
یاد ہے اک تعبیر میں تم تو میرے گھر بھی آئے تھے

حیرت کی تمثیل میں جا کر لفظ کے معنی گم ہو گئے
ورنہ میرے استادوں نے کیا کیا حرف سکھائے تھے

پھر تو ایسے صبر کیا جیسے یہ سب کچھ ہونا تھا
لیکن پہلے اک دو دن تو ہم بھی بہت گھبرائے تھے

میں بھی اپنے چہرے کو کھڑکی پر رکھ کر بھول گیا
چاند نے بھی اپنے افسانے رات بہت دُہرائے تھے

ویسے بھی کردار فریدیؔ صاحب کا کیا اچھا تھا
بس سجدوں کا داغ تھا جس سے پیشانی چمکائے تھے

اقبال فریدی

یہ عالم شوق کا.....!

ایک شخص نے اپنے شناسا سے پوچھا۔ "آپ نے یہ کار کس طرح انعام میں جیتی۔"

"میں ایک کمپنی کی انعامی اسکیم کے دلیے کے ڈبے خریدتا رہا' یہ سلسلہ تقریباً" 6 ماہ تک چلتا رہا۔ بالآخر ایک ڈبے میں کار کے انعام کا کارڈ نکل ہی آیا۔" شناسا نے جواب دیا۔

"بہت خوب! کار تو بے حد شاندار ہے مگر آپ نے اس میں بستر کیوں لگا رکھا ہے۔" اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

"گھر میں سونے کے لیے جگہ ہی کہاں بچی ہے' وہاں تو فرش سے چھت تک ڈبے ہی ڈبے بھرے ہوئے ہیں۔" شناسا نے معصومیت سے جواب دیا۔

تشخیص

ماہر نفسیات نے مریض سے پوچھا۔ "کیا آپ بھی ایسی آوازیں بھی سنتے ہیں جن کے بارے میں آپ کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کس کی ہیں اور کہاں سے آرہی ہیں؟"

مریض نے جواب دیا۔ "جی ہاں' ڈاکٹر صاحب۔"

"ایسا کب ہوتا ہے؟" ماہر نفسیات نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے' مریض کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جب میرے موبائل فون کی گھنٹی بجتی ہے اور میں کال اٹینڈ کرکے موبائل کان سے لگاتا ہوں۔" مریض نے جواب دیا۔

دکان کھولی تھی

"تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے؟"

"اس نے دکان کھولی تھی۔"

"کیسی چل رہی ہے؟"

"معلوم نہیں؟"

"کیوں... کیا بھائی سے ملاقات نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے... وہ پانچ ماہ کے لیے جیل میں ہے۔"

"ارے... وہ کیوں؟"

"اس نے ہتھوڑے سے دکان کھولی تھی۔"

وارفتگی

غزل کی ایک محفل میں ایک شخص کو حال آگیا اور وہ بے ساختہ جھومنے لگا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔

محفل میں موجود ایک شخص نے اس سے پوچھا۔

"یہ تمہیں کیا ہوگیا تھا؟"

جھومنے والا شخص پرسکون ہوتا ہوا بولا۔ "کچھ نہیں یار! ایسے ہی بیٹھے بیٹھے میرے "پیر سُن" ہوگئے تھے۔"

سوا سیر

مائیکل نے جارج سے کہا۔ "میری گھریلو زندگی سخت یکسانیت اور جمود کا شکار ہو چکی ہے' اس میں اب کوئی دلچسپی اور کشش باقی نہیں رہی۔"

جارج نے مشورہ دیا۔ "اس کا حل یہ ہے کہ تم چند دن کے لیے کسی سے عشق لڑاؤ' معاشقوں کے بعد میاں بیوی میں محبت بڑھ جاتی ہے۔"

"لیکن اگر میری بیوی کو معلوم ہوگیا تو؟" مائیکل نے خدشہ ظاہر کیا۔

جارج نے فوراً" کہا۔ "اب زمانہ بدل گیا ہے' تم اپنے پلان سے اپنی بیوی کو آگاہ کردو۔"

مائیکل نے اسی شام گھر جا کر بیوی سے اعلانیہ انداز میں کہا۔ ”ہماری ازدواجی زندگی یکسانیت اور بے رنگی کا شکار ہے' میں اس میں بہتری لانے کے لیے عشق لڑانے جا رہا ہوں۔“

”کس احمق نے تمہیں یہ مشورہ دیا ہے۔۔۔ میں یہ نسخہ پہلے ہی آزما کر پشیمان ہو چکی ہوں' کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ بیوی نے ندامت سے جواب دیا۔

اندازہ

ایک مصور اپنے پڑوسی کے کمسن بیٹے کی تصویر بنا رہا تھا۔ شام کو اس نے تصویر دکھانے کے لیے ایک اور پڑوسی کو بلایا۔ پڑوسی تصویر دیکھ کر بولا۔ ”ارے بھئی' یہ تو اپنا شرارتی بچہ گڈو لگ رہا ہے۔“

مصور کو اپنے فن پر فخر محسوس ہوا اور وہ پڑوسی کی جانب سے چند تعریفی جملوں کا انتظار کرنے لگا۔ پڑوسی نے کچھ دیر تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔ ”مجھے داد دو۔۔۔ میں نے کتنا درست اندازہ لگایا ہے۔“

باعث اطمینان

میڈیکل یونیورسٹی کے پروفیسر نے میڈیکل کے ایک نوجوان طالب علم کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسی کیا خاص بات ہے کہ تم نے زچگی کے باب کو بڑے غور و خوض اور دلچسپی سے پڑھا ہے اور دوسرے مضامین کے مقابلے میں اس باب میں تمہارے' بہت اچھے نمبر آئے ہیں۔“

نوجوان طالب علم نے اس دلچسپ سوال کا جواب انتہائی سنجیدگی سے دیتے ہوئے بتایا۔

”جب میں دل کی بیماریوں کے بارے میں پڑھ رہا تھا تو مجھے ایسا لگا کہ شاید میں بھی اس مرض میں مبتلا ہوں' جب میں دمے کے بارے میں نوٹس بنا رہا تھا تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ مجھ میں بھی تھوڑی' بہت اس کی علامات ہیں۔ السر کے بارے میں پڑھتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے بھی یہ شکایت ہے۔ زچگی واحد مضمون تھا جسے میں نے بڑے سکون اور بے فکری سے پڑھا اور اطمینان سے ٹیسٹ دیا۔“

موقعۂ واردات

لندن کی ایک عدالت میں طلاق کا مقدمہ چل رہا تھا۔ دونوں فریقوں کے وکلا کے دلائل سننے کے بعد جج نے عینی شاہد سے پوچھا۔ ”جب میاں بیوی میں جھگڑا ہو رہا تھا تو تم اس وقت کہاں تھے؟“

گواہ نے ذمہ دارانہ انداز میں جج صاحب کو بتایا۔

”جناب عالی میں عین موقعۂ واردات پر موجود تھا' دراصل میں پادری ہوں اور ان کی شادی کی رسومات میں نے ہی انجام دی تھیں۔“

عمر

آپریشن کے لیے بے ہوشی کا ٹیکہ لگانے سے پہلے ڈاکٹر نے مریضہ سے پوچھا۔

”آپ کی عمر؟“

مریضہ نے کہا۔ ”28 سال۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”محترمہ آپ کو یقین ہے نا کہ آپ کی یہی عمر ہے کیونکہ میں آپ کی عمر کے حساب سے آپ کی بے ہوشی کی دوا مقرر کروں گا۔“

مریضہ نے کہا۔ ”30 سال۔“

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ”آپ دیکھ لیجیے' دوا کی کم یا زیادہ مقدار سے مریض یا تو آپریشن کے دوران ہی ہوش میں آجاتا ہے یا پھر کومے میں چلا جاتا ہے۔“

مریضہ ”38 سال۔“

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ”اگر آپ عمر غلط بتائیں گی تو دوا کی کم و بیش مقدار کا سیدھا سیدھا اثر گردوں پر پڑتا ہے اور وہ فیل بھی ہو سکتے ہیں۔“

مریضہ نے چیختے ہوئے کہا۔ ”49 سال اور اب بھلے آپریشن تھیٹر سے میری لاش ہی کیوں نہ نکلے' میں اس سے زیادہ عمر بالکل نہیں بڑھاؤں گی۔“

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں پھر توبہ کرو تو (پھر بھی اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل:

یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ سے جلد از جلد توبہ کرے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جا سکے تو جب بھی احساس ہو، توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ تنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں، وہ معاف نہیں ہوں گے، البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

شہزادی بتول کی روایت،

یہ روایت اشارہ کرتی ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کے بوڑھے آدمی نے اسلام قبول کیا جو انتہائی مسکین تھے۔ ان کی خوراک کے بندوبست کا مسئلہ درپیش ہوا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے سیدہ فاطمہ کے دروازے پر دستک دی کہ مسکین کی خوراک کا بندوبست کر دیجیے۔

سیدہ کے دروازے پر سوالی آئے اور خالی چلا جائے۔ یہ تو ان کے باپ کی سنت نہ تھی۔ آبدیدہ ہو گئیں۔ فرمایا۔

"اے سلمان! اللہ کی قسم آج گھر میں فاقے کا تیسرا دن ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی نہ جانے دوں گی۔ جاؤ میری یہ چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو فاطمہ بنت محمدؐ کی یہ چادر اپنے پاس رکھ لو اور اس کے عوض مسکین کو کچھ غلہ دے دو۔"

سلمان فارسیؓ نے یہودی کو چادر تھماتے ہوئے سارا ماجرا بیان کیا۔ سب کچھ سن کر شمعون کے دل کو ایسا جھٹکا لگا کہ دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ بے اختیار بولا۔

"اے سلمان! خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے۔ تم گواہ رہنا میں فاطمہؓ کے باپ پر ایمان لایا۔"

اس کے بعد غلہ حضرت سلمانؓ کے حوالے کر کے ان کی چادر بھی انہیں واپس لوٹا دی کہ جگر گوشۂ رسول کی اس چادر کی تقدیس اس پر عیاں ہو چکی تھی۔

حضرت سلمانؓ نے واپس آکر چادر اور غلہ دونوں سیدہ کے حوالے کیے۔ انہوں نے عجلت میں وصول کیا۔ فوراً غلہ پیسا، روٹیاں جلدی سے حضرت سلمانؓ کے حوالے کیں کہ نو مسلم اعرابی جو بھوک سے نڈھال ہے، اس کے حوالے کر دیں۔

حضرت سلمانؓ کو علم ہو چکا تھا کہ ان کے تو اپنے گھر میں فاقہ ہے اس لیے عرض کیا۔

"میرے آقا کی لخت جگر! کچھ بچوں کے لیے بھی رکھ لیجیے۔"

سیدہ فاطمہؓ فرماتی ہیں "سلمان! جو چیز میں راہ خدا میں دے چکی ہوں وہ میرے بچوں کے لیے جائز نہیں ہے۔"

حضرت سلمانؓ نے روٹیاں لے جا کر آپؐ کی خدمت اقدس میں پیش کر دیں۔ آپؐ کو اعرابی کو دیں اور سیدہ فاطمہ کے گھر تشریف لائے۔ ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ آسمان کی طرف دیکھا اور رب سے التجا کی۔

"باری تعالیٰ! فاطمہ تیری کنیز ہے، اس سے راضی رہنا۔"

اللہ تعالیٰ سیدہ فاطمہؓ سے ایسا راضی ہوا کہ انہوں نے دنیا کو "بتول" کے لقب کی عملی تفسیر بن کر دکھایا۔

وہ ہر حال میں راضی رہیں اور اللہ رب کریم نے انہیں اپنی رضا کے راستوں پر چلنے کا شرف عطا فرمایا۔

امیر کا حکم ماننا

حضرت علیؓ نے ایک علاقہ کے والی کو کسی کام کا حکم دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے پوچھا۔

"میں نے تمہیں جس کام کا حکم دیا تھا، کیا تم نے وہ کام کر لیا ہے؟"

وہ خاموش رہا تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔

"اللہ کی قسم! تمہیں حاکم کی طرف سے جو حکم دیا جائے، اسے ضرور پورا کرو، نہیں تو تمہاری گردنوں پر یہود و نصاریٰ سوار ہو جائیں گے۔"

(حیاۃ الصحابہ)

کھانا کھلانا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

"میں اپنے کچھ ساتھیوں کو ایک صاع کھانے پر جمع کروں، یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں بازار جاؤں اور ایک غلام خرید کر آزاد کر دوں۔"

(حالانکہ ایک غلام کی قیمت ایک صاع کھانے سے بہت زیادہ ہے)

نگہبان

حضرت معاذؓ جب اپنے منصب (امارت) سے فارغ ہو کر واپس آئے تو ان کی بیوی نے فرمایا۔

"تم اتنے عرصے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عامل رہے۔ میرے واسطے کیا تحفہ لائے؟"

انہوں نے کہا۔ "ایک نگہبان میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے میں کچھ نہ لا سکا۔"

انہوں نے اس وقت نگہبان سے مراد ذات خداوندی لی تھی اور ان کی بیوی یہ سمجھی کہ حضرت عمرؓ نے ان پر کسی ناظر کو مقرر کر دیا تھا۔ حضرت معاذؓ کی بیوی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی اور کہا۔

"حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے امانت دار تھے۔ لیکن آپ نے ان پر مشرف و ناظر کو بھیجا" (ان کی امانت پر شبہ کیا)

حضرت عمرؓ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا بھیجا۔ قصہ دریافت کیا۔

جب انہوں نے تمام واقعہ بیان کیا تو آپؓ ہنسنے لگے اور آپ کو بطور انعام کچھ دیا کہ اپنی بیوی کو جا کر دے دیں۔

مصیبتیں

جناب یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ تونگر کے لیے مرتے وقت دو مصیبتیں ہیں۔ (دوسرے لوگ ان سے آزاد ہیں)

ایک مصیبت تو یہ کہ سارا مال اس سے چھین لیا جائے۔

دوسری مصیبت یہ کہ قیامت کے دن اس مال کی پرسش اس سے کی جائے گی۔

بددعا

نقل ہے کہ کسی شخص نے حضرت ابوالدرداؓ کو تکلیف پہنچائی۔ آپ نے کہا۔

"اللہ اس شخص کو تندرستی عمر دراز اور مال کثیر عطا فرمائے۔"

اس طرح حضرت ابوالدردا نے اس شخص کو بددعا دی کیونکہ جب یہ چیزیں کسی کو ملتی ہیں تو اس کو تکبر، غفلت، آخرت سے غافل بنا دیتی ہیں اور وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔" (اس کے لیے ہلاکت اور تباہی ہے۔)

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

حضرت عمرؓ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، میں نے ایک مرتبہ زمانہ خلافت میں حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان اوپر نیچے تین پیوند لگا رکھے تھے۔

دوسروں کو دینا

حضرت طلحہؓ کی بیوی حضرت سعدیٰ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

"ایک دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ایک لاکھ درہم صدقہ کیے پھر اس دن ان کو مسجد میں جانے سے صرف اس وجہ سے دیر ہوگئی کہ میں نے ان کے کپڑے کے دونوں کناروں کو ملا کر سیا۔

(لاکھ درہم دوسروں کو دے دیے۔ اپنے اوپر کچھ نہ لگایا)

موتیوں جیسے لفظ

- کچھ لوگ جب روتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مضبوط رہتے رہتے تھک جاتے ہیں۔
- جن کے پاس دینے کے لیے محبت کے سوا کچھ نہ ہو ان کو جینے کے لیے درد کے سوا کچھ نہیں ملتا۔
- جو سہہ رہا ہوتا ہے وہی جانتا ہے کہ وہ کس قدر اذیت میں ہے۔ باقی صرف قیاس آرائیاں ہی کر سکتے ہیں۔
- کسی کو معاف کر کے اچھے ضرور بنو مگر اس پر اعتبار کر کے بے وقوف مت بنو۔
- یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ اللہ کے فیصلے تمہاری خواہشات سے بہتر ہوتے ہیں۔
- زندگی آخر کار رُلا ہی دیتی ہے۔ چاہے ہم ماں باپ کے کتنے ہی لاڈلے کیوں نہ ہوں۔

ناہید اصغر آرائیں۔ للہ موسیٰ

بہت بڑا نصیب

ایک انسان کے با اعتماد ہونے کے لیے یہی حقیقت کافی ہے کہ اس سے پہلے نہ تو کوئی اس جیسا دنیا میں آیا نہ اس کے بعد اس جیسا آئے گا۔ یہ عظیم انفرادیت بہت بڑا نصیب ہے۔

(واصف علی واصف)

طٰہٰ مصطفیٰ۔ فاروق آباد

دل آزاری

ہر وہ کامیابی انسان کی ہار ہے جس کا مقصد کسی کو نیچا دکھانا ہو۔ دنیا میں ہر چیز کی تلافی ہے سوائے دل آزاری کے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

پسندیدہ چیز

پسندیدہ چیز سے جدائی موت ہے۔ جن کی پسندیدہ چیزیں موت سے پرے ہیں ان کے لیے مرنا آسان ہے۔ جن کی پسندیدہ چیزیں یہاں رہ جائیں گی ان کے لیے موت مشکل ہے۔

(واصف علی واصف

نوال افضل گھمن۔ کراچی

تین عقلمند اور قیافہ شناس

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا "دنیا میں تین انسان بڑے عقل مند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے۔

1۔ عزیز مصر جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے کمالات کو اپنے قیافہ سے معلوم کر کے بیوی کو یہ ہدایت دی کہ وہ یوسف علیہ السلام کی بود و باش کا اچھا انتظام کرے۔

2۔ شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا۔

ترجمہ: یعنی ابا جان ان کو ملازم رکھ لیجیے۔ اس لیے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔

3۔ تیسرے صدیق اکبرؓ ہیں جنہوں نے اپنے بعد فاروق اعظمؓ کو خلافت کے لیے منتخب فرمایا۔

(حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

شازیہ ہاشم۔ قصور

خالدہ جیلانی

مہناز راقی ـــــــ نامعلوم شہر

وہ جذبوں کی تجارت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
اسے ہنسنے کی عادت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
ہمیں اُس کی آنکھوں میں دھنک رنگ نظر آ رہے تھے
یہ اُس کی عام حالت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

خردِ فاطمہ ـــــــ کبیر والا

صرف اک انا کو سُلا کر
ہر رشتہ بچا لیا میں نے

ارم کمال ـــــــ فیصل آباد

درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
تو اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں
ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روز روز صحیفے نہیں اُترتے ہیں

نور آمنہ درانی ـــــــ نامعلوم شہر

دل بہلتا ہی نہیں کسی پل کسی ساعت
رات ڈھلتی ہی نہیں چار پہر سے پہلے
ہم کسی در پہ نہ ٹھٹکے نہ کہیں دستک دی
سیکڑوں در تھے میری جان تیرے در سے پہلے

سیدہ لوبا سجاد ـــــــ کہروڑ پکا

ذرا بھی نہیں پگھلتا دل تمہارا
کہاں سے خریدا ہے اتنا قیمتی پتھر

تسنیم کوثر ـــــــ کراچی

درد کا میرے یقین آپ کریں یا نہ کریں
عرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

ایمان جلبانی ـــــــ گاؤں حدریاخان

اک بار میں نے اپنے قبیلے کا بتایا
پھر عشق نے پوچھی نہیں تفصیل مکمل
اک جنگ میں تلوار اُترتی ہے فلک سے
اس جنگ کو کرتی ہے ابابیل مکمل

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ـــــــ کراچی

تیری رسوائیوں کے ڈر سے ہم خاموش ہیں ورنہ
لکھنے پہ جائیں تو قلم سے سر قلم کر دیں!

نادرہ نوید شاہ ـــــــ لطیف آباد

اُڑنے تو دے نہ کی حدِ آشیاں بندی
اب اُڑ چکے تو بال و پر کی سوچتے ہو

یاسمین کنول ـــــــ پسرور

اس کو دل سے سلام کرتے ہیں
وہ جو گر کر سنبھلنے آیا ہے!
وقت کے ساتھ دوریوں کا ہجوم
ملنے آیا ہے، چلنے آیا ہے

جمیلہ ظفر ـــــــ جڑانوالہ

تمام عمر جُدا نہیں ہوتے
درد بھی با اصول ہوتے ہیں

سعدیہ سلیم ـــــــ کراچی

پھر اس کی یادیں پھر اس کی باتیں پھر اس کے خط
اسے دل لگتا ہے جیسے سکون راس نہیں ہے

فائزہ بھٹی ـــــــ پتوکی

خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایہ

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

کمال کرتے ہو اے دل تم بھی
اُسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

فائزہ بھٹی ـــــــ پتوکی

یہ کیا ہوا کہ پھر سے آسمان کے آنگن میں
بچھڑ گیا وہ ستارہ جو ہمارے نام کا تھا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔ 37 ۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔ رب کریم آپ پر ہم سب پر اپنا فضل، رحمت، برکت نازل فرمائے۔ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف

پہلا خط پشاور سے بلقیس عبدالحمید خان کا ہے، لکھتی ہیں۔

"برہا بھاگ کی مینا" کلاسک سا نام لگا، کہانی شروع کر دی۔ پہلے سین سے یقین کامل ہو گیا۔ کہ بائیو گرافی ہے، سمیرا احمید صاحبہ آپ تو جادوگر ہیں، آپ الگ ہیں سب سے۔ آپ کا قلم الگ ہے، آپ تو حد کرتی ہیں۔ آپ کے الفاظ تاثیر بن کے ذہن پر اثر کرتے ہیں۔ آپ کی کہانی کا ایک ایک سین، ایک ایک ڈائیلاگ، ایک ایک لفظ، اپنے اندر، حقیقت کا سمندر لیے ہوئے تھا، آپ کی کہانی پر اگر کوئی بالی ووڈ ڈائریکٹر فلم بنائے گا تو وہ پہلی فلم ہو گی جو میں دیکھوں گی۔ میرے خیال میں یہ کہانی آنے والے وقت میں کلاسک کا درجہ حاصل کر پائے گی، ان شاء اللہ شہرزاد، ماڈرن سوچ فکر کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتی کہانی ہے۔ نبیلہ! "بابا جان کی گل نین کی طرح کوئی کہانی لکھیں"۔ شہر خطا نایاب جیلانی ویلڈن، کہانی زبردست تھی آخر میں لاسٹ میں کچھ اتفاقات ہضم کرنا سخت مشکل مرحلہ تھا۔ مصباح علی آپ آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔" آپ باکمال ہیں۔ افسانوں میں ون اینڈ اونلی جل پری نے چھکے پر چھکے لگائے۔

ج : پیاری بلقیس! "کھٹا جواب" زیادہ ہی کھٹا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ قارئین کے دانت بھی کھٹے ہو جائیں گے۔ آپ کوئی میٹھی سی کہانی لکھ کر بھجوائیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایمان جلبانی نے گاؤں دریا خان جلبانی سے لکھا ہے

میں تبصرہ نہیں کر سکتی کہ میرے پرچے ابھی آئے نہیں۔ ہاں سمیرا احمید کا نام پڑھ کے دل باغ بہار ہو گیا تھا اور ہاں میں آپ سے اپنے خط شامل نہ کرنے کا شکوہ نہیں کروں گی میرا خط آپ کو لیٹ ملا ہو گا اور دوسری بات میں دل سے کہہ رہی ہوں کے جن قاری بہنوں کے میں نے تبصرے پڑھے مجھے بہت اچھے لگے اور واقعی ان کے یہ خط، تبصرے چھپنے کے مستحق ہیں۔ مجھے یہ دوستانہ دلچسپ محفل بہت پسند آئی، اجازت (جا کے ناشتہ واشتہ کریں)

ج : پیاری ایمان! آئندہ اطمینان سے ناشتہ واشتہ کر کے خط لکھیے گا۔ ہم نے آپ کا خط پڑھ لیا تھا اور آپ کے تحفے کو جس چور نے راستے میں ہڑپ کر لیا ہے، اسے غائبانہ دو چار سنا بھی دی تھیں۔

ثناء مسکان نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

ہمارے گھر میں ہم سب بہن بھائی شعاع، خواتین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ شعاع کی تمام تحریریں زبردست ہوتی ہیں۔ صائمہ جی بہترین ناول لکھ رہی ہیں آپ، شکریہ۔ نایاب جی شروع میں تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ کون ہے اور دیا کون ہے۔ صفحے پلٹ کر دیکھتی تھی لیکن اب کہوں گی کہ بہترین تحریر ہے شہر خطا۔ نبیلہ جی آپ زیادہ لکھیں یا کم لکھیں، ہمیں آپ سے پیار ہے۔ ہائے ہائے خواب شیشے کا تو دل کو کرچی کرچی کر دیتا ہے قسم سے،

پچھلے دنوں مجھے کہیں سے پرانے ڈائجسٹ ملے۔ بہت عمدہ تحریریں' دل کو چھوتے الفاظ' لازوال کردار' دل خوش ہوگیا پڑھ کر۔ مجھے پوچھنا ہے کہ ثمینہ عظمت علی' ماہا ملک' فائزہ افتخار' میمونہ خورشید' بشریٰ سعید' فریدہ اشفاق' نگہت سیما' ساجدہ حبیب' انیسہ سلیم' یسریٰ شمشاد' ثروت نذیر' کاشفہ حسین اور زہرہ ممتاز کہاں ہیں؟ اب کیوں نہیں لکھتیں؟

ج : پیاری مسکان! جن رائٹرز کے نام آپ نے تحریر کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ٹی وی کو پیاری ہوگئی ہیں اور باقی کیوں نہیں لکھتیں۔ آپ کی طرح ہمیں بھی نہیں معلوم اور ہاں آپ کی طرح ہم بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔

عائشہ وحید نے کراچی سے لکھا ہے

سب سے پہلے "شہر خطا" پڑھا 7 قسطوں میں کوئی آدھا صفحہ بھی ایسا نہیں تھا جسے پڑھ کر یہ کہا جاسکے کہ "بور ہو رہے تھے" کافی عرصے بعد ایک مختلف موضوع پڑھنے کو ملا۔ اگر بات کریں "خواب شیشے کا" کی تو اس کے متعلق میری پیش گوئی سچ نکلی کہ طلال مہماہ کا نہیں تزئین کا نصیب بنے گا۔ بے چاری مہماہ بہت غلط ہوا اس کے ساتھ "شہرزاد" کے بارے میں کیا لکھوں۔ عجیب سی کشش ہے اس تحریر میں۔ جانے کیوں مجھے یہ گمان ہو رہا ہے کہ "برہان" ہی "ہمزاد" ہے۔ اگر ایسا ہے تو انابیہ کا کیا ہوگا؟ ناول کے خلاصے میں ایک غلطی ہے کہ "طوبیٰ کا نکاح برہان سے ہوچکا ہے۔" نکاح طوبیٰ کا نہیں انابیہ کا ہوا ہے۔

ج : پیاری عائشہ! صائمہ اکرم نے بھی اس غلطی کی نشان دہی کی ہے' ہمیں خوشی ہے کہ ہماری قارئین کہانی ہی نہیں کہانی کا خلاصہ بھی اتنی توجہ سے پڑھتی ہیں۔ ہم زاد کون ہے اور انابیہ کا کیا ہوگا' اس کے بارے میں ہم بھی اتنے ہی لاعلم ہیں جتنی آپ.... ویسے بھی کہانی میں اگر پہلے ہی سب جان لیں تو کہانی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک آپ کی پیش گوئی کی درستی کا تعلق ہے تو اس کا تو ہم برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری قارئین بہت ذہین ہیں۔

مارچ تو گزر چکا لیکن دنیا میں آپ آ ہی چکی ہیں۔ اس لیے سالگرہ کی دلی مبارک باد۔ دعا ہے آپ خوشیوں کے ساتھ ہر سالگرہ منائیں۔ آمین۔

مہناز رانی' مانانوالہ ضلع شیخوپورہ سے شریک محفل ہیں

آپی آپ کو ایم اے کی اسٹوڈنٹ کی لکھائی کی سمجھ نہیں آتی تو میں تو پھر فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں میری سمجھ کہاں آئے گی۔

سب تعریفیں تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہیں جس نے مجھے اتنے غصے کے باوجود لکھنے کی ہمت پھر دے دی اور آپ کو دل توڑنے کی ہمت سے نواز رکھا ہے۔

ج : پیاری مہناز! اتنا غصہ' اتنے شکوے' شکایتیں۔ تین فل اسکیپ پیپر پر لکھا خط اور شعاع پر تبصرے کی ایک سطر نہیں لکھی۔ شعاع پہلے آتا ہے خواتین بعد میں آتا ہے۔ اس لیے تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود اکثر خواتین میں خط شامل ہو جاتے ہیں آپ کی لکھائی تو بہت اچھی ہے۔ اور یہ ضروری بھی نہیں ایم اے' پی ایچ ڈی ہوں تو لکھائی بھی اچھی ہو۔ ڈاکٹروں کی لکھائی نہیں دیکھی آپ نے؟ رمشا جی! آپ بھی سن لیں مہناز نے آپ کا خط ہمیں پہنچا دیا تھا۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے ہم شامل نہ کرسکے۔

فائزہ بھٹی نے پتوکی سے شرکت کی ہے' لکھا ہے

سرورق بہت پیارا تھا۔ عفت سحر کا قلم خوب چل رہا ہے آج کل۔ "شہرزاد" آج کل ہماری سب سے پسندیدہ

سانحہ ارتحال

فیصل آباد کے نیوز ایجنٹ جناب آصف صاحب کی والدہ محترمہ قضائے الٰہی سے دنیا سے رحلت فرما گئیں۔
(انا للہ وانا الیہ راجعون)
ماں کا سایہ رحمت ہے۔ ہم آصف صاحب کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعاگو ہیں' اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

کہانی' ہر طرح کے قاری کو خوش کرنے کے ہنر سے واقف ۔ہاں یہ شہرزاد کے ٹائٹل کے اوپر جمشید انصاری کے اسکیچ والا بندہ بھی چل سکتا ہے۔ ویسے در شہوار اور محمد ہادی لوگوں کے ڈراموں نے مجھے پوری کہانی میں اتنی بار ہنسایا کہ ہر بار بھابھی کی نظر اٹھی۔ ہر بار بتانا پڑا کہانی پڑھ کر ہنس رہی ہوں۔ بلاوجہ نہیں۔ "شہر خطا" میں یہ رافع کیسے پھر سے زندہ ہو گیا۔ ہم نے تو ختم درود سب کروا ہی لیا تھا۔ نایاب جیلانی رافع کو زندہ کر سکتی ہیں تو کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ عنایہ کو بھی غلط ثابت کر دیا' ہم قاری لوگ جو عنایہ کو سب سے مظلوم مخلوق سمجھ رہے تھے ہمارے ذہنوں کو بالکل ہی الگ لائن پر لگا دیا ہے۔ "برہا بھاگ کی مینا" سمیرا حمید نے ایک بار پھر مشکل الفاظ اور اچھے مکالموں سے ادھ موا کر دیا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ جن دقتوں کے بارے میں سمیرا نے لکھا۔ ان پر لکھنا اور ان الفاظ میں ہر لحظہ دھڑکتی روح کا احساس پانا۔ رائٹر ہی نہیں قاری کے لیے بھی بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔

"چھن جانے سے پہلے' ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کیا ہمارا نہیں تھا۔"

"میں اس دن کی گواہی دینے کے لیے تیار ہوں' جس دن تم پیدا ہوئیں کہ تمہیں میرے لیے بنایا گیا۔"

"محبت وہ سفر ہے' جس میں انسان اکیلا ہی ایثار از دار اور ایمان دار ہوتا ہے۔"

سمیرا حمید کے قلم سے ادا ہوئے یہ لفظ بول رہے ہیں' ہر لفظ اپنے اندر ایک الگ کہانی سموئے ہوئے ہے۔

ج : پیاری فائزہ بہت بے ساختہ اور دلچسپ تبصرہ ہے۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ پچھلا خط شامل نہ کر سکے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ آپ کے ابو نے پوسٹ کر دیا تھا اور ہمیں وقت پر مل بھی گیا تھا۔ بس صفحات کی کمی آڑے آئی۔ اپنی امی اور ابو کو ہمارا اسلام کہہ دیں۔

فوزیہ ثمرہٹ ہانیہ عمران آمنہ رئیس' گجرات سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

سرخ گلابوں والے ٹائیٹل نے دل خوش کر دیا۔ کاش ایسے گلاب کوئی ہمیں بھی پیش کرتا۔ خیر رہنے دو۔ کی حال سناواں' دل دا کوئی محرم راز نہ ملا۔

پہلی شعاع کی باتیں ہمیشہ کی طرح مختصر ٹھہریں۔ اور پیاری باتیں لاجواب۔ جب سے تجھ سے ناتا جوڑا اس ماہ بھی مزے کا تھا۔ اس سلسلے کا نچوڑ یہی ہے کہ 70 فیصد عورتیں ہی قربانی دیتی ہیں ازدواجی زندگی کے لیے۔

پہلے شہرزاد کو پڑھا۔ صائمہ جی نے تو ہمیں اپنے قلم کے ساتھ باندھ لیا ہے۔ سحر ہے ان کے قلم میں۔ خواب شیشے کا اس بار بھی قسط دلچسپ رہی' ایک بات تو طے ہے' طلال منافق نکلا۔ شہر خطا ناقابل فراموش تھا۔ کیا انابیہ نے انادیہ کو زہر دیا تھا یا دونوں کی سفلی عمل کے ذریعے موت ہوئی۔ خط آپ کے میں اس تحریر کی مکمل آپ نے تفصیل بیان کر دی ہے۔ ہر کردار ہی ہے۔ مخلص نہیں تھا۔

خط آپ کے اس ماہ تو سب کے تبصرے ہی لاجواب تھے۔

کوثر خالد ہمیشہ کی طرح اپنے طرز سے محفل میں چھائی رہیں اور محفل کی ملکہ یعنی آپ کے تو کیا ہی کہنے ہیں' معصومیت تو آپ پر ختم ہے۔ جناب اس سلسلے کی خوب صورتی آپ کے کمنٹس ہی تو ہیں۔

نصیب کے اچھے تو پہلے بھی نہیں تھے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

آپ کا جواب بہت پسند آیا۔ شاید اس سے ان بھائیوں کی پٹی کھل جائے۔ جو تصویر کا ایک رخ دیکھتے ہیں یا ان کو دکھایا جاتا ہے۔ خیر۔ زندگی ملی ہے' دن پورے کر کے ہی جانا ہے۔ چاہے ہنس کر چاہے رو کر۔ مکمل ناول برہا بھاگ کی مینا' لفظوں کی جادو نگری۔ کیا یہ حقیقت میں مینا کماری کی کہانی تھی۔ یا فرضی تخلیق تھی سمیرا حمید کی۔

افسانے اچھے تھے خاص کر بہار حاضر ہو۔ دیوار یار بھی اچھا تھا۔ یہ بہن ہی ہوتی ہے۔ جو بھائیوں پر ہر لمحہ قربان ہونے کے لیے تیار۔

ج : پیاری فوزیہ! کوئی پیش کرے نہ کرے' ہم نے تو آپ کو گلاب پیش کر دیے ناں اور یہ گلاب کبھی مرجھائیں گے بھی نہیں .... محرم راز بھی مل جائے گا۔ وقت تو آنے دیں۔ ناتا جوڑا ہے کا سلسلہ خواتین لکھ رہی ہیں۔ کبھی مردوں نے لکھا تو تب اندازہ ہو گا کہ 80 فیصد مرد بھی قربانی دیتے ہیں ازدواجی زندگی کے لیے.... اور یہ کیا لکھا آپ نے کہ نصیب کے اچھے تو پہلے بھی نہیں تھے.... خود ترسی سے نکل آئیں۔ رو کر نہیں ہنس کر زندگی گزاریں' کیا کمی ہے آپ میں' صرف ایک نعمت جو آپ کو حاصل ہے

بصارت۔ آپ اس کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کریں گی تو سجدے سے سر نہیں اٹھا سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ر۔فاطمہ نے کبیر والا سے لکھا ہے

صائمہ اکرم چودھری کا ناول "شہرزاد" بہت اچھا جارہا ہے در شہوار اور شہرزاد دونوں کا کریکٹر بہت اچھا ہے لیکن میں چاہتی ہوں شہرزاد ہادی کے ساتھ ہو اور در شہوار کے لیے کوئی اور ہیرو لے آئیں۔

"شہرزاد" کی گاڑی کا جس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا' وہ یقیناً "محمد ہادی ہی ہوگا در شہوار کے جھٹکے سے مجھے بھی اپنا کالج میں لگایا گیا جھٹکا یاد آگیا۔ میرا جھٹکا ہماری پرنسپل کی گاڑی پر لگا تھا۔ لیکن گاڑی کا نقصان نہیں ہوا کیونکہ وہ ہارڈ بال نہیں تھی۔

کیمسٹری میں فیل ہونا تو بنتا ہے لیکن پاک اسٹڈیز میں فیل ہونا کچھ ہضم نہیں ہوا۔ طوبیٰ نے جو دوسری بد دعا ہادی کو دی اس پر بہت ہنسی آئی۔

اور مجھے کینوس شوز کی سمجھ نہیں آئی۔ یہ کس چیز کے بنے ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں۔

ج : پیاری فاطمہ! آپ نے اکثر طالب علموں کو موٹے کپڑے کے فیتے والے جوتے پہنا دیکھا ہوگا۔ وہی کینوس شوز ہیں۔ ہم جب کالج میں تھے تو ہماری ایک ساتھی اردو میں فیل ہوگئی تھی۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی کہ کوئی اردو میں بھی فیل ہوتا ہے مگر طالب علموں سے ایسی ان ہونی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بیچارے معصوم بھی ہوتے ہیں اور مصروف بھی (نصابی کتابوں کے علاوہ)۔

ارم کمال' فیصل آباد سے لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت ہی دلفریب اور چمکتا دمکتا تھا۔ لیکن میک اپ میں گردن کو نظر انداز کردیا گیا۔ کوثر خالد کی حمد ذہن و دل میں سما گئی۔ پیاری نبی کی پیاری باتیں کا سلسلہ بہت ہی اجر اور ثواب کا مستحق ہے سمیرا حمید نے "گیت درویش" میں گویا دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے میں یاسمین اقبال نے اپنے دکھ اور تکلیفیں بھی اپنی کامیابیوں کی طرح بیان کیں۔ یہ حوصلہ صرف ان بیویوں میں ہوتا ہے جو اپنے شوہروں سے سچی اور پر خلوص محبت کرتی ہوں "شہرزاد" بہت ہی انسپائر کررہا ہے (صائمہ جی ویل ڈن) در شہوار گروپ کی شوخیاں اور شرارتیں بہت ہی مزا دے رہی ہیں' ان کو جاری رہنے دیجیے گا۔ "محبت' بادل' بارش اور تم" میں عطیہ خالد نے محبت کا اصل مفہوم پیش کیا۔ منظر نگاری غضب کی تھی۔ زندگی میں ہاجرہ ریحان کے مطابق عورت کی زندگی میں مرد ہو تو زندگی ہے! بعض عورتوں کی زندگی میں تو مرد کے ہونے سے زندگی نہیں موت ہوتی ہے "کارزار دعا" شمارے کی اے ون تحریر رہی۔ سمیرا حمید کا "برہا بھاگ کی مینا" لفظ لفظ طلسم اور حرف حرف جادو جگا رہا تھا۔ "خواب شیشے کا" یہ قسط بھی سانس روک کر پڑھی۔ اب نمیر کو چاہیے شرافت کے جامے میں آجائے شکر ہے کہ طلال سے مہپاہ کی جان چھوٹی "رقص بسمل" ہاں آپ کی ردی کی ٹوکری نے میرا خط کھایا تو اچھا نہیں ہوگا اسے سمجھا دیں۔

ج : پیاری ارم! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے' ہماری ردی کی ٹوکری ایسے خط نہیں کھاتی۔ ویسے وہ پوچھ رہی ہے کہ خط کھالوں تو کیا کرلوگی؟

مسرت الطاف احمد' کراچی سے لکھتی ہیں

"شہرزاد" اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ قارئین کے دل میں مضبوط جگہ بنا چکی ہے۔ البتہ شہرزاد کا کردار اتنا دلچسپ نہیں اور نہ ہی اسے اتنا ہائی لائیٹ کیا گیا سارا فوکس تو در شہوار پر ہے اور یہی کردار ناول کی جان ہے در

افسانوں میں نمبر ون "دیوار یار" رہا بہت ہی انٹرسٹنگ تحریر تھی "پریم پجارن" بہت ہی تلخ تحریر محسوس ہوئی حقیقت سے قریب تر۔

صفحہ نمبر 290 میں یہ لائن پڑھ کر شاکڈ ہوگئی۔ رات کو ساڑھے نو یا دس بجے سو جائیں اور صبح پانچ بجے بیدار ہو جائیں۔ ڈیئر آپی ہم تو رات کا ڈنر بھی ساڑھے نو اور کبھی تو دس بجے بھی کرتے ہیں۔ کیوں کہ ابو کے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے ہیں تو دیر ہو جاتی ہے تو سوچیں رات کو کبھی 12 تو کبھی ایک تک سو پاتے ہیں البتہ امی اور ابو جلدی سو جاتے ہیں۔

ج : پیاری مسرت! ہمارا حال بھی آپ سے مختلف نہیں' مجال ہے جو کبھی دو بجے سے پہلے بستر پر گئے ہوں اور کبھی تو تین بھی بج جاتے ہیں لیکن سب ایسے نہیں ہوتے کچھ لوگ بڑی باقاعدہ زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارے ساتھ

تسنیم شریف کام کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جاتی ہیں' چاہے اذان سات بجے ہی کیوں نہ ہو۔ ساڑھے سات بجے وہ نیند کی وادی کی سیر کر رہی ہوتی ہیں اور صبح چار بجے بیدار ہو جاتی ہیں۔ ان کا قول ہے کہ رات اللہ تعالیٰ نے سونے' آرام کے لیے بنائی ہے الوؤں کی طرح جاگنے کے لیے نہیں۔ ان کی سب باتیں بجا پر کیا کریں کہ

سہ طبیعت ادھر نہیں آتی

پرچے پر تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع ہے۔

ارم عثمانی نے ڈیرہ اسماعیل خان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

رسالے پڑھے' خوب دل لگا کر پڑھے۔ تقریباً" دس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہو گا۔ ایک اچانک مدیرہ پر بات کرتے کرتے امتل کا نام منہ سے نکلا اور میری خالہ جان کے منہ سے ان کی تعریف و توصیفی جملوں کا سیلاب اٹد آیا۔ مجھے حیرت کہ بھئی یہ تو میرے زمانے کی مدیرہ ہیں۔ آپ کے زمانے کی تو نہیں تھیں۔ لو جی! خالہ کو تو چڑھ گئی تپ فوراً" بولیں اوہو! تمہیں میں بڑی لگتی ہوں۔ امتل بھی میرے جتنی ہی ہوں گی۔ جب سے شعاع' خواتین پڑھا ہے ان کا ہی نام چل رہا ہے مجھے یقین نہیں آیا۔ سارے

ناول سارے افسانے زبردست تھے' جو بازی لے گیا وہ تو ہے میمونہ صدف کا افسانہ "جل پری" واہ بھئی واہ "پیان اور چاند" کتنے پیارے بہن بھائی۔ مجھے تو خود میمونہ کی باتوں سے اتفاق ہے۔

مصباح علی کا ناول پڑھتے ہی طبیعت کھل جاتی ہے انداز بیاں سادہ .... اور موضوع بدل بدل کے' بھئی کیسے آپ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہیں۔ آپ .... آخر ہیں کیا چیز بھئی آپ .... ناولٹ بادل' ہوا' بارش سارے ہی موسم ملا دیے۔ ویسے مجھے رائٹر کی گرفت کمزور لگتے کے ساتھ ایک جملے پر اعتراض ہے یہ "دبئی کے کال سنٹر" کا مطلب جانتی ہیں کیا مصنفہ' وہاں کی نوکری کون فخر سے بتا سکتا ہے۔

ج : پیاری ارم! کہتے ہیں عورت کی عمر وہ ہوتی ہے جو وہ نظر آتی ہے اور مرد کی عمر جو وہ محسوس کرتا ہے۔ اب آپ جو بھی سمجھ لیں لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ امتل آپ کی دوست ہی ہیں اور دوستوں کے ساتھ عمر سے زیادہ دل اور ذہن کا پیچ ہونا چاہیے۔ ویسے بھی امتل کا مقولہ ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ لیکن تبصرہ نامکمل اور ادھورا سا لگا صرف دو کہانیوں اور ٹائیٹل پر تبصرہ؟

ثوبیہ نور' کشن گڑھ بھاول نگر سے شریک محفل ہیں'

ہمارے خوب صورت گاؤں میں جو مخلوق بکثرت پائی جاتی ہے۔ وہ ہیں کتے' جس بھی گلی سے گزریں کسی نہ کسی دیوار سے ٹیک لگائے' پاؤں پسارے آرام فرما رہے ہوتے ہیں' اب ایسے نیم بے ہوش کتوں سے ڈر تو کیا ہی لگنا' وہ تو بے چارے ماحول کا حصہ لگ رہے ہوتے ہیں بہت خوب صورتی سے۔

جب ہم نور کے تڑکے اٹھ کر' بمشکل آدھا پونا ناشتہ بنا کر' منہ پر پانی کے چند چھینٹے مار کر' نیند سے بھری آدھی بند آدھی کھلی آنکھیں لیے' گاؤں میں صبح کے خوب صورت آغاز کو اپنی نیم باز آنکھوں سے میلا میلا دیکھتے' راستے میں لہلہاتی سبز گندم سے آنکھیں چراتے بلکہ بند کرتے اسکول سدھار رہے ہوتے ہیں' تب یہ بھی ہماری ہی طرح سوئی جاگی آنکھیں لیے' راستے کے پتھروں سے بچتے بچاتے سر کو جھکائے تلاش رزق میں نکل رہے ہوتے ہیں' کبھی

قانتہ رابعہ کو صدمہ

قانتہ رابعہ کے بھانجے اسد اللہ ایک ٹریفک حادثے میں شہید ہو گئے۔ مرحوم جو نہایت ذہین اور خوب صورت تھے' اپنی زندگی کی صرف بیس بہاریں ہی دیکھ پائے۔ قانتہ اور ان کی بہن کے لیے یہ اتنا بڑا صدمہ ہے کہ جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بہن اور دیگر اہل خانہ کو صبر دے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

خطرناک نہ لگے' ہاں البتہ رات کے وقت جو مدھر سر بکھیرتے اور تانیں اٹھاتے ہیں کہ سن کر اور سمجھ کر پطرس بخاری' اتنے بڑے ادیب بن گئے مگر در شہوار کی درگت پڑھ کر پتا چلا کہ اگر ان کی شرافت میں مخل ہوں تو یہ اتنے شریف ہرگز نہیں رہتے۔

ویسے بھی در شہوار کی اور ہماری زندگی میں اتنا تو فرق ہے کہ کتا پیچھے لگنے پر اسے ہیرو مل گیا ہمیں لعنتیں مل جاتی تھیں کہ تم نے پنگا کیوں لیا؟

اب بندہ پوچھے کہ زندگی میں تھوڑی سی رنگینی لانے کے لیے اتنا چھوٹا سا پنگا بھی ناجائز ہے؟

جل پری' خوب صورت افسانہ مگر بد صورت حقیقت۔ عجب رسم دنیا ہے کہ چڑیا' بلبل اور کوئل ایسے نام دیتے ہوئے لڑکیوں سے بس ایک ہی توقع کی جاتی ہے کہ چپ رہیں اور چہچہانا چھوڑ دیں۔

بانو قدسیہ پر سمیرا حمید کا تبصرہ خوب تھا خوب صورت شخصیت کو انہوں نے بہت ہی خوب صورت انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔

ج : نیم باز آنکھیں' گندم سے آنکھیں چرانا' سوئی جاگی آنکھیں۔ پیاری ثوبیہ! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ زندگی میں رنگینی لانے کے لیے کتوں کا انتخاب.... ہاہاہا' ہماری طرف سے تو پنگا لینے کی اجازت ہے۔ بس خیال رہے وہ چار ٹانگوں والا ہی ہو دو ٹانگوں والا نہ ہو' سالگرہ مبارک ہو اور

دوستوں کو دینے کے لیے تحفہ خریدتی ہیں تو اپنے آپ کو دینے کے لیے تحفہ بھی نہیں خریدیں گی کیا.... ہیں۔''

چندا مبشر نے روات سے لکھا ہے

میں ایک ایسے گاؤں سے تعلق رکھتی ہوں جہاں کی کتابوں میں صرف مردوں کی آزادی لکھی گئی ہے اور عورتیں نہ جانے کتنی صدیوں سے قیدی ہیں۔ ہم کال کوٹھری کے قیدی نہیں ہیں مگر قید خانہ جتنا مرضی کھلا ہو قید تو قید ہی ہوتی ہے نہ' جہاں سال کے بارہ مہینوں کے 365 دن ایک جیسے حبس زدہ اداسی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ایسی اداسی جو روح کو زخمی کر دیتی ہے اور ہم تڑپ تڑپ کے آخر کار پتھر کے ہو جاتے ہیں مجھ سمیت بہت سی لڑکیوں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے کہ آنکھوں میں مرے ہوئے خوابوں کی کرچیاں اور چہرے پہ لپٹے ہوئے ارمانوں کے کفن بہت تکلیف دیتے ہیں۔

شعاع میں کبھی کوئی غیر معیاری تحریر نہیں پڑھی۔ ایسا پڑھا جو چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی ہمیں پریشانیوں سے بہت دور لے جاتا ہے۔ مگر فروری کے شمارے میں ''پیار کا دوسرا شہر'' یہ ایسی تحریر ہے جو ہمیں دنوں تک رلاتی رہے گی۔ ہم جیسے لوگ جو پہلے ہی اپنے بے انت دکھوں پہ ہر وقت ماتم کناں رہتے ہیں کیا ان کے لیے ایسی تحریریں ٹھیک ہیں؟ ہم نے بہت سے اپنے اور بہت سے اپنوں کے اپنے کھوتے ہوئے دیکھے ہیں ایسی تحریریں ہمارے زخموں کو ہرا کرتی ہیں' پلیز حقیر سی التجا ہے جس کہانی کا اختتام سانس روک لے' وہ کہانی مت دیا کریں ہم جیسی بہت سی لڑکیاں امید کے سہارے سانس لے رہی ہیں' زندگی کے غم زدہ اختتام یہ ان کی امیدیں مت توڑیں۔ مجھے بات کہنے کا ہنر نہیں آتا۔ آپ سمجھنے کے ہنر سے مالا مال ہیں' سمجھ جائیں گی۔

ج : پیاری چندا! ہمیں اندازہ نہیں کہ آپ کن پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہیں لیکن مطالعہ کی اجازت ہے' پڑھ رہی ہیں یہ بھی بڑی بات ہے' خوش رہنا سیکھیں۔ جو لوگ یہ ہنر سیکھ جاتے ہیں۔ وہ ہر حال میں مگن رہتے ہیں۔

جسم قید کیا جا سکتا ہے' ذہن نہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کو شکر کرنے والے بندے بہت پسند ہیں۔

اور بات کہنے کا ہنر تو آپ کو اللہ نے بہت دیا ہے۔ ہم آپ کو مشورہ دیں گے' آپ کہانیاں لکھیں۔ ہمیں یقین

ہے آپ بہت اچھی کہانیاں لکھ سکتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

حمنہ لیاقت گوجرہ سے شرکت کر رہی ہیں' لکھا ہے

نہ جانے مائیں کیوں کہانیوں کو برا سمجھتی ہیں اور اپنی بچیوں کو ان سے دور رکھتی ہیں۔ اچھا' برا پہلو تو ہر شے کا ہوتا ہے۔ مگر شعاع' خواتین وغیرہ میں ہمیشہ معیار کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

پڑھنے کا شوق ماما سے وراثت میں ملا ہے۔ ماما شادی سے پہلے بھی آپ کے شمارے پڑھتی تھیں اور اب جب کہ اب ان کی بڑی بیٹی اٹھارہ سال کی ہونے والی ہے تو اب بھی پڑھ رہی ہیں' اب بات ہو جائے کہانیوں کی ''خواب شیشے کا شان دار ہے' یہ تو۔ حیرت ہوئی کہ قارئین میں سے کسی کو

بھی شک نہیں گزرا (مطلب جو قارئین خط لکھتی ہیں) مگر ہمیں تو پہلی قسط سے پتا ہے کہ موحد آفندی ہی نمیر آفندی ہے۔ یہ کہانی میری فیورٹس کی لسٹ میں شامل ہے۔

"رقص بسمل" ویل ڈن اینڈ ویری گڈ نبیلہ عزیز۔ اس قدر ذہنی انتشار کے باوجود اسے صحیح سمت میں لے کر چلیں۔ تنقید صرف تنقید ہونی چاہیے۔ نہ کہ دل آزاری کا سبب۔ (آپ کو پتا بھی نہیں ہوتا اور آپ کسی کا کس قدر دل دکھا جاتے ہیں)

سو تنقید کریں ضرور مگر ہاتھ ہولا رکھ کر۔

ج : پیاری حمنہ! آپ کا پیغام ان تمام والدین تک پہنچا رہے ہیں جو اپنی بچیوں کے پرچا پڑھنے پر پابندی لگاتے ہیں "خواب شیشے کا" کے بارے میں آپ کا اندازہ کتنا درست ہے یہ تو آگے جا کر پتا چلے گا۔ ویسے اپنی امی کو ہمارا سلام کہہ دیں ہماری قارئین بلاشبہ بہت ذہین ہیں۔

تنقید برائے تنقید تو واقعی غلط ہے لیکن اپنی رائے کا اظہار قارئین کا حق ہے ہم اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ قارئین کو بے لاگ تبصرہ کا حق ہے۔

مسز دلشاد نے لاہور سے لکھا ہے

بڑی مشکل سے برسوں میں ایک خواہش پوری ہونے لگی مگر ظالم سماج نے ہمیشہ اپنی ٹانگ اڑائی۔ ہوا یوں۔ ایک شادی میں کراچی ملیر آنے کا اتفاق ہوا۔ گھر سے وعدہ وعدے کے ضرور خواتین سے ملوا کر لائیں گے۔ شادی ختم ہوئی دو تین رشتے دار خواتین کا پروگرام بھی بن گیا۔ ایک دو بھائی بھی تیار ہو گئے۔ برا ہو دل کا جو بات زبان پر لے آیا

کہ بہت سے ناولوں پر دو دو ہاتھ کرنے تھے 'کسی کے اینڈ پر دھاڑیں مارتے گلے ملتے 'تو کسی پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے۔ کچھ تنبیہی 'کچھ نصیحتیں 'کچھ فرمائشی 'کچھ فہمائشی۔ میاں جی کو بھنک پڑ گئی۔ لو بتاؤ 'دس افراد کے قافلے کو ڈیٹ کر رکھ دیا۔ کوئی ضرورت نہیں اداروں پر دھاوا بولنے کی۔ یہ نہ ہو پنجاب سے آئے طالبان سمجھ کر تمہیں اندر کروا دیں۔ اس بڑھاپے میں مجھے تو نئی بیگم ملنے سے رہی 'پرانی سے بھی ہاتھ دھل جائیں بس پھر جہاں کے تہاں رہ گئے۔

نئے لکھنے والوں میں سائرہ 'سمیرا 'مصباح 'نمرہ 'ام طیفور بہت اچھا جا رہی ہیں۔ میری پسند کے مطابق۔ پرانی لکھنے والیاں بالکل جھلک نہیں دکھاتیں۔ تو پھر میں نے بھی دو حرف بھیج دیے ان پر۔ اس ماہ کا رسالہ اچھا لگا ہمیشہ کی طرح۔ ناولز میں کارزار دعا مصباح علی نے بہت پیارا لکھا۔ مصباح کے برجستہ جملے کی روانی اور خاص کر گاؤں کی منظر کشی اور انداز زندگی جس طرح سے لکھا 'پڑھتے ہوئے پرانے شعاع۔ خواتین کا احساس زندہ ہو گیا۔ اس لڑکی میں ملا جلا ٹیلنٹ ہے نا۔

افسانے بس ٹھیک تھے۔ لیکن آسیہ مظہر کا پریم مدارن بہت ہی خوب صورت الفاظ میں ڈھالی گئی کہانی جس طرح کا انداز اور الفاظ تھے 'ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کوزے میں دریا بند۔ اگر بلاوجہ اسے طویل کیا جاتا تو کہانی اپنا حسن کھو دیتی۔

بڑے میاں اگر وعدہ خلاف نہ ٹھہرے تو ملاقات ضرور ہوگی۔

ج : مسز دل شاد! دل شاد آپ کا نام ہے یا آپ کے صاحب کا نام ہے جنہیں آپ نے بڑے میاں کا لقب دے رکھا ہے۔ بھئی بڑھاپا اپنی جگہ ایک حقیقت سہی لیکن کیا ضروری ہے کہ اسے بار بار یاد دلایا جائے اور بڑے میاں کا نام دے کر جتایا جائے۔ اور ہاں آئندہ اپنا نام لکھیے گا۔ اچھا لگتا ہے کہ بندے کو نام سے پکارا جائے۔ اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔

آپ سے آدھی ملاقات کر کے پوری ملاقات نہ ہونے کا قلق ہمیں بھی ہے اور اپنے میاں صاحب کو بتا دیں کہ ہم کسی سے نہیں ڈرتے ہماری بہادری کے ثبوت کے لیے یہ کافی نہیں کہ مستقل کراچی میں رہتے ہیں۔ خواتین سے آپ کی محبت۔ ایسی محبت تو مجنوں نے بھی نہ کی ہو گی۔ اوہ خدایا 'کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم ایسے نایاب لوگوں کے دل میں رہتے ہیں آپ کے صاحب نے وعدہ کیا ہے 'ہم اس ملاقات کا انتظار کر رہے ہیں جو اس وعدہ کے ایفا پر ہو گی۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے محفل کو رونق بخشتی ہیں 'لکھتی ہیں

آپ نے ہمیں یوں یاد کیا کہ ہم دم بخود ہوئے۔ "نعت" بہت منفرد لگی۔ پیاری نبی کی پیاری باتیں 'ان ہی سے جگمگ ہیں اپنی راتیں۔ گپت درویش بانو قدسیہ پر اللہ کے کرم نے حیران کر دیا۔ آمنہ زریں بہت اچھا تبصرہ کرتی

تھیں۔ کیا ہوا انہیں ؟ کیا ابھی بھی بیمار ہیں۔ ہم انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

"شہر خطا" کتنی عبرت کر گیا عطا۔ جل پری میمونہ صدف۔ انوکھا انداز دکھا گئی۔ "دیوار کے پار" اتنا پیار سب کو ملے....

"برہا کی مینا" تاریخی کردار.... تار تار.... سمیرا تو نے دکھتے دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ہاں جی ہم بھی تو مینا جیسا دل رکھتے ہیں مگر ہم عاشق رسولِ نہ بھی ہوں تو ان کے امتی ہیں۔ کمال امروہوی .... رئیس امروہوی کا بھائی تو نہیں ؟ وہ مسلمان اور مینا ہندو۔

غزلیات ہمیں تو یہی لائن بھائی بس....

عشق کیا چیز ہے اور حسن کا منشا کیا ہے؟

روز سرِ شام بے ہوش ہو جاتی ہوں۔ وجہ عمر' موٹاپا اور کام.... بہرحال مر مر کے جیسے جائیں گے۔

ج : پیاری کوثر! آپ کی صحت کے متعلق جان کر تشویش ہوئی۔ آپ جیسی باغ و بہار شخصیت کام سے تھکنے والی نہیں۔ عمر بھی ایسی زیادہ نہیں۔ موٹاپا۔ بھئی تصویر میں تو آپ موٹی نہیں لگتیں.... آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کرائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور خوش خرم رکھے۔ آمین

تبصرہ حسب معمول رواں اور دلچسپ ہے۔ رئیس امروہوی کمال امروہوی کے چچا زاد بھائی تھے۔ مینا کا باپ مسلمان تھا اس لیے وہ بھی مسلمان ہی تھی۔

جیا چوہدری نے ملتان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

مجھے آپ کے دونوں ڈائجسٹ بہت پسند ہیں۔ گو کہ اب لکھنے والوں کا انداز بہت بدل گیا ہے۔ پھر بھی ایسی لت لگی ہے کہ پڑھے بنا مزہ ہی نہیں آتا۔ مارچ کا ٹائٹل بہترین لگا۔ انٹرویو پڑھ کے مزہ آ گیا۔ اس کے بعد صائمہ اکرم کا "شہزادہ" کو جلدی جلدی ختم کیا۔ منہ سے نکلا بہت اعلا عفت سحر آپی کا "خواب شیشے کا" بھی ٹھیک رہا۔ نایاب جیلانی تک تعریف پہنچا دیں۔ ایک شکایت ہے اس بار افسانے کچھ خاص اچھے نہیں لگے جانے کیوں میمونہ صدف کے لکھنے کا انداز ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔ ایک بات اور پوچھنی تھی ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو کیا منشا محسن علی اور بنت سحر ایک ہی ہیں۔ دونوں کے لکھنے میں بہت مماثلت ہوتی ہے۔ آپی صدف آصف اور حیا بخاری کی کوئی کہانی پڑھنے کو نہیں ملی مجھے ان دونوں کے لکھنے کا انداز بے انتہا پسند ہے۔

ج : پیاری جیا! اکثر مصنفین کی تحریروں میں مماثلت ہوتی ہے' بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ اشفاق احمد بانو قدسیہ کو لکھ کر دیتے ہیں۔

صائمہ نور نے کراچی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

"برہا بھاگ کی مینا" سمیرا حمید نام پڑھ کر اندازہ تھا کہ شاہکار ہو گا مگر جیسے جیسے پڑھتے گئے۔ آشکار ہوتا گیا کہ کس قدر خاص ہے۔ بہت مبارکباد سمیرا کے لیے۔

"خواب شیشے کا" میں مہماہ کے نکاح کے بعد دلچسپی تھوڑی کم ہو گئی تھی مگر پچھلے ماہ کی قسط پر کنیز فاطمہ کے تبصرے کو پڑھنے کے بعد ڈوبتے دل کو کچھ حوصلہ ملا کہ مہماہ کا نکاح موحد سے ہوا ہے.... اب آگے اللہ جانے یا رائٹر....

"گیت و درویش" بہت ہی خوب صورت خراج عقیدت جو لکھا تو سمیرا نے ہے مگر ترجمانی ہمارے دل کی ہے....

"پریم پجارن" آسیہ نے دل چھو لیا جل پری.... میمونہ صدف واقعی تلخ حقیقت ہے ہمارے معاشرے کی۔

عطیہ خالد کا ناول "محبت' بادل' بارش" رومانوی نام کے ساتھ اچھی تحریر تھی۔

ج : پیاری صائمہ! ہمیں آپ کا صرف ایک افسانہ "ہاں وہ سپنا تھا" موصول ہوا ہے۔ اسے ابھی پڑھا نہیں ہے۔ خوب صورت تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

مدثرہ سلیم نوشہرہ جملیرا سے لکھتی ہیں

بہار سے سجا سرورق بہت پسند آیا حمد و نعت کے بعد پیارے نبیﷺ کی باتوں سے مستفید ہوئے واؤ! سمیرا حمید قسم سے دل خوش کر دیا۔ "خواب شیشے کا" تزئین کے ساتھ اچھا ہی ہو رہا ہے۔ "شہزاد" ہٹ جا رہا ہے "کارزار دعا" مصباح علی سید دعا پہ یقین اور پختہ ہو گیا عطیہ خالد کا "محبت' بادل' بارش" اچھی کاوش تھی "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" یاسمین اقبال پڑھ کر بہت مزا آیا۔ اب آتے بیسٹ آف دی بیسٹ "شہر خطا" کی طرف۔ دی اینڈ

بہت پیارا تھا رائٹر نے ہر کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے "جل پری" میمونہ صدف نے عورت کی قسمت کے بارے میں بہت اچھا خاکہ کھینچا ہے۔ باقی سارے افسانے زبردست تھے۔

ج : پیاری مدثرہ! معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا نام سہوا" غلط شائع ہو گیا۔

تبصرہ بہت جامع اور اچھا ہے متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شازیہ الطاف ہاشمی۔ شجاع آباد سے شریکِ محفل ہیں، لکھا ہے

سرورق والی حسینہ خوش ہیں، گلاب سی کھل رہی ہیں اور میں اداس ہوں نہ لیٹر شامل ہے نہ افسانہ۔ "خوب صورت بنیے" میں ہنستی ہوئی خاتون ڈائن جیسی لگیں، اتنا بڑا منہ اور وہ بھی کھلا ہوا، بہرحال مشورے اچھے لگے۔ سمیرا حمید نے مینا کماری کو سامنے لا کھڑا کیا بہت اچھا ناول۔ ہاجرہ ریحان ہمیشہ کی طرح کمال کر گئیں، آسیہ مظہر چوہدری کا افسانہ بھی بہترین تھا "دیوار پار" دل کے پار ہوا۔ غزل بارہ بنکوی کی ہے پسند آئی ہے مگر یہ بارہ بنکوی کیوں ہیں؟

یاسمین اقبال کا نانا اچھا لگا، بھلی سی خاتون لگیں۔

بندھن میں وہاج خان ایک تو نام عجیب سا اور اوپر سے دوسری بار انٹرویو کیا کہوں۔ آج ملتان جانے کا پھر سے اتفاق ہوا مچھلی منڈی کی بو، کھالوں کی بدبو، البتہ میٹرو کو دور سے دیکھا۔ ترقی ہوئی ہے۔ شہر اچھا ہے مگر اس گندگی کا کیا کیا جائے جو سارے شہر کے حسن کو گہنا رہی ہے، پارک خوب صورت ہیں۔ گھاس کے قطعات کبوتروں کے غول (جنگلی کبوتر) اپنے گھر کی یاد دلا گئے۔ قلعے سارے ہی پراسرار اور دل کو چھو لینے والے ہیں، ڈیرن سیمی کے رقص نے وہ سرشاری بخشی ہے کہ کیا کہیں یہ رقص دھوتی والوں پر (بھارت) بجلی بن کر گرا ہو گا اللہ ہمارے ملک کو ہنستا بستا اور سٹیڈیمز کو بھرا رکھے (آمین)

ج : پیاری شازیہ! دنیا کی ہر خاتون اپنی جگہ حسین ہے۔ آپ کا خط یا افسانہ نہیں لگا تھا شاید اس لیے آپ کو ہنستی ہوئی خاتون ڈائن لگی۔ کوئی مرد حضرات سے پوچھے جنہیں چڑیلیں بھی حسین لگتی ہیں۔

آپ کی تحریریں شائع ہو رہی ہیں، تھوڑا صبر سے کام لیں باقی تحاریر بھی باری آنے پر ان شاء اللہ لگ جائیں گی۔ خمار بارہ بنکوی۔ بارہ بنکہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ بارہ بنکوی لکھا جاتا ہے۔

ہم تو صرف ایک بار ملتان گئے ہیں اور سچ پوچھیے تو ہمیں ملتان بہت اچھا لگا اور صاف ستھرا بھی شاید اس لیے کہ ہمیں وہاں کچرے کے وہ ڈھیر نظر نہیں آئے جو کراچی میں دیکھتے ہیں۔

نوال گوندل نے جہلم سے لکھا ہے

میرا تجربہ کہتا ہے کہ کام کرنے والی خواتین بھلے صبح گھر سے نکلتی ہیں اور سارا دن مصروف رہ کر شام گئے آتی ہیں گھر کے بھی بہت سے کام منتظر ہوتے ہوں گے۔ لیکن ہم 24 گھنٹے گھر میں رہنے والی خواتین مؤذن کی اذان پر اٹھتی ہیں اور رات کے پہلے پہر تک مسلسل مختلف کاموں سے نبرد آزما ہوتے ہوتے سارا وجود تختہ بن جاتا ہے۔ ورکنگ وومن کے لیے الفاظ میں تھوڑی سی احساس کی گنجائش نکل آتی ہے اور کچھ خیال اور ستائش بھی لیکن میرے جیسی گھر میں بیٹھی کے لیے احساس اور ستائش تو کیا ڈانٹ پھٹکار ہی رہتی ہے فارغ ہی رہتی ہو مزے کر رہی ہو باہر کے مسئلے تمہیں کیا پتا یہ وہ.... آخر میں مہنگائی کا سارا رونا لپیٹ کر سر پر مار دیا جاتا ہے۔ میں نے اس کا حل یہی ڈھونڈا صبح شام خود کو یاد کرواتی ہوں "میں تھکتی نہیں خوش رہتی ہوں" لسٹ میں مصباح سید کا نام دیکھ کر ویسے ہی کھل جاتی ہوں بہت جلد یہ میری فیورٹ بن گئیں اس کی خاص وجہ ان کی تحریروں میں یکسانیت نہیں ہے۔ ہر بار الگ انداز خوب صورت جملے۔ "شہزاد" کے پیش لفظ جو باتیں کی تھیں اس پر فیس بک پر بہت ایشو بنایا گیا۔

ج : پیاری نوال! ہماری نظر میں تو گھر میں رہنے والی خواتین کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ آفس میں تو دس پندرہ منٹ کی مہلت مل جاتی ہے لیکن گھر میں تو ہر پل چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کا خیال رکھو دروازے کی بیل اور ٹیلی فون کی بیل سارا دن بجتی رہتی ہے بھاگ بھاگ کر برا حال ہو جاتا ہے۔ اور بچے تو سارا دن مصروف رکھتے ہیں۔

لیکن جہاں تک ستائش کی بات ہے تو اس کے لیے بہت باظرف اور قدر دان لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے،

چھوٹے دل کے لوگ خواہ آپ ان کے لیے کچھ بھی کر دیں کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہمیشہ طعنے ہی دیتے ہیں۔ بہرحال آپ نے بہت اچھی راہ نکالی۔ خوش رہیں اور خوش رکھیں۔ زندگی کے لیے ہمارا بھی یہی فلسفہ ہے۔

فیس بک کے بارے میں ہماری معلومات صفر ہے اس لیے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

ماہم حمید اور اور کلثوم حمید میرپور خاص سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

میں نے اس ماہ خط صرف شہر خطا کے لیے لکھا ہے۔ مجھے بہت زیادہ دکھ ہوا شہر خطا کا اینڈ پڑھ کر جو اس کہانی کا سب سے اچھا اور معصوم کردار تھا جس کے ساتھ سب سے زیادہ ظلم ہوا اس کو ہی شدت پسند بنا دیا گیا۔ اگر عنایہ شدت پسند تھی تو پھر دیا کی ماں بھی شدت پسند ہوگی' وہ بھی تو اپنی ساس کا ہر ظلم خاموشی سے برداشت کرتی تھیں لیکن نایاب نے انہیں تو بہت صبر والی دکھایا۔ غلطی صرف رافع نے کی اور جو بھی کیا' اس نے کیا اور جان بوجھ کر کیا لیکن اس کو سزا کی جگہ انعامات ملے اور جس نے عنایہ کے بارے میں یہ ساری باتیں کیں وہ تو عنایہ سے کبھی ملا تک نہیں تھا' صرف اندازے لگا کر کسی کی ذات کے بخیے ادھیڑ دیے۔ اس ماہ کا دوسرا اچھا ناول سمیرا حمید کا لگا۔ کیا یہ سچ میں مینا کماری کی زندگی کی کہانی تھی؟ ایک فرمائش بھی ہے کہ سمیرا حمید سے دوبارہ کوئی سلسلہ وار ناول لکھوائیں۔

اور یہ تبصرہ کلثوم حمید کا ہے۔ جو ماہم حمید کی والدہ ہیں۔

ماہم نے آپ کے ناول کے حوالے سے کافی زیادہ تبصرہ کیا ہے۔ لیکن میں کہانی کے اس حصے سے اتفاق کروں گی کہ مرد کی غلطیاں اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہیں لیکن عورت کی ہرگز بھی نہیں اور وہ بھی شادی شدہ لڑکی کی آپ نے تو پھر بھی رافع کو احساس ندامت اور خود اذیتی میں مبتلا دکھایا عنایہ کو آخر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے اصل گناہ کیا ہوا ہے۔ اور اکثر لوگ اپنے آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے کو ہی سچ مانتے ہیں۔ جبکہ دلوں کا حال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

ج: پیاری ماہم! نایاب کے تجزیہ سے ہم بھی متفق نہیں۔ ہماری نظر میں تو عنایہ اور دیا دونوں ہی مظلوم تھیں۔ دونوں ہی بدترین حالات کا شکار ہو کر ذہنی مریض بن گئیں۔ عنایہ اپنا ذہن ہی کھو بیٹھی اور دیا غلط راہوں پر چل نکلی۔ شدت پسند کے بجائے اگر عنایہ کو اذیت پسند کہا جاتا تو مناسب ہوتا اس نے ماں کے ظلم و جبر کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنے ذہن کے دروازے بند کر لیے اور ماں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔

کلثوم بہن! آپ کے تجزیے سے ہم متفق ہیں عورت کی غلطی کو معاف نہیں کیا جاتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شادی شدہ لڑکی بہت سی حقیقتوں سے آگاہ ہوتی ہے' اسے زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔

سچ تو یہ ہے کہ زندگی توازن کا نام ہے' کوئی بھی جذبہ' احساس چاہے منفی ہو یا مثبت اگر شدت اختیار کر جائے تو زندگی عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے۔ سر جھکا کر ظلم سہنا اور احتجاج نہ کرنا بھی تو نارمل نہیں کہا جا سکتا۔

شازیہ ہاشم میواتی عرف تمثال ہاشمی نے کھڈیاں خاص قصور سے محفل کو رونق بخشی ہے

حمد و نعت سے دل کو پرنور کرتے ہوئے آگے بڑھی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری اور مقدس و پاکیزہ فرامین کی طرف جنہوں نے دل کو عجب روشنائی اور محبت سے آشنا کیا۔ پھر دوڑ لگائی "خواب شیشے کا" ویلڈن عفت سحر طاہر آپ کے لیے شعر۔

ہمارے آگے تیرا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

"شہر خطا" کا اختتام اور مجھے اس میں جو سب سے پیارا اور قابل تحسین کردار لگا وہ صرف اور صرف فاتح تھا۔ سمیرا حمید بڑے عجیب اور انوکھے موضوعات حیات پر قلم کشائی کرتی ہیں۔

باقی سارے سلسلے بھی بہت اچھے تھے مگر ایک خط پڑھ کر اور اس کا جواب دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ آ گئی جس کو آپ نے لکھائی درست کرنے کا کہا تھا ہمارے شہر میں ایسی ٹیچرز بھی ہیں جو ڈبل ماسٹر کی ڈگری رکھتی ہیں مگر ہینڈ رائیٹنگ اچھی نہیں ہوتی۔ بات لکھائی کی نہیں ہوتی صاف لکھنے کی ہوتی ہے کہ ہماری پیاری مدیرہ کو سمجھ آ جائے۔

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ج: پیاری شازیہ! آپ کی لکھائی کو کچھ کہنے کی ضرورت

نہیں۔ ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ مگر آپ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ بات لکھائی کی نہیں صاف لکھنے کی ہوتی ہے اور بھی خطوط میں آپ نے جا بجا شعروں کے ذریعے جو پیوند کاری کی ہے۔ اس کی وجہ نزول؟ شعاع کی تعریف اور تبصرے کے لیے شکریہ۔ فائح صاحب بھی کوئی اتنے اچھے نہ تھے۔ عنایہ سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ جھٹ طلاق نامہ تھما دیا، جیسے تیار بیٹھے تھے۔ نایاب کے اس ناول کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ اس کا کوئی بھی کردار اچھا اور مثبت نہیں تھا۔ دیا بے چاری کو تو خواہ مخواہ موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔

نوڈیرو سے زرمین لیزا نے لکھا ہے

عفت سحر کا ناول بہت پسند ہے 'نمیرا' اتنا بے حس ہو سکتا ہے جو بڑوں کی سزا چھوٹوں کو دے رہا ہے اور شہر خطا بھی اچھا ناول ہے۔ صائمہ اکرم کا تو ہر ناول مجھے پسند ہوتا ہے آپ مکمل ناول زیادہ شامل کیا کریں۔ وہ اچھے لگتے ہیں فرحت اشتیاق نے ڈائجسٹ کے ساتھ کیوں ناتا توڑ لیا۔ انہوں نے تو کہا تھا میں کبھی ڈائجسٹ میں لکھنا نہیں چھوڑوں گی اب آخر میں میری فرمائش ہے صنم بلوچ کا بندھن میں انٹرویو لیں اور فہد مصطفیٰ کا بھی۔

ج : پیاری زرمین! اگر بڑوں کے کیے کی سزا چھوٹے بھگت رہے ہیں تو اس میں عجب کیا ہے۔ چھوٹے بھی تو اکثر بڑوں کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں۔ نو سال بعد دوسرا خط لکھا ہے تو تیسرا کب لکھیں گی۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

روزینہ نعیم اور یاسمین ساجد نے کھیالی گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سب سے بہترین افسانہ مجھے منشا محسن علی کا "بہار حاضر ہو" لگا اتنا پیارا رومانٹک سا افسانہ۔ عطیہ جی آپ کا ناولٹ اتنے اشتیاق سے پڑھنا شروع کیا تھا کہ کیا بتاؤں پر کچھ کمی سی لگی شاید آپ نے ناول جلدی ختم کر دیا۔ ہاجرہ ریحان نے بھی اچھا لکھا۔ اس کہانی کو پڑھ کر کچھ یاد آیا ایک واقعہ جو کبھی نہ بھول پائی میں شام 'ہوا' 'ڈاکٹر' 'ڈانٹ' 'بیمار' 'اداس ہو گئی پڑھ کر' میں اچھے دنوں کی یاد تھا یہ افسانہ

ویسے آپ لوگوں کو بھی ایوارڈ رکھنے چاہئیں سب سے اچھی کہانیوں کو سال کے اختتام پر ایوارڈ سے نوازا جانا چاہیے۔ جیسے اچھی کہانی، اچھا کریکٹر، بیسٹ ہیروئن اور بیسٹ ہیرو۔

ج : روزینہ اور یاسمین! یہ ایوارڈ والی تجویز اچھی تو ہے مگر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ ایوارڈ کس کو دیا جائے ہر رائٹر کو پسند کرنے والوں کا اپنا حلقہ ہے اور جہاں تک ہماری بات ہے تو ہم یہ فیصلہ کر ہی نہیں سکتے ہمارے لیے تو جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ والی بات ہے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نوشابہ، ہما، شمائلہ، نزہت سحر، شبل اور عائشہ نے خان پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

گھر میں ہم پانچ کزنز شعاع بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور میری فرینڈ عائشہ بھی۔ اس بار بھی "شہرزاد" کی قسط زبردست تھی۔ میں اور ہما (کزن) بینک گئے تو ہمارے پیچھے کتا لگ گیا لیکن شکر ہے 'وہ پاگل نہیں تھا اور اس نے ہمیں کچھ نہیں کہا' ورنہ ہمیں بچانے کے لیے ہمارے چھوٹے سے "خان پور" میں ہادی کہاں سے آتا؟ عفت سحر کا "خواب شیشے کا" اچھا چل رہا ہے۔ نایاب جیلانی بھی اچھا لکھتی ہیں "شہر خطا" نے شروع سے اینڈ تک سحر قائم رکھا۔ باقی ناول اور ناولٹ بس نارمل ہی تھے۔ افسانوں میں "جل پری" اور "زندگی" پسند آئے۔

ج : پیاری دوستو! ہمیں بھی یہ جان کر اچھا لگا کہ آپ سب کو شعاع پسند ہے۔ در شہوار کے پیچھے کتے کا لگنا' ہمیں نہیں معلوم تھا کہ قارئین کو اتنا رومانٹک لگے گا۔ وہ تو شکر کریں کہ کتوں کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ورنہ وہ بھی رومانٹک ہو جاتے تو؟؟

ارادہ

ییشا شفیع نے گلوکاری کا آغاز 2010ء میں ایک برانڈ کے موسیقی کے پروگرام سے کیا۔ جس میں انہوں نے جگنی عارف لوہار کے ساتھ گا کر مقبولیت حاصل کی۔ اور پھر وہ موسیقی کی دنیا میں کامیابیاں حاصل کرتی چلی گئیں۔ ییشا بہت جلد اپنے چاہنے والوں کے لیے کچھ نیا لے کر آرہی ہیں (بھئی میوزک میں نیا) اس بارے میں ییشا کہتی ہیں کہ "میں تمام درپیش چیلنجز کو دیکھ رہی ہوں ___ کون سے چیلنجز؟) مگر میری نظر اپنی منزل پر ہے (پر ہے کہاں___ بھئی منزل___؟) مجھے آگے اوپر جانا ہے۔ (ہوائی جہاز میں بیٹھ کر___؟) اس سال کے پہلے دو مہینے میں نے کتابیں پڑھنے میں گزارے' خوب سوچا اور مشورے کیے (کیا لکھنے کا ارادہ ہے___؟) خود بہت کام کیا (پڑھنے کا) اور اب میں اسٹوڈیو واپس آچکی ہوں۔ (یعنی لوٹ کے___؟)"

خراج تحسین

عدنان صدیقی نے اپنی ساتھی فنکارہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔" مجھے فخر ہے کہ میں بہت باصلاحیت خواتین کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ جس خاتون سے میں بہت زیادہ متاثر ہوں' وہ فریحہ جبیں ہیں۔ ہم سب اپنے حالات کا رونا روتے ہیں اور قسمت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں لیکن فریحہ جیسے لوگ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔ فریحہ جبیں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا اور اس کی انہیں بہت کمی بھی محسوس ہوئی۔ فریحہ نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے سب کچھ کروں گی۔ انہیں ایسی زندگی دوں گی جس سے محروم رہی۔ آج فریحہ جبیں کی بیٹی عمار خان نہ

صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ بہت باصلاحیت' مصنفہ اداکارہ اور روشن خیال لڑکی ہے۔ فریحہ نے اپنا کہا پورا کیا۔ میں ایسی تمام ماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آنے والی نسلوں کے لیے مثال ہیں۔" (عدنان! ہر ماں اپنی جگہ مثال ہے۔)

پذیرائی

نیلم منیر پاکستانی میڈیا سے ناراض ہیں حالانکہ یہ فنکار میڈیا کی بدولت گھر گھر پہنچتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ نیلم میڈیا کے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں "پاکستانی میڈیا' بھارتی فنکاروں پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ (اور آپ لوگ۔ جو بھارتی انڈسٹری کی طرف متوجہ رہتی ہیں؟) حالانکہ فلم انڈسٹری کو پروموٹ کرنے کے لیے ہمارے میڈیا کو اپنی فلموں اور فنکاروں کو زیادہ پبلسٹی دینی چاہیے (اوہ! نیلم آپ کی فلم آنے والی ہے ناں؟) نیلم نے مزید کہا کہ ہماری ڈراما انڈسٹری میں بھی بہت کام ہو رہا ہے (جی' جی ہمیں پتا ہے کہ آپ کے چار ڈرامے چل رہے ہیں) مگر ہمارے میڈیا کی طرف سے ڈراما انڈسٹری کو بھی پذیرائی نہیں دی جا رہی۔" (اب اور کتنی پذیرائی چاہیے نیلم کو.....؟)

فیصلہ

جویریہ عباسی کی بیٹی کو آپ آج کل ڈراما سیریل "گلہ" میں آپ دیکھ رہے ہوں گے جویریہ عباسی کہتی ہیں کہ "شوبز میں — ان کی خوب صورتی نہیں بلکہ ان کا فن ان کے کام آیا ہے۔ (جویریہ اب جب بیٹی بھی ہیروئن آنے لگی ہے تو آپ.....؟) میں ہمیشہ اسکرپٹ دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کرتی ہوں کہ اس ڈرامے میں کام کرنا ہے یا نہیں۔ (بہت اچھا کرتی ہیں جویریہ ورنہ.....؟) میں نے ایک فلم میں بھی کام کیا ہے جس کا نام "عین سے عورت" تھا۔ یہ فلم نئی دہلی کے فلم فیسٹیول میں بھی دکھائی گئی۔ اس میں 'میں نے بغیر میک اپ کے کام کیا تھا (آپ کی جلد اتنی اچھی ہے جویریہ! کہ واقعی آپ میک اپ کے بغیر بھی اچھی لگتی ہوں گی)۔

جیلسی

فنکار برادری میں اتنی جیلسی ہوتی ہے' یہ ہم نے پاک چین دوستی کے تناظر میں بننے والی فلم "چلے تھے ساتھ" کے حوالے سے ہونے والی ایک تقریب میں دیکھا۔ اس میں سائرہ شہروز' ژالے سرحدی' اور منشا پاشا جیسی اداکارائیں کام کر رہی ہیں۔ اس فلم کی میوزک لانچنگ کی تقریب کراچی میں ہوئی تو یہاں فلم کے شعبے سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو نہ پا کر ہم حیران ہی رہ گئے لیکن سائرہ شہروز کی حوصلہ افزائی کے لیے اداکار بہروز سبزواری' شہزور سبزواری' جاوید شیخ' شہزاد شیخ' مومل شیخ موجود تھے (یعنی سسرال)۔ سید نور بھی اس تقریب میں آئے تھے۔ یہ فلم بڑی اسٹار کاسٹ کی حامل نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک منفرد انداز کی ایسی فلم ہے جو یکسانیت کو توڑے گی۔ اور بولی ووڈ کے سحر کو توڑنے کے ساتھ ساتھ۔ ان فلموں کی طرح مایوس کن نہیں ہوگی جو نمائش کے لیے سینما پر لگتے ہی اتر بھی جاتی ہیں۔

ادھر ادھر سے

☆ میونخ کانفرنس سے قبل ایک رپورٹ جاری کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ عالمی منظر نامے سے امریکہ بتدریج غائب ہو رہا ہے اور اس کے نتیجے میں نیا ورلڈ آرڈر (عالمی نظام) آسکتا ہے۔

(روزنامہ امت)

☆ کیلی فورنیا میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق سست یا غیر فعال رہنے والی خواتین میں زیادہ تیزی سے بڑھاپا آنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لیے بڑھاپے میں بھی انسان کو فعال رہنا چاہیے اور دن میں 10 گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

(فرائی ڈے اسپیشل)

امۃ الصبور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام!

حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ افریقہ کے والی اور وہاں کے اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے۔ وہ بحر ظلمات (بحر اوقیانوس) کے ساحل پر تن تنہا کھڑے ہوئے اور نماز کی ادائیگی کے بعد کلمہ توحید کی سربلندی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی تلوار آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"خدا کی قسم! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس پانی کے پیچھے بھی کوئی خالی زمین ہے تو میں کلمۂ توحید کا جھنڈا اٹھائے ہوئے اپنے اس گھوڑے سے سمندر کو پار کر جاتا۔"

یہی وہ عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ ہیں، جن کو امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے زمام خلافت سنبھالنے کے بعد دس ہزار مجاہدین اسلام کی معیت میں افریقہ روانہ کیا، جس کو انہوں نے فتح کرلیا۔ پھر افریقہ کے ایک شہر قیروان کی آبادکاری کا نقشہ انہوں نے مرتب کیا، جہاں گھنے درختوں کی کثرت تھی اور وہاں پر درندوں، جنگلی حیوانات اور موذی جانوروں سے کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ چنانچہ وہاں کھڑے ہو کر حضرت عقبہ بن نافعؓ نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور بلند آواز سے گویا ہوئے۔

"ہم (مجاہدین اسلام) یہاں اترنے والے ہیں، اس لیے تم (جتنے بھی درندے یا موذی جانور ہو) سب کے سب یہاں سے نکل جاؤ۔"

راوی کا بیان ہے کہ "چنانچہ وہاں کوئی درندہ یا موذی جانور نہ بچا اور سب کے سب اپنے سوراخوں اور بلوں سے نکلنے لگے، یہاں تک کہ جن درندوں کے بچے چل نہیں سکتے تھے، وہ اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔"

(سنہرے حروف ص 255-256)

آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے آنے والی اشیاء

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر اترے تو ان کے ساتھ جنت کی ہوا تھی، اس ہوا کا تعلق جنت کے درختوں اور وادیوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا، وہاں کی خوشبو کو دنیا میں لائی تھی، پس یہ خوشبو جنت کی ہوا کی وجہ سے ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حجر اسود بھی نازل ہوا اور وہ اس وقت برف سے بھی زیادہ سفید تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جو کہ جنت کے درخت ریحان کا تھا، اس کی لمبائی دس زراع یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھی۔

اسی طرح درختوں سے نکلنے والا گوند۔ اس کے بعد لوہے کی سل، ہتھوڑا اور لوہے کا چمٹا نازل ہوا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام پہاڑ پر اترے تو لوہے کی ایک بڑی شاخ دیکھی، جو پہاڑ پر اگی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ "ہتھوڑا" اسی (کی جنس) سے ہے۔

پس وہ ہتھوڑے کے ساتھ اس کو توڑنا شروع ہوئے اور وہ شاخ پرانی اور کمزور ہو چکی تھی، پھر اس پر آگ روشن کی، یہاں تک کہ وہ پگھل گئی، اس کے بعد انہوں نے اس سے چھری بنائی، جو کہ بنائی جانے والی چیزوں میں سے پہلی چیز تھی، اس کے ساتھ وہ بہت سے کام کیا کرتے تھے، پھر ایک تنور بنایا، یہ وہی تنور ہے، جو حضرت نوح علیہ السلام کو وراثت میں پہنچا تھا اور ہند میں پانی کے عذاب کے وقت یہی تنور ابلا تھا اور......

اور حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر اترے تو اس وقت ان کا سر آسمان کو چھوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے سر کے اگلے حصے (پیشانی) کے بال گر گئے، پھر ان کی اولاد بھی ننگی پیشانی کے ساتھ پیدا ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام کے طویل قد کی وجہ سے جنگل کے جانور ان سے بدکتے تھے۔ پس وہ اسی وقت سے انسان سے وحشت کھاتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اس

پہاڑ پر کھڑے ہو کر ملائکہ کی آوازیں سنتے تھے' جنت کی ہوا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔
پھر ان کا قد چھوٹا کر دیا گیا' ان کی وفات تک پھر ان کا قد یہ ہی رہا۔
اور حضرت آدم علیہ السلام جیسا حسن ان کی اولاد میں سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے کسی کے اندر جمع نہیں ہوا۔
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین کی طرف اترے تو اس وقت حق تعالیٰ نے تیس قسم کے پھل انہیں توشہ کے طور پر دیے تھے۔ ان میں دس چھلکے والے اور دس گٹھلی والے اور دس ایسے ہیں کہ نہ جن کا چھلکا ہے نہ گٹھلی۔
دس چھلکے والے پھل:۔ 1۔ اخروٹ' 2۔ بادام' 3۔ پستہ' 4۔ بندق درخت کا پھل' 5۔ خشخاش' 6۔ درخت بلوط کا پھل' 7۔ شاہ بلوط کا پھل' 8۔ سیاہ چمک دار بغیر گٹھلی والی کھجور' 9۔ انار' 10۔ کیلا۔
دس گٹھلی والے پھل:۔
1۔ آڑو' 2۔ خوبانی' 3۔ آلو بخارا' 4۔ کھجور' 5۔ غبیرا' 6۔ بیر' 7۔ شفتالو' 8۔ عناب' 9۔ گولر' 10۔ درخت شاہ لوج کا پھل۔
بغیر چھلکے اور گٹھلی والے دس پھل 1۔ سیب' 2۔ پپیتا' 3۔ ناشپاتی' 4۔ انگور' 5۔ شہتوت' 6۔ انجیر' 7۔ لیموں' 8۔ درخت خرنوب کا پھل' 9۔ ککڑی' 10۔ خربوزہ۔
جنت کی گندم کا وزن:۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے جب آئے تو ان کے ساتھ گندم کی ایک تھیلی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تھیلی جبرئیل علیہ السلام لائے تھے۔
جب حضرت آدم علیہ السلام کو بھوک لگی اور انہوں نے اپنے رب سے کھانا مانگا تو جبرئیل علیہ السلام نے اس تھیلی سے سات دانے نکال کر حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھ پر رکھے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے کہا یہ وہی ہے' جو آپ کے جنت سے نکلنے کا سبب بنا اور ایک دانے کا وزن اس وقت ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم کے برابر تھا۔
ایک ہی ساعت میں کھیتی کا اگنا:۔ حضرت آدم علیہ السلام کہنے لگے کہ میں ان کا کیا کروں۔
جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔ "ان کو زمین میں پھیلا دو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا' پس رب تعالیٰ نے ایک گھڑی میں اس کو اگا دیا اور یہ طریقہ یعنی زمین میں بیج ڈالنے کا ان کی اولاد میں بھی جاری رہا۔
پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔ "فصل کاٹو۔"
انہوں نے اسے کاٹا۔
پھر کہا۔ "اس کو جمع کرو اور اپنے ہاتھ سے رگڑو۔"
انہوں نے ایسا بھی کیا۔
پھر کہا۔ "پھونک مار کر اس کے بھوسے کو اڑا دو۔"
حضرت آدم علیہ السلام نے پھونک مار کر اس کا بھوسا اڑا دیا اور صرف دانے باقی رہ گئے' پھر وہ دونوں دو پتھروں کے پاس آئے اور ایک کو دوسرے پر رکھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان دانوں کو پیسا۔ پھر حکم کے مطابق اس آٹے کو گوندھا' جبرئیل علیہ السلام ایک پتھر اور ایک لوہا (توا) لائے' آدم علیہ السلام نے ان کو رگڑا' ان سے آگ نکلی' پھر حکم کے مطابق آگ پر روٹی بنائی اور یہ سب پہلی روٹی تھی' جو آگ پر تیار ہوئی۔
اس کے برخلاف حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ جس درخت سے حضرت آدم اور حوا علیہم السلام کو منع کیا گیا تھا' وہ گندم کا درخت تھا' جب دونوں نے اسے کھایا اور انہیں بے لباس ہونے کا احساس ہوا تو وہ جلدی جلدی اپنے اوپر جنت کے درخت کے پتے ڈالنا شروع ہوئے اور وہ پتے انجیر کے درخت کے تھے' جو ایک دوسرے کے ساتھ چپک جاتے تھے' پس حضرت آدم علیہ السلام پشت کی طرف مڑ کر جنت میں بھاگنے لگے اور ایک درخت میں پناہ لی' رب تعالیٰ نے

ندا دی۔

"کیا تم مجھ سے بھاگتے ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "نہیں اے میرے رب' بلکہ میں آپ سے حیا کرتا ہوں۔"

"حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "کیا وہ چیزیں جو میں نے تم کو عطا کی تھیں اور تمہارے لیے مباح کی تھیں' وہ ان سے کشادہ اور زیادہ نہیں تھیں' جن سے میں نے منع کیا تھا۔"

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا۔ "کیوں نہیں' اے میرے رب' لیکن آپ کی عزت کی قسم' مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ کوئی آپ کا نام لے کر جھوٹ بولے گا۔" قرآن کریم میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

(ترجمہ: ابلیس نے ان دونوں کو قسم کھا کر یقین دلایا کہ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔) (سورۃ اعراف' آیت نمبر 12)

حق تعالیٰ نے فرمایا۔ میری عزت کی قسم' میں تمہیں ضرور بالضرور زمین کی طرف اتاروں گا اور تم نہیں پاؤ گے اپنی زندگی' مگر تلخ و مشقت' پھر انہیں زمین کی طرف اتار دیا گیا' پہلے وہ جنت میں خوب وسعت و فراخی کے ساتھ کھاتے تھے۔ اب انہیں ایسی جگہ کی طرف اتار دیا گیا' جہاں کھانے پینے میں فراخی نہیں تھی۔ پھر حق تعالیٰ نے انہیں لوہے کی صنعت سکھائی اور کھیتی کا حکم دیا۔ انہوں نے زمین کو تیار کیا' کھیت بویا' پھر اسے سیراب کیا' یہاں تک کہ اس کی فصل کٹنے کے وقت کو پہنچ گئی' پھر بالترتیب اسے گاہا' چھانا' پیسا' گوندھا' پھر روٹی بنائی اور کھائی اور یہ سب کچھ حق تعالیٰ کے سکھانے کی وجہ سے ہوا۔

حضرت سعید سے بھی مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ایک سرخ بیل اتارا گیا' وہ ان کے سامنے ظاہر ہوا' اس وقت اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے تھے' باری تعالیٰ کے قول "فلا یخرجنکما۔۔۔ الایۃ" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 117) میں اسی مشقت کی طرف اشارہ ہے' جو کہ آدم علیہ السلام دنیا میں اٹھاتے تھے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ و سعید کی مرویات سے ثابت شدہ یہ قول کہ جس میں مشقت کا ذکر ہے' یہ اقرب الی **الصحتہ** اور اشبہ بالقرآن ہے' اس لیے کہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو ان کے دشمن ابلیس کی اطاعت کرنے سے منع فرمایا کہ یہ تمہیں مشقت میں ڈال دے گا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ (ترجمہ) "اے آدم یہ تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے' پس کہیں یہ تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے کہ پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ گے۔ بلاشبہ تمہارے لیے (یہاں) یہ ہے کہ نہ تمہیں بھوک لگتی ہے اور نہ بے لباس ہو' نہ تمہیں پیاس لگتی ہے اور نہ تم دھوپ میں تپتے ہو۔" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 117 تا 199)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ابلیس کی اطاعت کی تو مشقت اٹھانی پڑے گی اور مشقت کا مطلب ان تکالیف کا پہنچنا ہے' جو بھوک و برہنہ پن کو زائل کرنے کے لیے انسان کو اٹھانا پڑتی ہیں' مثلاً' زمین میں ہل چلانا' بیج ڈالنا' پانی سے سیراب کرنا اور اس کی مسلسل نگرانی کرنا جیسا کہ اولاد آدم ان ہی اسباب شاقہ کو اختیار کرتی ہے۔

اگر جبرئیل علیہ السلام ایسا غلہ لائے ہوں کہ جس کو صرف بیج کے طور پر زمین میں ڈالا گیا ہو اور "آناً فاناً" کھیتی پک کر تیار ہو گئی ہو جیسا کہ گزشتہ روایات میں گزرا اور کچھ مشقت نہ اٹھائی گئی ہو تو حق تعالیٰ کا مشقت دینے والا وعدہ پورا نہ ہوتا' حالانکہ وہ ضرور پورا ہو گا' جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت سے ثابت ہے۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ چند چیزیں سندان' **مقیصہ**' چمٹا' ہتھوڑا' حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھیں اور آدم علیہ السلام کو اولاً ایک پہاڑی کی چوٹی پر اتارا گیا' اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے اس کے دامن کی طرف اتارا اور زمین کے اوپر موجود تمام مخلوق جنات' بہائم' جانور' درندے' پرندے وغیرہ کا مالک بنایا۔

(بہ شکریہ روزنامہ امت)

خالدہ جیلانی

مسالے دار بریانی

اجزا :

چاول	ایک کلو
گوشت	ایک کلو
دہی	ایک کپ
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
ہری مرچ	چھ عدد
پسا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
سرخ پسی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	دو چائے کے چمچے
کیوڑہ	دو کھانے کے چمچے
زرد رنگ	دو چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چاول کو تھوڑے سے ثابت گرم مسالے کے ساتھ ابال کر رکھ لیں۔ پیاز براؤن کر کے نکال لیں پھر اسی تیل میں باقی ثابت گرم مسالا، ہلدی، سرخ مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھون کر گوشت ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو براؤن پیاز چورا کر کے دہی میں پھینٹیں اور گوشت میں ملا کر پکائیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں۔ ٹماٹر نرم ہونے لگیں تو ہلکے ہاتھ سے بھون لیں۔ الگ دیگچی میں چاول اور گوشت کی تہہ لگائیں۔ درمیانی تہہ پر جائفل اور جاوتری پیس کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی ہری مرچ، ہرا دھنیا اور پودینہ بھی باریک کتر کر ڈال دیں۔ سب سے اوپر چاول کی تہہ لگا کر اس پر کیوڑے میں زرد رنگ گھول کر ڈال دیں اور بیس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزے دار مسالے والی بریانی تیار ہے۔

چکن جنجر ودھ ویجی ٹیبل

ضروری اجزا :

مرغی (بون لیس)	دو پیالی
تیل	ایک پیالی
لال مرچ پاؤڈر	کھانے کا آدھا چمچہ
کالی مرچ پاؤڈر	کھانے کا ایک چوتھائی چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گاجر	دو عدد
شملہ مرچیں	دو عدد
بند گوبھی	ایک پیالی
ٹماٹو کیچپ	آدھی پیالی
سویا سوس	کھانے کا ایک چمچہ
پیاز	دو عدد
ہری مرچیں	تین عدد
ادرک (لمبی کٹی ہوئی)	کھانے کے دو چمچے
ٹماٹر پیسٹ	چائے کا ڈیڑھ چمچہ
کلونجی	چائے کا ایک چوتھائی چمچہ
یخنی	ایک پیالی

ترکیب :

تیل گرم کر کے اس میں ادرک ڈال کر کڑکڑائیں۔ اس میں مرغی بھی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔ کلونجی اور نمک بھی ڈال دیں۔ مرغی کو پانچ منٹ کے لیے دم کریں۔ گاجر کو کیوبز کی شکل میں کاٹ لیں۔ سبزیاں بھی مرغی میں ڈال کر فرائی کر لیں۔ ہری مرچوں کے لمبائی میں دو حصے کر کے ڈال دیں۔ اس کے بعد اس میں سویا سوس، ٹماٹو کیچپ، ٹماٹر پیسٹ، یخنی کے ساتھ ملا کر ڈال دیں اوپر سے پہاڑی مرچیں، کالی مرچیں اور لال مرچیں بھی ڈال دیں اور پانچ منٹ کے لیے دم پر دے دیں۔ جب تیل

اوپر آجائے تو اتارلیں۔ مزیدار چکن جنجر ودھ ویجی ٹیبل تیار ہے۔ سادہ چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

فولڈنگ سینڈوچ

اجزا :

چکن بون لیس	ڈیڑھ پاؤ
دہی	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
مکھن	چار کھانے کے چمچے
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
کیچپ	ایک پیالی
سرخ و سیاہ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
بڑی ڈبل روٹی	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کے بہت زیادہ باریک ریشے کریں یا پیس لیں اور کیچپ اور مکھن کے علاوہ تمام اجزا اچھی طرح مکس کر کے ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر دو چمچے تیل میں اسے فرائی کرلیں۔ ڈبل روٹی کے کنارے کاٹ کر اس بیل کر قدرے چپٹا کرلیں۔ تھوڑا سا مکھن لگا کر اس پر چکن والا آمیزہ رکھ کر تھوڑا سا فولڈ کریں، پھر ایک چمچہ کیچپ ڈال کر پورا فولڈ کردیں۔ ہلکے ہاتھ سے دبائیں۔ اگر کھلنے لگے تو ٹوتھ پک سے بند کردیں۔ تمام سلائسز کے فولڈ سینڈوچ بنانے کے بعد پیش کرتے وقت اسے بیچ میں سے کاٹ دیں۔ چلی ساس کے ساتھ شام کی چائے پر پیش کریں۔

قیمہ اسپیگھٹی

ضروری اجزا :

قیمہ کے لیے

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	کھانے کے چار چمچے (چوپ کی ہوئی)
گاجر	کھانے کے چار چمچے (چوپ کی ہوئی)
ٹماٹر	کھانے کے چار چمچے (چوپ کیا ہوا)
شملہ مرچ	کھانے کے دو چمچے
ٹماٹو پیسٹ	کھانے کا ڈیڑھ چمچہ
ٹماٹو کیچپ	کھانے کا ڈیڑھ چمچہ
اوریگانو پاؤڈر	چٹکی برابر
تیزپات	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
زیتون کا تیل	ایک چوتھائی پیالی
لہسن	چائے کا آدھا چمچہ (چوپ کیا ہوا)

اسپیگھٹی کے لیے

اسپیگھٹی	100 گرام
پانی	ایک لیٹر
نمک	حسب ذائقہ
مکھن	کھانے کا ایک چمچہ
تیل	چائے کا ایک چمچہ

ترکیب :

سوس پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں چوپ کیا ہوا لہسن، پیاز، تیزپات ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد قیمہ ڈال کر تھوڑی دیر بھونیں حتیٰ کہ پانی خشک ہو جائے۔ گاجر اور شملہ مرچ ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں۔ ٹماٹو پیسٹ اور کیچپ شامل کر کے چند منٹوں تک فرائی کریں، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، اوریگانو پاؤڈر ڈال کر درمیانی آنچ پہ پانچ سے چھ منٹ پکائیں چوپ کیے ہوئے ٹماٹر ڈالیں ایک دو منٹ پکا کر سوس پین چولہے سے اتارلیں۔

ایک پتیلی میں ابلتے ہوئے پانی میں نمک اور ایک چمچہ تیل ڈال کر اسپیگھٹی ابال لیں۔ اس دوران چمچہ چلاتی رہیں تاکہ اسپیگھٹی پیندے میں چپک نہ جائیں۔ جب اسپیگھٹی گل جائے تو گرم پانی نتھار کر ٹھنڈا پانی گزار لیں اور پھر مکھن ملا دیں۔ تیار قیمہ اسپیگھٹی کے اوپر ڈالیں اور گرم گرم سرو کریں۔

✡

پلاسٹک سرجری کے ذریعے خوب صورتی کا حصول

کاسمیٹک سرجری پلاسٹک سرجری کی وہ قسم ہے جس کے ذریعے کسی انسان کی شکل وصورت کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ عمر رسیدگی کے قدرتی عمل کے دوران جلد اپنی لچک سے محروم ہوجاتی ہے۔ عورتوں میں بچے کی پیدائش کے بعد جسم اور پیٹ کے عضلات ڈھیلے پڑجاتے ہیں۔ دھوپ میں زیادہ دیر رہنے سے بھی جلد پر پانی کی کمی کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ خواتین عام طور پر فیس لفٹ۔ پیٹ کو گھٹانے اور اسے سخت بنانے کے لیے پلاسٹک سرجن سے رجوع کرتی ہیں۔ سرجن' فیس لفٹ کے ذریعے چہرے پہ نمودار ہونے والی لکیروں اور جبڑوں کے گرد جھریوں کو ختم کردیتے ہیں۔ فیس لفٹ کا آپریشن کرانے والا شخص دو سے چار ہفتوں میں صحت یاب ہوجاتا ہے۔

پلاسٹک سرجری بہت زیادہ مہنگی نہیں ہے۔ متوسط طبقے کے افراد بھی اس کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ جھریوں کا سبب محض عمر رسیدگی ہی نہیں اس کی دیگر وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔ اس کی وجہ جلدی بیماری یا تھائی رائڈ کا مسئلہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس کے علاج کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔

بڑھتی عمر کے اثرات زیادہ تر گردن کی جلد اور چہرے کے نیچے کی جلد پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اکثر وزن کے کم ہوجانے سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ عموماً "ڈائٹنگ" کی وجہ سے بھی جلد لٹکنے لگتی ہے۔ اگر کوئی پلاسٹک سرجری کرانا چاہتا ہے تو پہلے اسے اپنا وزن کم کرلینا چاہیے۔

اگر آپ کو تیوری چڑھائے رکھنے کی عادت ہے تو آپ کی پیشانی پر جھریاں ضرور ہوں گی۔ پیشانی سے جھریوں کو دور کرنا خاصا مشکل ہے۔ اس لیے پیشانی پر بل ڈالنے کی عادت ترک کردیں۔ اسی طرح آنکھیں بڑھتی عمر کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہیں۔ آنکھوں کے گرد جھریاں اور لٹکتی ہوئی کھال کی وجہ رات دیر تک جاگنا اور روزانہ آٹھ گھنٹے سے کم نیند لینا ہوسکتی ہے۔ آنکھوں کے گرد کی سرجری بھی خاصا نازک کام ہے۔ آپ سرجری کے ذریعے پہلے چہرے کی جھریاں دور کرائیں پھر آنکھوں کے گرد سرجری کرائیں۔

ناک موٹی یا بھدی ہو تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے اسے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اس سرجری میں ناک کی نوک کو توڑ کر نئے سرے سے بنایا جاتا ہے' ناک پر تقریباً" دس' بارہ دن تک پلاسٹر چڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

گردن موٹی ہو تو سرجری کے ذریعے یہ کام ہوسکتا ہے کہ موٹی گردن سے چربی نکالی جاسکتی ہے۔

پیٹ پر جو جھریاں پڑجاتی ہیں' وہ بھی دور ہوسکتی ہیں۔ چہرے پر داغ دھبے اور مختلف نشان پڑجاتے ہیں۔ پلاسٹک سرجری سے ان کا علاج بھی ممکن ہے۔

تاہم صرف خوب صورتی کے حصول کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا ایک سطحی عمل ہے۔ ایک اچھی اور کامیاب زندگی کے لیے خوب صورتی سے زیادہ اہم ایک اچھی شخصیت ہے۔ صرف اچھی شکل کامیابی کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔